اُردو سفرنامے میں
جنس نگاری کا رجحان
(۱۹۴۷ء کے بعد)
سلگتے ساحل
پیرس 205 کلو میٹر
دجلہ
گوروں کے دیس میں
ذوالفقار علی احسن

اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان
(۱۹۴۷ء کے بعد)

اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان

(۱۹۴۷ء کے بعد)

ذوالفقار علی احسن

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۸۶

اکتوبر ۲۰۰۸

نام کتاب:	اردو سفرنامے میں جنس نگاری
مصنف:	ذوالفقار علی احسن
ناشر:	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور
طابع:	طیب اقبال پرنٹرز ۱۷-بی رائل پارک لاہور
طبع:	اول
تعداد اشاعت:	۳۰۰
صفحات:	۳۱۱
قیمت:	۲۵۰ روپے

یہ کتاب حکومت پنجاب کے محکمہ ثقافت و اطلاعات و امور نوجواناں کی مالی اعانت سے شائع ہوئی

خریداری کے لیے:

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

۲۵-سی لوئر مال لاہور

فون: ۷۵۱۲۷۴۴

اُستادِ محترم

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

کے

نام

فہرست

ابتدائیہ

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے اُردو کے دوران میں مجھے جو مقالہ قلمبند کیا گیا اس کا عنوان تھا ''اُردو سفرنامے میں طنز و مزاح کے عناصر ـــــ قیامِ پاکستان کے بعد'' مذکورہ مقالہ مجھے جس شخصیت کی راہنمائی میں لکھنے کا موقع ملا اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ میری مراد پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب جتنے اچھے اُستاد ہیں، اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں اور بیک وقت ان دونوں خاصیتوں کا اجتماع خال خال نظر آتا ہے۔ اُستادِ مکرم جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے ہر مشکل مرحلے میں میری راہنمائی فرمائی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے ادب کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کے آداب بھی انھی سے سیکھے ہیں۔ ایم۔اے اُردو کے دوران میں مقالہ لکھتے وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ اُردو سفرناموں میں مزاح کے عناصر کے ساتھ ساتھ جنس کا رجحان بھی بڑا نمایاں ہے اور اس پر الگ سے کام کرنے کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ میں نے اس کا تذکرہ اُستادِ محترم سے کیا تو انہوں نے میری اس سوچ کی تائید کی۔ لہٰذا ایم۔فل اُردو کا مقالہ قلمبند کرنے کے لیے اُستادِ محترم کے دلائل اور کوششوں سے ''اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان ـــــ ۱۹۴۷ء کے بعد'' کا عنوان اُردو بورڈ آف اسٹڈیز میں منظور کر لیا گیا۔

جنس زندگی کا اہم حصہ ہونے کی حیثیت سے ادب کا ناگزیر موضوع ہے۔ چنانچہ اس مقالے میں ادب اور جنس کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُردو سفرناموں میں جنس کے حوالے

سے آٹے میں نمک کے برابر تنقیدی کام ملتا ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی طرف سے اس موضوع پر مربوط کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً اس میں کوتاہیاں بھی ہوں گی تاہم اس مقالے میں پہلی بار اُردو سفر ناموں میں موجود جنسی رجحانات اور روّیوں کو موضوع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جنس اور جنس نگاری کے حوالے سے بعض بنیادی مباحث پر قلم اٹھانے کی سعی بھی کی گئی ہے۔

ہر معاشرے کے کلچر اور تہذیب کے کچھ بنیادی اوصاف ہوتے ہیں اور یہ اوصاف وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انھی پہلوؤں میں سے ایک پہلو جنس کا بھی ہے۔ جب کسی معاشرے کے بنیادی اوصاف جنسی روّیوں، رجحانات اور جنسی تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں تو جنسی کلچر کی ایک خاص شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔

جنس اُردو سفرنامے کا بڑا اہم موضوع ہے۔ متعدد لوگ اسے محض فحاشی ہی خیال کرتے ہیں۔ اس مقالے میں فحاشی اور عریانی کے مسئلہ کو سمجھنے اور جنس نگاری کے حوالے سے پہلے فحاشی، عریانی اور جنس نگاری کی معنوی حیثیت اور اس کے دائرہ کار کا تعین کیا گیا ہے۔ فحش نگاری کی مزید وضاحت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے بیان کیا گیا ہے یعنی اول: ایروٹیکا (شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے) عورت (بیوی کے سوا) مرد کے جنسی تعلقات، جن میں تمام تر جزئیات کو بروئے کار لاتے ہوئے جنسی عمل کو جسمانی وضاحتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ دوم: ایگزاٹیکا جو جنسی انحرافات پر مشتمل ہے، یہ ان چیزوں سے بحث کرتا ہے جو جنس کے عمومی معیارات سے ہٹ کر ہوں۔ اس کے علاوہ جنس نگاری کے حوالے سے فحاشی سے متعلق معاشرے کے دو بڑے گروہوں کے خیالات و نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک گروہ اخلاق پسندوں کا اور دوسرا آزاد خیال لوگوں کا ہے۔ اس مقالے میں جنس نگاری کی مختلف سطحوں کے حوالے سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مثلاً جنس نگاری کی عمومی سطح۔ جنس نگاری تلذذ کے لیے۔ جنس نگاری کی اعلیٰ علمی و ادبی سطحیں، جنس اعلیٰ حقائق کی تمثیل وغیرہ۔

ہمارے اکثر سفرناموں میں جنسی موضوعات محض جنس کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے معاشروں کی اصل تصویریں دکھانے کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ اکثر سفرنامہ نگاروں نے جنس کے عنصر کو سماج کے معروضی حقائق بیان کرنے کے لیے استعمال کیا ہے اور وہ اس کے ذریعے ان معاشروں کی کریہہ صورت پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا مقصد تلذذ، عریانی، اور جنسیت کی طرف رغبت پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ اُردو سفرنامے کے حوالے سے ایک بات یہ بھی

اہم ہے کہ ہمارے سفرنامہ نگاروں نے مخصوص سماجی و ثقافتی حدود میں رہتے ہوئے ہی جنس نگاری کی گنجائش نکالی ہے۔ انہوں نے خصوصاً مغربی معاشروں کی مادر پدر آزادی اور عریانی و فحاشی کو لطیف اشاروں اور کنایوں میں پیش کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ پست ذہنیت کا قاری انہیں محض جنسی اشتعال ہی تصور کرے گا لیکن در حقیقت سفرنامہ نگار اپنی تحریروں میں جنس اور جنسی مسائل کو سماجی اور ثقافتی حوالوں سے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اُردو سفرنامے میں جنس کو بطور موضوع پیش کیا گیا ہے۔ جو اپنے اندر گہری معنویت اور مقصدیت کو سموئے ہوئے ہے۔ اس طرح یہ ہمیں نہ صرف جنس کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد فراہم کرتا ہے بلکہ مختلف معاشروں کی تہذیب و ثقافت سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

اس مقالے کا احاطہ چار ابواب کرتے ہیں۔

باب اوّل میں ادب اور جنس کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم میں مقالے کے موضوع کے پس منظر سے بحث کی گئی ہے۔ باب سوم میں مقالے کے اصل موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے جبکہ آخری باب میں چند منتخب سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں کا تجزیہ کر کے ان میں جنس نگاری کے رجحان کو دریافت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

آخر میں مَیں اپنے مقالے کے نگران پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کا نہایت تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے نہ صرف میری راہنمائی فرمائی بلکہ موضوع سے متعلق بیش بہا کتب بھی عنایت فرمائیں۔ وہ مجھے جلد سے جلد مقالہ مکمل کرنے پر آمادہ کرتے رہے۔ یہ مقالہ ان کے علمی و تحقیقی مشوروں کا مرہونِ منت ہے۔ مجھے ہر ہر گام پر اُن کی راہنمائی اور شفقت میسر رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ میرے افعال کے ساتھ ساتھ جملوں کے افعال بھی ٹھیک کرتے رہے یقیناً یہ مقالہ ان کی بے لوث محبت، شفقت، خلوص اور راہنمائی کے باعث اپنی تکمیل کو پہنچا۔

میں اپنے اُستادِ محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مجھے مقالے سے متعلق نہایت اہم معلومات عنایت فرمائیں۔ ایم فل کے دوران میں مجھے ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، ڈاکٹر اورنگزیب عالمگیر، ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور ڈاکٹر محمد کامران جیسے اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ مجھ پر جناب پروفیسر ڈاکٹر ریاض قدیر کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے کہ انہوں نے بھی مجھے موضوع سے متعلق مواد فراہم کیا۔ ان کے علاوہ کتب کی فراہمی کے سلسلے میں مَیں اپنے دوستوں سعید احمد، افضل حمید،

شبیر احمد، ایوب للہ اور عبدالکریم قاسم کا ممنونِ احسان ہوں۔

مجھے اپنے والدِ گرامی پروفیسر محمد اسلم کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے میری پرورش و پرداخت کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور توجہ دی اور مجھ میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے اپنی تمام کاوشیں نامحسوس طریقے سے صرف کر دیں۔ میری دُعا ہے کہ ان کا اور میری والدہ محترمہ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رہے اور جس طرح ان کی دُعائیں مجھے زندگی کے ہر میدان میں سرخرو کرتی رہی ہیں، اسی طرح ایم فل کے تمام مرحلوں میں بھی آسانیاں پیدا کرنے کا باعث بنیں۔

اس مقالے کو کتابی صورت میں شائع کروانے کے لیے میرے دوست جناب محمد ہارون عثمانی نے خصوصی دلچسپی لی میں اُن کا بھی شکرگزار ہوں اور خاص طور پر اپنے اُستادِ مکرم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف اس مقالے کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ اپنے مفید مشوروں سے اسے مزید بہتر بھی بنایا۔

ذوالفقار علی احسن

بابِ اوّل

ادب اور جنس

بنیادی مباحث

ادب اور جنس

اُردو زبان میں روایتی طور پر ''جنس'' کا لفظ انگریزی لفظ "Sex" کے مترادف ومتبادل کی حیثیت سے مستعمل نہیں رہا۔ اس کے لغوی مفہوم میں تنوع تو نظر آتا ہے مگر وسعت اور گہرائی نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر فرہنگ آصفیہ میں لفظ جنس سے مراد ''ذات قماش، نوع اور صنف ہے۔''[1] اسی طرح ''نسیم اللغات'' اور ''فیروز اللغات'' وغیرہ میں بھی کم وبیش یہی معنی دیے گئے ہیں اور اس لفظ کے وسیع تر استعمال کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا جب کہ انگریزی کی تمام اہم ڈکشنریوں میں لفظ "Sex" وسیع تر مفہوم میں لیا گیا ہے مثلاً "Webester's Dictionary" میں لفظ "Sex" سے مراد ہے:

"The Character of being male or female all the attributes by which males and females are distinguished any thing connected with sexual gratification or preduction or the urge for these esp, the attraction of those of one sex for those of other"[2]

یعنی مذکر اور مونث ہونے یا اس کے باعث دونوں میں پائی جانے والی کرداری خصوصیات اور ان تمام اوصاف کی بنا پر جن کا تعلق جنسی آسودگی یا تولید سے ہے، دونوں میں تمیز کی جاتی ہے یا دونوں میں موجود جنسی کشش جو انہیں ایک دوسرے کی طرف راغب کرتی ہے۔

"Oxford Dictionary" میں لفظ "Sex" کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

"The distinction between male and female in general in recent use. The sum of those differences in the structure and function of the reproductive organs of the ground of which being are distinguished as male and female."(3)

عام طور پر جنس سے مراد مذکر اور مونث میں تمیز کرتا ہے لیکن جنس کے جدید استعمال کے مطابق اعضائے تولید میں ان کی ساخت اور عمل میں پائے جانے والے فرق کے حوالے سے مذکر اور مونث میں تمیز کرتا ہے۔ علمِ سماجیات کی رو سے "Sex" کو الگ معنویت دی جاتی ہے۔

"From the sociological point of view, the elaboration of the biological division of function between male and female into two major statuses upon which behaviour is differentiated in all socities. The sexual relation ship is a social relation ship and is organized only partially around biological sexual needs."(4)

یعنی سماجی نقطہ نظر سے، مرد اور عورت کے مابین پائی جانے والی وظیفہ وعمل کی حیاتیاتی تفریق جو انہیں دو بنیادی صنفوں میں بانٹتی ہے اور جس کی بنیاد پر تمام معاشروں میں ان کے رویوں کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جاتا ہے جنسی تعلق دراصل ایک سماجی تعلق ہے اور صرف جزوی طور پر حیاتیاتی جنسی ضرورتوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قدرت نے مذکر اور مونث کے اندر ایک کشش رکھی ہے جس کی بناء پر وہ ایک دوسرے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مذکر اور مونث میں پائی جانے والی اس کشش کو جبلت قرار دیا جاتا ہے۔ جبلت ہمیشہ بے اختیار ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے نیند آ جائے تو انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بھوک بھی ایک جبلت ہے۔ بالکل ایسے ہی جنس بھی ایک جبلت ہے۔ گویا ہم مذکر اور مونث کرداروں میں پائے جانے والے مخصوص حیاتیاتی تعلق کو جبلت کہہ سکتے ہیں جبلت کیا ہے؟ ڈاکٹر نعیم احمد نے جبلت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''یہ پیدائشی خلقی رجحان ہے جو نفسیاتی اعمال کی رہنمائی کرتا ہے جنس کی جبلت، ادراک، حافظہ تفکر وغیرہ۔ جیسے نفسی اعمال کی ہدایت اور رہنمائی کرتے ہوئے عضویہ کو ایک مخصوص ہدف کی طرف لے جاتی ہے۔ جبلت کو ایسے دریا سے تشبیہ دی جاتی

ہے جو ہمیشہ اپنے معینہ راستے پر بہتا ہے۔''(۵)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہر جبلت بے اختیار ہوتی ہے اور ہم سے اس ضمن میں جو بھی عمل سرزد ہوتا ہے وہ جبلت کے تحت ہوتا ہے لیکن اس عمل کا بالواسطہ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جیسے جنسی جبلت کا تعلق نسل انسانی کو برقرار رکھنے سے ہو سکتا ہے۔ جبلت کے اس عمل کا تعلق معاشرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ جبلت اگرچہ جانوروں میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کا تعلق سماجی عمل کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ وہ جبلت برائے جبلت ہوتی ہے۔

انسانوں میں جنسی جبلت مخصوص رجحانات کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ ان مخصوص رجحانات کے باعث سماجی رشتوں کے حوالے سے یہ جنسی جبلت مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بطور بیٹے اور بیٹی کے، ماں اور باپ کے، شوہر اور بیوی کے دادا اور دادی کے، عاشق اور محبوبہ کے۔

جنسیات (تاریخی پس منظر)

اگر ہم جنسیات کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی انسانی معاشرے میں مادرسری نظام رائج رہا اور عورت کا کردار سماجی اور جنسی حوالوں سے بہت مضبوط رہا۔ اس نظام کا تعلق بچے پیدا کرنے کی صلاحیت، انہیں پالنے اور کھیتی باڑی کرنے سے تھا۔ بچوں کو پالنے اور کھیتی باڑی کرنے کی ذمہ داری عورت ہی کے پاس تھی۔ اسی وجہ سے اس معاشرے میں مرد کی حیثیت بہت کم تھی۔ غذا اکٹھی کرنا اور اُسے تقسیم کرنا بھی عورت ہی کا کام تھا۔ اس کے علاوہ اجتماعی فیصلوں میں بھی عورت ہی کا حکم چلتا تھا۔ زراعتی آبادیوں میں عورت کو عموماً ایک غیر معمولی تعظیم دی جاتی تھی۔

اس حوالے سے سمون دی بووا لکھتی ہیں:

''لیکن ماں بدیہی طور پر بچے کی پیدائش کے لیے لازمی تھی۔ ماں ہی جرثومے کو اپنے جسم کے اندر محفوظ رکھتی اور پالتی تھی۔ چنانچہ ماں کے ذریعہ ہی قبیلے کی زندگی نظر آنے والی دنیا میں وسعت اختیار کرتی تھی۔ لہٰذا اس کا کردار اولین اہمیت اختیار کر گیا۔ اکثر وبیشتر بچوں کا تعلق اپنی ماں کی گوت سے ہوتا تھا اور وہ اس کے حقوق اور مراعات میں حصہ دار اور نام کے حامل ہوتے۔ بالخصوص گوت کی ملکیتی زمین کو زیرِ استعمال لانے کے معاملے میں مشترکہ جائیداد عورت کی طرف سے اگلی نسل کو منتقل ہوتی تھی۔ عورتوں کے ذریعہ ہی گوت کے ارکان کو کھیتوں اور فصلوں کی ملکیت یقینی بنائی جاتی اور بالعکس طور پر ان ارکان کو اپنی ماؤں کی طرف سے ہی اراضی ملتی۔''(۶)

اس دور میں زمین کی زرخیزی کو عورت کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے زرعی مزدوری عورتوں کو تفویض کی گئی تھی۔ اس معاشرے میں جادو منتر پر بھی زیادہ یقین تھا۔ لوگوں میں عجیب وغریب قسم کے توہمات موجود تھے۔ اگرچہ اب بھی مختلف قبیلوں اور خصوصاً دیہی علاقوں میں کچھ اس قسم کے توہمات موجود ہیں۔ اس حوالے سے سمون دی بووا لکھتی ہیں:

"اس قسم کے اعتقادات بہت گہری جڑیں رکھتے ہیں اور متعدد ہندوستانی آسٹریلیائی اور پولی نیشیائی قبائل میں آج بھی زندہ ہیں۔ کچھ ایک میں بانجھ عورت کو باغ کے لیے خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔ کچھ دیگر میں یہ خیال رائج ہے کہ اگر حاملہ عورت فصل اکٹھی کرے تو پیداوار کی مقدار بہت زیادہ ہو جائے گی۔ ہندوستان میں پہلے برہنہ عورتیں رات کے وقت کھیت میں ہل چلاتی تھیں۔"(۷)

پھر جیسے جیسے ملکیتی اور پیداواری عناصر پر مردوں کا کنٹرول بڑھتا گیا ویسے ویسے مادرانہ نظامِ زندگی کا بھی خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ قدیم وقتوں میں مادری نسب کو پدری نسب کے ساتھ تبدیل کر دینے والے نظریاتی انقلاب سے زیادہ اہم انقلاب کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد ماں کی حیثیت کمتر ہو کر صرف ایک دایا اور خادمہ جیسی رہ گئی۔ پھر حاکمیت اور حقوق باپ کے ہاتھ میں آ گئے جسے پھر اس نے اپنی اولادوں میں منتقل کیا۔ تولید کے عمل میں مرد کا لازمی کردار تسلیم کیا گیا جبکہ اس سے پہلے متعدد لوگ بچوں کی پیدائش میں باپ کے کردار اور عمل سے لاعلم تھے خصوصاً خانہ بدوشوں کی نظر میں تو بچے کی پیدائش ایک طرح سے حادثاتی عمل تھا۔ چونکہ ان میں شعور کی کمی تھی۔ لیکن بعد میں یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ مرد جرثومے کو پیدا کرتا ہے اور پھر عورت اسے اپنے جسم میں وصول کر کے پالتی ہے پھر اولاد کو مکمل طور پر اپنا بنا کر مرد نے دنیا پر غلبہ حاصل کیا اور اس نظام کو یکسر بدل کر رکھ دیا جبکہ اس سے پہلے اجتماعی فیصلوں میں بھی عورت کی رائے غالب ہوتی تھی۔ پھر جیسے جیسے ملکیتی اور پیداواری عناصر یعنی زمین اور مویشی وغیرہ پر مردوں کا کنٹرول بڑھتا چلا گیا اس کے ساتھ ہی مادرانہ نظام زندگی کا بھی خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ اس طرح عورت مرد کی محکوم بن کر رہ گئی۔ پھر مرد نے گھر کے اندر بھی باگ ڈور سنبھال لی اور عورت کو محض بچے پیدا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھ لیا گیا۔ پھر عورت پر یہ پابندی بھی لگا دی گئی کہ شادی کے بعد عورت اپنے شوہر کے گھر ہی رہے گی گویا پھر عورت کو چار دیواری میں بند کر دیا گیا۔

مادری حق کے خاتمے کے ساتھ ہی عورت کی عالمگیر تاریخی شکست نے جو نتائج مرتب کیے اور مردانہ تہذیب وثقافت کے عروج نے جو اثرات عورت کے سماجی اور جنسی کردار پر ڈالے وہ بہت دیرپا ثابت ہوئے اور عورت آج بھی اس پر سراپا احتجاج ہے۔ اور مردوں سے آزادی کی خواہاں ہے۔

جنس اور نفسیات

جنس اور نفسیات کی بحث کا آغاز سب سے پہلے فرائڈ نے کیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق شیر خوار بچے میں بھی جنسی خواہش موجود ہوتی ہے۔ اس کے ہونٹوں میں کھانے کی جبلت اور جنسی حظ جمع ہو جاتے ہیں۔ گویا فرائڈ کے خیال میں بچے کی جنسی زندگی کا آغاز پیدائش کے وقت ہو جاتا ہے۔ ماں کا بچے کو دودھ پلانا جنسی فعل ہے۔ بچے کو دودھ پلانے کے ساتھ ساتھ اس کو نہلانے یا پھر اس کو چومنے چاٹنے کا عمل بھی جنسی ہی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرائڈ نے ہر عمل کو جنسی نقطہ نظر سے دیکھا اور اس کا تجزیہ کیا۔ اگرچہ بعد میں اس کی شدید مخالفت بھی ہوئی۔ گویا اس نے بچے کے ہر عمل کو جنسی عمل قرار دیا اور اس کی مختلف حرکات کو جنس کے آئینے میں دیکھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اس درجہ پست ہو سکتا ہے۔ فرائڈ نے بچے کے ہر عمل کو جنسی حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انسان اپنی محرمات کو جنسی نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا۔ حرام جانور کا گوشت نہیں کھاتا حتیٰ کہ حلال جانور کا گوشت اگر حرام جانور کے گوشت سے چھو بھی جائے تو نہیں کھاتا حالانکہ گوشت تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں شاید کوئی فرق نہ ہو لیکن پھر انسان ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے پیچھے انسان کی صدیوں کی تربیت ہے جو اسے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اس طرح فرائیڈ پر بہت سے لوگوں نے تنقید بھی کی ہے۔ اس حوالے سے شہزاد احمد لکھتے ہیں:

"جہاں تک فرائیڈ کے نظریہ جنس کا تعلق ہے، اس پر بے شمار تنقید کی گئی ہے۔ کچھ تنقید تو بے حد روایتی ہے اور تعصبات سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی بنیاد یہ بات ہے کہ کیا انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اس قدر پستی کا شکار ہو سکتا ہے کہ اس کے زیادہ تر عوامل محض جنس کی بنیاد پر سمجھے جا سکتے ہوں، انیسویں صدی نے جنس کے بارے میں جس رویے کو رواج دیا تھا، اس میں تو میز کی ٹانگیں ڈھانپنا بھی شامل تھا، مگر جدید دور میں تو عورتوں نے منی سکرٹ شروع کر لی ہے، اس لیے بہت سی تنقید تو محض اس بنیاد پر ہی رہ جاتی ہے کہ یہ ایسے رویے کا اظہار ہے جو قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔"(۸)

فرائیڈ نے جنس کے دائرہ کار کو بہت وسعت دے دی۔ خصوصاً اس نے بچوں کے اور بہت سے اعمال کو بھی جنس کے ساتھ منسلک کر دیا مثال کے طور پر بچوں کا چیزوں کو کاٹنا، چیزوں کا منہ میں ڈالنا، بھوانا، کپڑے کی چیزوں اور کھلونوں کو چیر پھاڑ دینا، چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا، اپنے اور دوسروں کے بدن کو شوق سے دیکھنا۔ چنانچہ اس طرح کے بہت سے اعمال فرائیڈ کے نزدیک حیاتی فطرت اور

قدرتی لذت ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرائیڈ ایک اعلیٰ سطح پر رفاقت اور دوستی کے احساس کو بھی بچے کی اپنی آیا سے محبت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ آرٹ اور موسیقی سے لگاؤ بھی فرائیڈ کے نزدیک جنسی تحریک سے متعلق ہے۔ ان سب اعمال کو وہ جنس ہی کی کارفرمائی خیال کرتا ہے۔

انیسویں صدی کی ناآسودہ جنسی فضا میں ایسی گفتگو کرنا بہت جرأت کا کام تھا۔ فرائیڈ دراصل مستقل مزاج، دلیر اور روشن خیال انسان تھا۔ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے کی سوچ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک معالج کے روپ میں گزاری اور اس کے اندر معاشرے کی منافقتوں کے سلسلے میں جو آگ بھڑک رہی تھی اس نے کبھی اسے سرد نہ ہونے دیا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ بلوغت کے آغاز میں فرد کی زندگی میں کون سی نفسیاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جو لڑکے اور لڑکیاں بلوغت کے حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں، سخت فکر مند ہو جاتے ہیں کہ شاید ہمیں کوئی مرض لگ گیا ہے۔ کم و بیش تمام مہذب دنیا میں بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے لڑکے لڑکیوں کی جسمانی تبدیلیوں کے حوالے سے انھیں ضروری معلومات فراہم کرنے سے اجتناب برتا گیا ہے۔

عمر کا یہ دور بہت نازک ہوتا ہے۔ فرد کے اندر نفسیاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ اپنی شخصیت کو ہر طرح سے پرکھتا ہے۔ اسے اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ وہی احساس دوسروں کو بھی دلانا چاہتا ہے۔ اگرچہ اس کے سارے خیالات رومانوی فضا میں ہی پنپتے ہیں اور وہ اپنے گرد رومانوی خیالات کا ہالا بنا لیتا ہے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عمر کے اس دور میں نوخیز اپنی شکل و صورت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی سے زیادہ سہیلیوں کو دیکھ کر رشک اور حسد کی آگ میں جلتی ہیں ان کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کی جلد از جلد شادی ہو جائے تاکہ وہ خود مختار ہو جائیں اور انھیں والدین کی روک ٹوک سے آزادی مل جائے اس عمر میں انھیں خود مختاری حاصل کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔

اگر ہم وحشی قبائل کی تاریخ کا جائزہ لیں تو وہ آغاز تاریخ سے بلوغت کی باقاعدہ رسوم ادا کرتے رہے ہیں۔ افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے وحشی قبائل میں یہ رسومات اب بھی باقی ہیں۔ وہ انھیں صحت مند جنسی زندگی کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں۔ ان رسوم کی ادائیگی کے بعد لڑکے اور لڑکی کو بالغ مرد اور عورت تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ پھر انھیں قبیلے کی ذمہ داریاں بھی سونپ دی جاتی ہیں۔

مشرقی معاشرے میں بلوغت سے متعلق معلومات فراہم کرنا تو دور کی بات، اس کا ذکر کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اب میڈیا کے ذریعے لوگوں میں کچھ شعور پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح لڑکے اور لڑکیاں ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں اور انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس

حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''لڑکیوں کو عموماً جنس سے وابستہ جسمانی تغیرات اور نفسانی کیفیات کے بارے میں باضابطہ قسم کی معلومات نہیں پہنچائی جاتیں۔ اس لیے اکثر لڑکیاں ان سے ہراساں، پریشان اور متوحش رہتی ہیں۔ عام مشاہدے کی بنا پر وہ یہ تو سمجھتی ہیں کہ وہ جوان ہو رہی ہیں لیکن جسمانی تبدیلیوں کے بارے میں ان کی ناقص معلومات کا محض چند سنی سنائی باتوں پر انحصار ہوتا ہے۔''(۹)

یہ وجہ ہے کہ اس عمر کے لڑکے لڑکیاں شدید ذہنی دباؤ اور بعض صورتوں میں احساس گناہ کا شکار رہتے ہیں۔ یہ سب بلوغت سے متعلق بڑی عمر کے لوگوں کا ان کو آگاہ نہ کرنے کی پالیسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح بعض لڑکیاں اور لڑکے بلوغت کے ابتدائی دور میں شرمیلے ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کی ایک معقول شخصیت اور کردار بھی ہوتا ہے لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے پاس ان کے اظہار کا کوئی مؤثر ذریعہ نہیں ہے جو کسی دوسرے فرد میں دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ اس طرح ایسی لڑکیاں لڑکے شرمیلے اور تنہائی پسند ہو جاتے ہیں خاص طور پر اس طرح کے مسائل مشرقی معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا بھر کی تہذیبوں میں صرف مرد اور عورت کے تعلق کو مسلمہ قدر کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہم جنسیت اس سے انحراف کی بڑی شکل ہے۔ جس میں ایک مرد کے اپنے ہم جنس مرد سے اور ایک عورت کے اپنی ہم جنس عورت کے ساتھ جنسی تعلقات ہوتے ہیں۔

ہم جنسی کو نفسیاتی عارضہ بھی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تسکین حاصل کرنے کا ایک غیر فطری طریقہ یا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس حوالے سے ویدرانا لکھتے ہیں:

> ''ہم جنس پرستوں کی محبت کا بنیادی محرک کتھارسس یا جنسی تشنج سے خلاصی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ کچھ تخلیق کرنا ان کا مقصد نہیں ہوتا۔''(۱۰)

اگر ہم جنسیت کا کھوج لگایا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ عمل قدیم ترین اقوام میں بھی پایا جاتا تھا۔ البتہ اس کے آغاز کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال زیادہ تر مؤرخین کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا قدیم مصر سے ہوئی۔ اس زمانے میں امرد پرستی کا عام رواج تھا۔ قدیم چین اور جاپان میں امردوں کے قحبہ خانے موجود تھے۔ اہلِ یونان نے امرد پرستی کو قومی اور تعلیمی ادارہ بنا لیا اور ہم جنسیت ان کے معاشرے، مذہب، فلسفہ، قانون اور شعر و ادب میں نفوذ کر گئی۔ قدمائے یونان

امردوں کے حسن و جمال پر مرمٹتے تھے اور خوبصورت نوجوانوں سے عشق کرتے تھے۔ ہومر، ارسطو، سقراط اور افلاطون کے ہاں لڑکوں سے عشق کا تصور ملتا ہے۔ انہوں نے بعض جگہوں پر اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اُردو شاعری میں بھی امرد پرستی کا تصور ملتا ہے۔

موجودہ دور میں بھی یورپ اور امریکہ میں یہ وبا عام ہوگئی ہے۔ اس ضمن میں اختر علی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''یورپ میں ہم جنس پرست مردوں کے لیے "GAYS" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جب کہ عورتوں کے لیے "Lesbians" کی اصطلاح رائج ہے۔۔۔ مختصر یہ کہ یورپ کی نوجوان نسل انتہا درجے کی اباحیت کا شکار ہو چکی ہے اور ان ناگفتہ بہ حالات کو یورپین مفکرین بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں مشہور امریکی ماہر طبعیات مسز ہڈسن (Mrs. Hudson) کا بیان ہے کہ ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آ گیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوندِ خاک ہو جائے۔۔۔

۔۔۔ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام ترجیحات آزادانہ جنسی تعلقات، قحبہ گری، عصمت فروشی اور دیگر جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس لیے ان کی ساری تعمیری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویش ناک ہے۔ جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے ان بدترین آثار و نتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال اُبھر آتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیامیٹ ہونے کے شواہد ہیں یا اسباب؟ میری رائے یہ ہے کہ یہ آثار و شواہد بھی ہیں اور اسباب بھی۔''(۱۱)

مغربی معاشرے میں ہم جنسی افعال اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ ان سے اس امکان کو تقویت ملتی ہے کہ یہ دماغی یا نفسیاتی امراض کی علامتیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ ہم جنسیت کو دماغی خلل یا عارضہ سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے کینتھ واکر اور پیٹر فلیچر لکھتے ہیں:

''پست ذہنیت کے نوجوان ہم جنسی خواہشات سے فوراً مغلوب ہو جاتے ہیں اور ہم جنسی تعلقات کو بالکل اسی طرح جینے کا آسان طریقہ سمجھنے لگتے ہیں جس طرح پست ذہنیت کی لڑکیاں فوراً طوائفیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم جنسی افراد میں اعصاب زدہ اور اعصاب زدہ افراد میں ہم جنسی افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں علت کون ہے اور معلول کون، اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے لہٰذا خواہش کو ہم

جنسیت کی طرف موڑنے کو غیر متوازن مزاج کی نشاندہی نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح اس کی برعکس صورت پر جمے رہنا بھی غلطی ہے کہ ہم جنسی فرد کو اس کے مخصوص اخلاقی ڈھانچے کی وجہ سے سزا نہیں ملتی۔ جنسیت کا تعلق دوسرے احساسات سے اتنا گہرا ہے کہ اگر فرد کی جذباتی زندگی پر جنسیت کا کوئی اثر نہ پڑے تو یہ واقعی تعجب انگیز بات ہوگی۔ زیادہ امکان یہی ہوتا ہے کہ ہم جنسی فرد اس بات سے قطع نظر کہ دوسرے لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اپنی جنسی خواہش کو غلط سمت میں لے جانے کے باعث تکالیف میں مبتلا رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ زندگی کا صحیح لطف نہیں اٹھاتا۔''(۱۲)

ہم جنسیت کے اسباب کے بارے میں بہت اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن زیادہ تر ماہرین ماحول اور تربیت پر اصرار کرتے ہیں۔ کچھ اس عمل کو اعصابی خلل قرار دیتے ہیں اور ان کے خیال میں اسے کرداری الجھن کے متنوع مظاہر میں گردانا جانا چاہیے۔ جب کرداری اُلجھنیں درست ہو جائیں تو یہ بھی خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

''غالباً فرائیڈ نے اعصابی خلل کے ماخذات میں جنس کی اہمیت پر زور دیا تھا اور شاید ہم جنسیت کی سماجی ناپسندیدگی کے باعث اکثر معالجین ہم جنس پرستی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ جدید تجزیاتی تحقیقات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ دیگر کرداری الجھنوں کے حل ہو جانے پر ہم جنسیت خود بخود ہی ختم ہو جاتی ہے۔''(۱۳)

معاشرے میں ہم جنس پرست افراد کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگرچہ ان افراد کے اندر پہلے سے نفسیاتی بیماریاں موجود ہوتی ہیں اور معاشرے کی نفرت ہم جنسوں کو مزید احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے جو انہیں ذہنی لحاظ سے مزید ابنارمل بنا دیتا ہے۔ اگر معاشرہ ان سے نفرت نہ کرے بلکہ ان کی کردار سازی کرے اور ان کے اندر موجود کرداری الجھنوں کو رفع کیا کرے تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی صاف ستھری، بھرپور اور پُرمسرت زندگی گزار سکیں۔

محبت کا جذبہ بھی شعر و ادب میں مستقل مضمون کی صورت میں موجود ہے۔ محبت ایک فطری میلان طبع ہے جسے عشق بھی کہتے ہیں۔ یہ دو افراد عورت اور مرد کے درمیان کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت بنے بنائے تعلقات مثلاً بہن، بھائی، ماں باپ وغیرہ سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ چونکہ ان تعلقات سے ہٹ کر ہوتا ہے اس لیے دو مختلف افراد مل کر اس جذبے کی نشوونما کرتے ہیں یہی جذبہ جب ان کے شعور کا حصہ بنتا ہے تو وہ اپنے اس تخلیقی تعلق کو کسی طور پر ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے لہٰذا جتنی رکاوٹیں بھی آڑے آتی ہیں، وہ ان سب سے ہمت اور حوصلے کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے زبیر رانا لکھتے ہیں:

''عشق تو جنسی جبلت کی تسکین کرنا ہوتا ہے جبکہ دوسرا راستہ جنسی جبلت سے آزاد ہو جاتا ہے۔''(۱۴)

گویا محبت کی بنیاد جنس پر ہوتی ہے۔ مگر اس میں دونوں افراد جنسی کشش کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے لیے ہمدردانہ جذبات بھی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ ایک دوسرے کے دکھوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ محبت اگر صرف جنسی خواہش کی تسکین کے لیے ہو تو پھر شاید اس کو محبت نہیں بلکہ صرف ہوس کہنا چاہیے۔ اگر محبت میں جنس کا جذبہ بہت زیادہ غالب ہو تو وہ بھی محبت کی مسخ شدہ صورت ہوگی۔ اسی وجہ سے افراد میں کلچر آف لو نہیں پیدا ہوتا بلکہ صرف کلچر آف رومانس ہوتا ہے۔ رومانس میں تو کوئی فرد پہلی ہی نظر میں گھائل ہو جاتا ہے پھر دوسری نظر اٹھانے کا حوصلہ ہی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں اس کا انجام بھی بے بسی لاچاری اور یاسیت ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح کی محبت یا رومانس کو حماقت قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر علی، ڈاکٹر ہنری کے حوالے سے محبت اور احمقانہ محبت میں کچھ یوں تمیز کرتے ہیں:

۱۔ احمقانہ محبت فوری جذبات کو ابھارتی ہے۔ محبت آہستہ آہستہ ابھرتی ہے۔

۲۔ احمقانہ محبت اپنے مطلب کی ایک دو خوبیوں پر اکتفا کرتی ہے جس میں جنسی اپیل بھی شامل ہے لیکن حقیقی محبت خوبیوں کو محبوب میں تلاش کرتی ہے۔

۳۔ احمقانہ محبت میں دراصل عاشق خود اپنے سے عشق کرتا ہے۔ حقیقی محبت میں دوسرے شخص سے۔

۴۔ احمقانہ محبت میں دوسرا شخص ایک الگ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ آلۂ تسکین متصور کیا جاتا ہے۔ حقیقی محبت میں دوسرے شخص کا الگ وجود نہیں ہوتا بلکہ ''من تو شدم تو من شدی'' کے جذبات ابھرتے ہیں۔

۵۔ احمقانہ محبت میں تحفظ سے متعلق شبہات ہوتے ہیں۔ خوش فہمیوں کی کارفرمائی ہوتی ہے لیکن حقیقی محبت میں تحفظ پر یقین کامل ہوتا ہے اور اس کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔

۶۔ احمقانہ محبت میں ارادوں کی پختگی ختم ہو جاتی ہے۔ حوصلے پست ہو جاتے ہیں لیکن حقیقی محبت میں کام کرنے اور زندگی بنانے کا عزم بیدار ہو جاتا ہے۔

۷۔ جسمانی اور نفسانی عنصر احمقانہ محبت میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حقیقی محبت میں کم۔

۸۔ احمقانہ محبت کی کشش عارضی ہوتی ہے سچی محبت کی دیرپا۔''(۱۵)

محبت محض دو انسانوں کی ہوس رانی کا مسئلہ نہیں بلکہ ان میں باہمی احترام بھی ہوتا ہے۔ عموماً کوتاہ ہمت افراد حالات کا ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کرنے کی بجائے راستے میں ہی گمراہ ہو جاتے ہیں یا پھر محبت ہی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ گویا محبت کی بنیاد جنسی کشش پر تو ہوتی ہے لیکن محبت کرنے والے محض جنسی کشش کو ہی کی نذر ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ ایک دوسرے کے دکھوں اور غموں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ دونوں اپنے مسائل کو مشترک بناتے ہیں اور ان کے حل کے لیے مشترکہ پالیسی اختیار کرتے ہیں اگر وہ ایسا نہ کریں تو اس کا انجام خود غرضانہ ہوس پرستی کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔

جنسی تحریک اور شہوانیت کو بھی محبت کا لفظ دیا جاتا ہے۔ گویا جنسی جبلت ہی محبت ہے۔ انسان کی جنسی خواہش کی بنیاد اس کی محبت کرنے کی ضرورت یا نفسیاتی تنہائی سے چھٹکارا پانے کی ضرورت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یہ صرف جسمانی بھوک کا نام نہیں ہے۔ انسان بعض اوقات محبت میں تسکین تلاش کرتا ہے اور وہ اسے کسی دوسری ذات میں نظر آتی ہے اور اس ذات کو انسان اپنی ذات سے الگ اور ماورا خیال کرتا ہے۔ اگر وہ اسے حاصل ہو جائے تو وہ اپنی تنہائی پر قابو پا لیتا ہے جو اس کی بے چینی کا اصل محور ہوتا ہے۔

اس حوالے سے کینتھ واکر اپیٹر فلیچر لکھتے ہیں:

''محبت ہمیں کسی نامعلوم چیز کی تلاش پر مجبور نہیں کرتی جسے استعمال کر کے ہم لطف اٹھا سکتے ہیں، بلکہ کسی ایسے نامعلوم شخص کی تلاش پر مجبور کرتی ہے۔ جس سے ہم دو طرفہ تعلق یعنی مکمل، انسانی تعلق قائم کرنے کی توقع کر سکتے ہیں۔''(۱۶)

مختلف لوگوں نے محبت کی اپنے اپنے خیال سے وضاحت کی ہے۔ کسی کے نزدیک محبت تخلیقی عمل ہے، کچھ کے خیال میں اس میں اذیت اور خوشی کی تمام کیفیات ملتی ہیں۔ بعض نے محبت کو جنسیت کا نام دیا اور کسی نے محبت کے اظہار کو جنسیت کہا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

''محبت کے جسمانی اظہار کا نام جنسیت ہے اور اس کا ثبوت، اگر واقعی ثبوت کی ضرورت ہو، دونوں جنسوں کے درمیان رومانی محبت کی صورتوں میں ملتا ہے۔ حتیٰ کہ ان مثالوں میں بھی جہاں ہم جنسی لمس کا نام بھی نہیں لے سکتے جنس کارفرما ملتی ہے۔ اس کے زیر اثر مرد میں عورت کے لیے جذبات میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی لطیف تمنا صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کے قریب رہے اور وہ ہاتھ چھونے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ یہ مادہ کے لیے روح کا خراج عقیدت ہے۔''(۱۷)

جنسی تلذذ کے مختلف زاویے

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جنسی تلذذ کے مختلف زاویے ہیں۔ جن کو اختیار کر کے جنسی تسکین یا آسودگی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ زاویے جنسی خواہش کی تسکین کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ طبعی معمول سے مختلف ہوتے ہیں ان مختلف زاویوں کو جنسی انحرافات کا نام دیا جاتا ہے۔ جنسی انحرافات (Sex Deviations) سے مراد جنسی تسکین یا آسودگی کے لیے ایسے ذرائع اختیار کرنا ہے کہ جو جنسی تسکین یا آسودگی حاصل کرنے میں مسلمہ معیارات کے خلاف ہوں۔ ایسے ذرائع اختیار کرنے کو جنسی انحراف کہتے ہیں۔ فرد ان میں جنسی ملاپ کا بدل محسوس کرتا ہے یا بعض اوقات اس کو جنسی ملاپ میں بھی وہ سکون نہیں ملتا جو ان کو اختیار کر کے ملتا ہے۔ اب ہم ان زاویوں کی الگ الگ نشاندہی کرتے ہیں۔

ایذا کوشی (Sadism) اور ایذا طلبی (Masochism) دونوں ایک جنسی تحریک کے دو رُخ ہیں۔ ایک ساڈسٹ شخص خواہ مرد ہو یا عورت دوسرے کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچا کر جنسی حظ اٹھاتا ہے جبکہ میسوکسٹ جسمانی اور ذہنی اذیتوں کا دوسرے سے خواہاں ہوتا ہے۔ اس کی جنسی تسکین اس بات سے مشروط ہوتی ہے کہ دوسرا اُسے ذہنی اور جسمانی تکلیف پہنچائے۔ دوسرے لفظوں میں ساڈازم ایک ایسی صورت حال ہے جس میں ایک فرد جسمانی تکلیف پہنچا کر جنسی حظ اٹھاتا ہے اور میسوکزم میں ایک شخص اذیت کی خواہش کرتا ہے تاکہ وہ تکلیف کے ذریعے جنسی تحریک حاصل کرے۔

ایسا معاشرہ جس میں جبلی خواہشات کو بہت زیادہ دبانے پر زور دیا جاتا ہے وہاں کے افراد کے، شروع ہی سے، یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ایسی خواہشات کو دبانا ان کے اور ان کے معاشرے کے حق میں بہتر ہے۔ چنانچہ ان خواہشات کو اس معاشرے کے افراد جس قدر دباتے ہیں اور اس وجہ سے جتنی بھی اذیتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرتے ہیں وہ اتنے ہی ان چیزوں یا اذیتوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی رویہ انہیں میسوکسٹ بنا دیتا ہے گویا برداشت کرنے اور پھر مسلسل برداشت کرتے چلے جانے کا عمل انہیں اذیت پسند بنا دیتا ہے۔ گویا

ع مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔

عشقیہ شاعری میں ایذا طلبی کا موضوع کثرت سے نظر آتا ہے۔ عاشق اپنے آپ کو محبوب کے سامنے ذلیل وحقیر محسوس کرتے ہیں۔ محبوب کے ہاتھوں ذلیل ہو کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ جب محبوب ان پر ظلم وستم ڈھاتا ہے تو وہ اس سے بھی حظ اٹھاتے ہیں اور اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ اُردو کے مختلف شعرا کے دواوین اس طرح کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں۔

جنسی تلذذ کا اہم زاویہ جنسی علامت پرستی بھی ہوتا ہے۔ جنسی علامت پرستی یعنی فٹشزم (Fetishism) کیا ہے؟ ڈاکٹر عبدالرؤف کے بقول:

"مقابل جنس کے جسم کے کسی حصے یا اس کی نشانی سے شہوانی ہیجان محسوس کرنے کو فیٹشزم کہتے ہیں۔" (۱۸)

جنسی علامات کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت میں آدمی جسمانی علامات کے علاوہ دوسری اشیا سے حظ اٹھاتا ہے جیسے ربڑ، انڈر ویئر یا جوتے وغیرہ۔ دوسری صورت میں وہ کسی عورت کے جسم کے کسی حصے سے حظ اندوز ہوتا ہے۔

یہی جنسی علامت پرستی مرد و زن میں جنسی تحر [illegible] باعث بنتی ہے۔ چنانچہ انھیں بیرونی جنسی عوامل کے طور پر جنسی تحریک پیدا کرنے کا اہم ذ [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ دونوں جنسوں کے لیے [illegible]ونی جنسی عوامل جنسی عمل میں تحریک پیدا کرنے میں ا [illegible] جنسی عوامل کی نسبت بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن جب ان بیرونی عوامل یعنی جنسی علاما [illegible] جنسی عمل کا بدل سمجھ لیا جاتا ہے تو یہ ایک انحراف کی شکل بن جاتی ہے۔ اس انحراف کے حامل م [illegible] ابو علی عباس جلالپوری خبطی قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"جنسی علامت پرستی میں نف [illegible] خواہش اعضائے مخصوصہ سے منحرف ہو کر عورتوں کے لباس یا اعضاء پر مرکوز ہوتی [illegible]۔ یہ خاص مردانہ انحراف ہے جو عورتوں میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس نو [illegible] کے خبطی عورتوں کی زلفوں، زیر جاموں، چولیوں، جوتوں وغیرہ کو چرا کر انہیں حفاظت سے رکھتے ہیں اور یوں انہیں دیکھ دیکھ کر یا سونگھ سونگھ کر محظو [illegible] تے ہیں۔" (۱۹)

جنسی علامت پرستی کا [illegible] عموماً عورت کے قرب سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ ان میں اعتماد کی شدید کمی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنی خیالی دنیاؤں [illegible]م رہتے ہیں۔ اپنی شخصیت کے اظہار میں [illegible] کام رہتے ہیں۔ تنہائی پسند ہوتے ہیں اور [illegible] زندگ [illegible]وں کے سامنے پراسرار رکھتے ہیں لیکن ایسا ہمیشہ ضروری نہیں ہے۔ انتہائی نارمل [illegible] وقار اور [illegible] شخصیت کے حامل مرد بھی جنسی علامت پرستی کا شکار ہو سکتے ہیں لیکن ان کی یہ جنس [illegible] علامت پرستی [illegible] شخصیت اور ان کے کردار پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ اس کو اپنے اوپر طاری [illegible] کرتے لیکن [illegible] ضرور اٹھاتے ہیں۔

نمائشیت پسندی بھی جنس [illegible] ایک [illegible]ت ہے۔ خود نمائی انسان کی کمزوری ہے۔ وہ دنیا میں جو بھی عمل کرتا ہے اس کے [illegible] محرک [illegible]ئیت پسندی (Exhibitionism) کا بھی

ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں اپنے آپ کو نمایاں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ وہ نمائشیت پسندی کے ذریعے انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو الگ اور منفرد ثابت کرنا چاہتا ہے۔

نمائشیت پسندی میں اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز ثابت کرنے کے چکر میں یہ رویہ ذہنی عیاشی کا بھی سبب ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھیانک رُخ بھی اختیار کر جاتا ہے۔ جنسی نقطہ نظر سے اپنے آپ کی ضرورت سے زیادہ نمائش کرنا معاشرے میں ذہنی انتشار کا سبب بھی بنتی ہے۔

جنسی تلذذ کا ایک ذریعہ خود پسندی یا نرگسیت بھی ہوتا ہے۔ نرگسیت کے رویے سے مراد صرف اپنی ذات سے محبت کرنا ہے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ نرگسیت کی روایت کے بارے میں علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> ''یہ اصطلاح پی نیک نے یونانِ قدیم کے ایک صنمیاتی کردار نرسی سس (لغوی معانی ہے نرگس کا پھول) کے نام پر وضع کی تھی۔ نرسی سس دریا کے دیوتا سیفی سس کا بیٹا تھا اور نہایت حسین و جمیل تھا۔ ایک دن ایک جنگل میں سے گزرتے ہوئے وہاں کی ایک پری ایکوئس پر فریفتہ ہو گئی اور والہانہ انداز میں اُس سے اظہارِ محبت کیا لیکن نرسی سس جو اپنے حسن کے غرور میں مست تھا ملتفت نہ ہوا۔ اتنے میں اُسے پیاس لگی۔ وہ ایک چشمے کے کنارے جھک کر پانی پینے لگا تو پانی میں اپنے ہی عکس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ عرصے تک اپنے حسن کے نظارے میں محو بے خود چشمے کے کنارے لیٹا رہا حتیٰ کہ دیوتاؤں نے اُسے نرگس کے پھول میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ نرگس کا پھول یونانی اور ایرانی شاعری میں چشمِ حیراں کی علامت بن گیا۔ جنسیات کی اصطلاح میں جو شخص اپنے ہی حسن و جمال پر عاشق ہوئے نرگسیت کا مریض سمجھا جاتا ہے۔''(۴۰)

گویا نرگسیت کے مرض میں جو فرد مبتلا ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ سے ہی جنسی حظ اٹھاتا ہے۔ دراصل وہ نفسیاتی اور ذہنی لحاظ سے بالغ نہیں ہوتا۔ خصوصاً عورتوں کی نرگسیت میں آئینے کو اہم مقام حاصل ہے، اگرچہ نرگسیت کا شکار مرد بھی آئینے میں اپنا ہی نظارہ کرتے رہتے ہیں بعض اوقات یہ کیفیت شدید ذہنی مرض کی صورت بھی اختیار کر جاتی ہے۔

جنسی تلذذ کی ایک صورت ہوس دید بھی ہے جو خاص طور پر ہمارے سفرنامہ نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔

ہوس دید یعنی (Voyeurism) سے مراد ایسے لوگ جو دوسروں کو دیکھ کر جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ عموماً مردوں کی نسبت عورتیں اس سے مبرا ہوتی ہیں۔ اس نوع کے لوگ دوسروں کو

جنسی ملاپ کرتے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوا کرتے ہیں خواہ وہ فلموں کی صورت میں ہو یا تصاویر کی شکل میں۔ یہ جنسی تشفی کی بڑی پست صورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں میں عموماً حوصلے کا فقدان ہوتا ہے۔

جنسیات میں ایونیت یعنی (Transvestism) کا مفہوم ہے عورت کا مردانہ لباس پہن کر اور مرد کا زنانہ لباس پہن کر جنسی تسکین حاصل کرنا۔ ایسے افراد اپنے حلیے کو مخالف جنس کے حلیے جیسا بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اس سے حظ اٹھاتے ہیں۔

جنسی تلذذ کا ایک زاویہ ڈان یوآن بھی ہے جو بعض سفرنامہ نگاروں کے ہاں مریضانہ صورت میں ملتا ہے۔ ڈان یوآن کو نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ وہ فریق ثانی کی تسکین کرنے اور نہ خود بھرپور جنسی تشفی سے بہرہ مند ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ایسے لوگ نت نئی عورت کے پیچھے بھاگتے ہیں اور عمر بھر عورتوں کے تعاقب میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ڈان یوآن عمر بھر اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت سے مختلف ہے۔ ویسے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے معاملے میں طبعاً تعدد پسند ہے۔ ڈان یوآن کو اپنی قوت رجولیت پر اعتماد نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ احساس کمتری کا مداوا کرنے کے لیے عورتوں کا تعاقب کرتا ہے۔ جب عورت پر اس کی کم ہمتی کا راز منکشف ہو جاتا ہے اور وہ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے تو وہ لاشعوری جبر کا شکار ہو جاتا ہے اور نت نئے معاشقے سے اپنی نرگسیت کی تلافی کرتا ہے کیونکہ زندہ رہنے کے لیے بھی ہر فرد کسی نہ کسی محور کے گرد ضرور گھومتا ہے اور اپنی کمزوری کی تلافی کسی اور عمل سے کرتا ہے۔ لہٰذا ڈان یوآن عورتوں کو اپنی جانب مائل کرنے میں ہی حظ اٹھاتے اور اپنی جنسی تشفی کرتے ہیں۔

بعض سفرنامہ نگاروں کے ہاں جنسی لطف انگیزی کے لیے سفرناموں میں جو عنصر نمایاں نظر آتا ہے وہ جنس زدگی ہے۔ کچھ لوگ ہوا و ہوس کی رو میں یہ کر جنسی خواہش کی تسکین ہی کو زندگی کا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔ وہ دن رات اسی فکر میں رہتے ہیں۔ یہ رویہ بعض اوقات مریضانہ شکل بھی اختیار کر جاتا ہے۔ گویا ایسے افراد ایک ہی عینک سے سب کو دیکھتے ہیں۔ اس حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> ''مجرد مردوں اور کنواریوں کی جنسی فاقہ زدگی بھی مریضانہ صورت اختیار کر جاتی ہے۔ ایسی عورت جب کسی مرد سے بات کرتی ہے تو خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان ہو تو سوچنے لگتی ہے کہ یہ تو میرے درپے ہے۔ اس نوع کی ایک عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اپنے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں کوئی مرد تو نیچے نہیں چھپا بیٹھا۔ اس تجسس کی تہ میں فی الحقیقت یہ لاشعوری تمنا کارفرما ہوتی ہے کہ کاش کوئی مرد میرے پلنگ کے نیچے چھپا ہوتا۔''(۴۱)

یادرہے جنس زدگی کا یہ رویہ صرف عورتوں میں نہیں بلکہ شاید مردوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جنس زدگی ایسے افراد کے ذہن پر بُری طرح سوار ہو جاتی ہے اور یہی چیز ان کے لاشعور میں چلی جاتی ہے۔ ایسے افراد کی زندگی کا بھی صرف ایک ہی محور ہوتا ہے۔ جس کے گرد وہ ساری عمر گھومتے رہتے ہیں۔ ہمارے بعض سفرنامہ نگاروں کے ہاں بھی صنفِ مخالف کی طلب اسی رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ہوس نگاری جنسی تلذذ کا وہ ذریعہ ہے جو ہمارے سفرناموں میں بکثرت نظر آتا ہے۔ ہمارے بعض سفرنامہ نگار تو نرے ہوس نگار ہی نظر آتے ہیں۔

ہوس نگاری کا تعلق نفسانی لذت سے بالواسطہ ہے۔ اس نوع کے لوگ بیت الخلاء یا گاڑیوں کے ڈبوں وغیرہ میں فحش کلمے لکھتے رہتے ہیں۔ ان کو اس خیال سے جنسی تسکین حاصل ہوتی ہے کہ کوئی خوبصورت عورت انہیں دیکھے گی تو انہی یاد کرے گی ہوس نگاری بھی جنسی فاقہ زدگی کی دلیل ہے۔ یہ جنسی تشنگی کی گھٹیا صورت ہے ایسے افراد بھی عموماً نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ہمارے بعض سفرنامہ نگار اپنے سفرناموں میں جنسی گفتگو یا خوبرو دوشیزاؤں سے اپنی ملاقاتوں کے تذکرے زبردستی ٹھونستے ہیں۔ یوں وہ نہ صرف ڈان یوآن بلکہ ہوس نگاری کا شکار نظر آتے ہیں۔

اس طرح کے لوگ بالآخر ہوسِ دید سے یا فحش نگاری سے اپنا کتھارسس کرتے ہیں، اگرچہ یہ کتھارسس کا انتہائی پست طریقہ ہے۔

بعض سفرنامہ نگاروں کے ہاں اعادہ شباب کی خواہش کے ذریعے جنسی تلذذ حاصل کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ کچھ لوگوں کو بڑھاپے میں بھی جوان بننے کی آرزو ستاتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کا بھی واحد مقصد جنسی لذت کا حصول ہی ہوتا ہے۔ یہ جوان بننے کی کوشش میں طرح طرح کے نسخے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا محور و مرکز صرف جنس ہوتا ہے۔ نامساعد حالات اور نفسیاتی الجھنوں کے باعث بعض لوگوں میں یہ میلان نمایاں ہو کر مریضانہ صورت بھی اختیار کر جاتا ہے۔ بعض سفرنامہ نگاروں کو جنون ہوتا ہے کہ اپنے قارئین کے سامنے اپنے آپ کو ایسا ہیرو بنا کر پیش کریں جس پر عورتیں دل و جان سے فدا ہونے کو تیار بیٹھی ہوں۔

۳۔ جنس اور اخلاقیات / مذہب

اخلاق کا مفہوم مختلف قوموں اور زمانوں میں ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ یعنی اگر کوئی بات کسی قوم میں کسی وقت میں معیوب رہی ہے تو دوسری قوم میں اس کو اچھا خیال کیا گیا ہے بلکہ خود ایک ہی قوم نے مختلف زمانوں میں مختلف معیارات اخلاقیات قائم کیے۔ آج اہلِ یورپ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے عورت کے احترام و اقتدار کے قائم کرنے میں غیر معمولی حصہ لیا لیکن انہیں لوگوں پر

ایک زمانہ وہ بھی گزر چکا ہے جب عورت ان کے نزدیک بھیڑ بکری سے زیادہ کوئی چیز نہ تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو مارا جاتا اور اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

اس حوالے سے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''عورت اپنے شوہر کی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور مرد کو اختیار ہے کہ اس سے بار برداری کا کام لے۔ اسی طرح ہمالیہ کے حصوں میں آریہ ہندوؤں نے بتی قوموں کی طرح اشتراک فی النسواں اختیار کر رکھا ہے اور بازار کی دوسری جنسوں کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت ان کے یہاں رائج ہے۔''(۴۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حال صرف ان قوموں کا ہی نہیں جو اب بھی جاہل و وحشی خیال کی جاتی ہیں بلکہ ایسا دوران پر بھی گزر چکا ہے جو آج تہذیب و شائستگی کی علمبردار بنی ہوئی ہیں۔ خود انگریزی قانون میں اس امر کی اجازت پائی جاتی تھی کہ شوہر اپنی بیوی کو لکڑی سے زدوکوب کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ لکڑی انگوٹھے سے زیادہ موٹی نہ ہو۔ اس کے علاوہ جنسی سطح پر بھی اکثر مذاہب نے نہ صرف فحاشی کو گوارا کیا بلکہ اس کے رواج و اشاعت میں سبب اولین ثابت ہوئے۔ مصر قدیم میں فرعونوں کے عہد میں بھی جنس اور مذہب دونوں لازم و ملزوم رہے ہیں۔

اس حوالے سے علی عباس جلالپوری رقمطراز ہیں:

> ''آسس (نیل کا دیوتا) کے مندر میں ہر روز ہزاروں دیوداسیاں عصمت فروخت کرتی تھیں۔ ان سے ہمکنار ہونا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔''(۴۳)

اسی طرح سمیریوں (قدیم عراقی تہذیب) کی تہذیبی زندگی میں بھی عورت کا ایسا ہی کردار دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح حاملہ عورتوں کے، جن کے سینے کے ابھار کو بہت نمایاں کر کے دکھایا جاتا تھا، مجسمے دنیا کی کم و بیش تمام تہذیبوں کے آثار سے دریافت ہوئے ہیں۔ بغداد، قاہرہ، رُوم، پیرس، ماسکو، لندن، نیویارک، برلن، پیکنگ، موہن جودڑو، ایتھنز وغیرہ غرض دُنیا کے تقریباً تمام عجائب گھروں میں ایسی مورتیوں کی بہتات ہے۔ یہ مورتیاں بھی پوجا کی غرض سے بنائی جاتی تھیں۔

اس حوالے سے سبطِ حسن لکھتے ہیں:

> ''عمرانیات کے عالموں نے ان مورتیوں کو ''مادرِ ارض'' (دھرتی ماتا) کا لقب دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی زرعی عہد میں یہ مورتیاں زرعی پیداوار کی افزائش کے ساحرانہ رسوم میں استعمال ہوتی تھیں کیونکہ اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک عورت کا

تخلیقی عمل اور زمین کی زرخیزی کا عمل ایک ہی حقیقت کے دو رخ سمجھے جاتے تھے۔" (۲۳)

عہد قدیم میں مذاہب اور جنس میں بہت قریبی رشتہ سمجھا جاتا تھا۔ بت پرستوں نے اپنے مذہبی رسوم میں ہمیشہ جنس کو اہمیت دی اور جنسی فعل کو پرستش کے لیے لازم قرار دیا اور جنس کو روحانیت کا لبادہ اوڑھانے کی کوشش کی۔

مختلف مذاہب میں جنس کا تصور مختلف ہے جیسے توریت میں اخلاق جنسی کی ابتداء اس اُصول کی بنا پر ہوتی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق افزائش نسل کے خیال سے ہونا چاہیے۔ مسیحی تعلیم میں اگر مرد و عورت میں سے کسی کو شریک زندگی نہ مل سکے تو اُسے چاہیے کہ خدا پر بھروسہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر چپ چاپ بیٹھا رہے خدا کے سہارے یا بھروسے کی تعلیم دنیا بہت اچھی بات ہے لیکن فرد کی مشکلات کو دُور نہ کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ پھر ایسی تعلیم سے معاشرے میں قنوطیت بڑھتی ہے اور بعض اوقات مذہب و اُصول سے افراد انحراف بھی کرتے ہیں اور پھر وہ معاشرے میں کھل کھیلتے ہیں اور مذہب کو فضول چیز تصور کرتے ہیں۔

اب دنیا میں جنسی آزادی بھی نسبتاً زیادہ پیدا ہوتی جا رہی ہے اور عورت کی ذہنی و علمی ترقی نے اس کے مفہوم کو بھی بہت حد تک بدل دیا ہے۔ اس سے پہلے عورت تعلیم یافتہ نہیں تھی نہ اس کے پاس سیاسی حقوق تھے اور نہ وہ تجارت کر سکتی تھی اور نہ وہ کوئی فن سیکھ سکتی تھی اور قانون کی نظر میں بھی وہ مرد کے برابر نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن اب حالات خاصے بدل گئے ہیں۔ اب عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے الغرض وہ سب کچھ خود کرتی ہے اور اس سے اس کے اخلاقی معیار بھی بدل گئے ہیں۔

۴۔ اسلام اور جنس

جنسی انحراف کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن صرف اور صرف اسلام ہے جو انسانی زندگی کے دوسرے تمام مسائل کی طرح اس کے مسئلہ جنس کو بھی سب سے زیادہ موزوں اور متوازن طریقے سے حل کرتا ہے۔ اس طرح انسان اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صحیح رُخ پر اختیار کر کے دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکتا ہے اگرچہ آزادروی اور بندش سے گریز انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ عیش و عشرت کے اسباب اور لذتوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں جنس اس کی سب سے بڑی لذت ہے۔ اس لذت کے حصول میں انسان کی اس کمزوری کا مظاہرہ ہمیشہ سے اور سب سے زیادہ ہوتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے روئے زمیں پر قدم رکھنے کے ساتھ پہلے دن سے جملہ معاملات زندگی میں اس کی راہنمائی کا جو سامان کیا ہے آخری نبی ﷺ کے ذریعے یہ راہنمائی اپنے نقطۂ کمال کو

پہنچ گئی۔ قیامت تک کے لیے انسان کی اس ضرورت کی تکمیل کا سامان اس کے اندر بھرپور طریقے پر موجود ہے۔ مسئلہ جنس کے حل میں اسلامی تعلیمات میں جو توازن و اعتدال اور باریک بینی پائی جاتی ہے۔ کہیں اور نہیں ملتی۔

مسئلہ جنس کے سلسلے میں اسلام کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ انسانی زندگی میں وہ اس کی ضرورت کو پوری طرح تسلیم کرتا اور اسے قرار واقعی اہمیت دیتا ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کی سب سے شاہکار مخلوق ہے۔ اسی طرح اس کے اندر جو قوتیں اور صلاحیتیں ہیں اور اس کے جو مطالبات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ اور اس کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ جنس بھی انسانی وجود کی ایک بڑی قوت اور صلاحیت ہے جو انسان کی دوسری تمام قوتوں اور صلاحیتوں کی طرح اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے اور اس نسبت سے اس کے اندر کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اسلام کے دستور اساسی کے نزدیک جنس کی کیا اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیا کی لذتوں کے بیان میں وہ سرِ فہرست عورت کو قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی اس کو جوڑے کی صورت دینے والی عورت کو بھی پیدا کیا۔ مرد اور عورت کے اسی ملاپ اور ان کے جنسی قوت کے اظہار سے نسلِ انسانی کی بقا کا سامان ہوا۔

اللہ تعالیٰ سورۃ نساء میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں کے ذریعے بہت سارے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔" (۲۵)

حضرت آدمؑ کے لیے انواع و اقسام کی نعمتوں اور لذتوں بھری جنت بے کیف و بے رنگ رہی جب تک کہ اس میں انہیں اپنی صنفِ مقابل کی صحبت عطا نہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ سورۃ الاعراف میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور تمہارا جہاں سے جی چاہے کھاؤ۔" (۲۶)

دنیا کے اندر بھی انسان جو دینی زندگی اختیار کرتا ہے اور جس کے لیے وہ ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرتا ہے۔ اس کا محرک ایک جملے میں یہ بھی ہے کہ وہ آخرت میں دُکھ بھری زندگی سے بچ کر جنت بھری زندگی کا مستحق قرار پائے۔ جنت کی ان راحتوں اور نعمتوں کی تکمیل اسی صورت میں ہوگی کہ اہل ایمان بندوں کو دوسری لذتوں اور آسائشوں کے ساتھ من پسند بیویاں بھی عطا ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ سورۃ بقرہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اور اہلِ ایمان کے لیے جنت میں پاک صاف بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''(۲۷)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت میں ملنے والی بیویوں اور حوروں کے بیان کو سادہ نہیں رکھا بلکہ ان کے حسن و جمال کو تفصیل سے بیان کیا اور ان کی خوبصورتی کا پوری طرح احاطہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۃ صافات میں فرماتے ہیں:

''خدا کے مخلص بندوں کے پاس (جنت میں اپنے شوہروں پر) نگاہیں مرکوز رکھنے والی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی جیسے کہ وہ (شتر مرغ کے) چھپائے ہوئے انڈے ہوں۔''(۲۸)

انسان کے اندر جو جنسی کشش ہے اس کے اثر سے مرد کو عورت کے حسن و جمال اور اس کی خوبصورتی سے بھی ایک طرح کی جنسی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اسلام بھی اس جذبے کی تصدیق اور تائید کرتا ہے۔

اسلام انسانی زندگی میں جنس کی ضرورت و اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے اظہار کے لیے وہ آدمی کو آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ جہاں اور جس طرح چاہے اپنی اس فطری خواہش کو پورا کرے بلکہ وہ اس کے لیے رشتۂ ازدواج کا سخت حصار کھینچتا ہے۔ انسان اپنی جنسی ضرورت کو اپنی بیوی ہی سے پورا کر سکتا ہے۔ اس سے ہٹ کر اگر وہ کوئی قدم باہر رکھتا ہے تو اسلام کے نزدیک یہ سخت ترین جرم ہے جس کے لیے وہ سخت ترین سزائیں تجویز کرتا ہے۔

رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی خواہش کو پورا کرنا زنا کاری ہے جو اسلام کے نزدیک حرام اور سخت ترین جرم ہے۔ اسلام اس سے سختی کے ساتھ بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن اسے شدید ترین برائی اور بدترین راستہ قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید میں سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور زنا کے پاس بھی نہ جاؤ۔ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور بہت ہی بُرا راستہ ہے۔''(۲۹)

جنس کے پیچھے دیوانی جدید تہذیب نے جنس کے منحرف رویوں کے دروازے کو کھول دیا ہے بلکہ یورپ میں تو ہم جنسی پرستی کو پارلیمنٹوں میں باقاعدہ منظوری مل چکی ہے۔ اسلام جو رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلق کو سخت ترین گناہ قرار دیتا ہے۔ جنس کے منحرف رویے بھی اس کے نزدیک اسی طرح

سخت ترین جرم اور گناہ ہیں۔ ان جرائم کے سلسلے میں بھی اس کا رویہ ایسا ہی سخت ہے اور ان پر بھی وہ ویسی ہی پابندیاں اور بندشیں عائد کرتا ہے۔ جنس کے منحرف رویوں میں سب سے بدترین جرم مرد کا مرد سے غیر فطری جنسی تعلق ہم جنس پرستی یا امرد پرستی ہے۔ مہذب دنیا کی مختلف پارلیمنٹوں نے اس جرم کے لیے باقاعدہ سندِ جواز عطا کر دی ہے اور وہاں سماج کے ہر طبقہ میں یہ عمل کرنے والے لوگ موجود ہیں لیکن اسلام اس غیر فطری فعل کو سخت ترین جرم اور گناہ قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کا اہم ترین نکتہ اسی جرم کی اصلاح قرار دیا گیا ہے۔ جن کی قوم اس فعلِ بد کی ایسی عادی ہو چکی تھی کہ پیغمبر کی مستقل تنبیہہ کے باوجود اپنی حرکت سے باز آنے کے لیے تیار نہ ہوئی یہاں تک کہ عذابِ الٰہی سے پوری قوم اس طرح تہس نہس کر دی گئی کہ آج روئے زمین پر اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔

قرآن مجید میں سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور یاد کرو لوط کو جب اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کیا تم اس کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جسے تم سے پہلے دُنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ تم اپنی شہوانی خواہش کی تکمیل کے لیے عورتوں کے بجائے مردوں کے پاس آتے ہو۔ تم حد کو پھاندنے والے ہو۔''(۳۰)

آج ایڈز کا جو مہلک ترین مرض ہے۔ اس کا بھی بڑا سبب مردوں کی ہم جنس پرستی ہے۔

جس طرح مرد دوسرے مرد سے غیر فطری طریقے سے جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں بھی عورتوں سے غیر فطری طریقے سے جنسی تسکین حاصل کرتی ہیں۔ مردوں کی ہم جنسی کو (Homosexuality) کہا جاتا ہے اور عورتوں کی ہم جنسی کے لیے جدید اصطلاح لسبیئنزم (Lesbianism) ہے۔ اسلام میں جس طرح مرد کے ساتھ مرد کے غیر فطری فعل کو سخت ترین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح عورتوں کی ہم جنسی پرستی کو بھی سخت گناہ اور قابلِ تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی دُوررس نگاہوں نے آج سے چودہ سو سال قبل اس فتنہ کو بھانپ لیا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے صراحت فرما دی کہ جس طرح مرد کا مرد کے ساتھ غیر فطری طریقے سے جنسی تسکین زنا کے مشابہ فعل ہے۔ اسی طرح عورت کی عورت کے ساتھ ہم جنسی بھی زنا کے مترادف ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے زندگی کی سب سے قیمتی متاع ضبطِ نفس ہے۔ اپنے حالات کی وجہ سے کوئی نوجوان اگر شادی نہ کر سکے یا دین و دنیا کے مطلوب مقاصد کے تحت آدمی کسی عرصہ کے لیے اہل و عیال سے دور رہنے کے لیے مجبور ہو تو اس طرح کے حالات میں اپنی جنسی خواہش پر قابو رکھنے کا

بہترین ذیعہ اور حل نفلی روزوں کا اہتمام ہے۔ جس کے لیے آپ نبی اکرم ﷺ نے نوجوانوں کی جماعت کو خاص طور پر اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس طرح انھیں اپنی جنسی خواہش پر قابو پانے کے لیے کسی خلاف فطرت یا غیر فطری طریقے کا رُخ کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

جنس، ادب اور آرٹ

ہر دور کا ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ ایک فن کار معاشرے میں جو کچھ دیکھتا ہے، رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ کبھی تمثیل کے ذریعے تو کبھی کسی کردار کے سہارے۔ اگر معاشرے میں گھٹن ہے تو وہ اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جب فن کار جنس کا ذکر کرتا ہے تو بعض اوقات اس پر عریانی اور فحاشی کا الزام بھی عائد کر دیا جاتا ہے۔ فحاشی اور عریانی کے مسئلے کو سمجھنے اور جنس نگاری کے حوالے سے اس پر عائد الزام کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے فحاشی، عریانی اور جنس نگاری کی معنوی حیثیت اور اس کے دائرہ کار کا تعین کر لیا جائے۔

اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا میں فحاشی کا مفہوم کچھ یوں درج ہے:

''لغوی اعتبار سے یہ لفظ بدکاری اور بے حیائی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نفسیات کو اکسانے والے تمام افعال یعنی لچر اور بے ہودہ قسم کی فلمیں، برہنہ تصاویر، مجسمے، جنسی ڈرامے، ناچ اور شراب وغیرہ بھی فحاشی اور عریانی میں شامل ہیں۔''(۳۱)

انگریزی زبان میں فحاشی، عریانی اور جنس نگاری کے لیے لفظ (Pornography) استعمال ہوا ہے۔ یعنی لٹریچر اور فلموں میں جنسی عوامل کو بیان یا نمائش کے ذریعے ظاہر کرنا جس کا مقصد شہوانی جذبات کو بھڑکانا ہوتا ہے۔

نیاز فتح پوری نے فحاشی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''فحاشی نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اُصول کے خلاف خواہش نفسانی پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے۔ اس میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق صرف کسب زر سے ہے اور جس کو عصمت فروشی کہتے ہیں۔''(۳۲)

گویا ایسی تمام تصاویر اور تحریریں یا اس نوع کے تمام وہ ذرائع جو شہوانی جذبات کو اکسائیں، فحاشی کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ فحاشی بگاڑ اور خرابی کا سرچشمہ ہے۔

مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں رہتا کہ جنس نگاری کے حوالے سے فحش یا عریاں وہی تخلیقات قرار دی جائیں گی جن کا تعلق جنس برائے جنس سے ہے یعنی وہ

محض اس لیے پیش کی جاتی ہیں کہ ان کے ذریعے جنسی ہیجان پیدا کیا جا سکے۔ اس کے سوا ایسی تخلیقات کسی بھی سیاسی، سماجی یا ثقافتی مقصد کو حاصل کرنے کی اہل نہیں ہوتیں اور نہ ہی سیاسی، سماجی اور ثقافتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجنوں گورکھپوری جنسی تجربے کو زندگی کے بقیہ تجربات سے جدا کر کے دیکھنے کے خلاف ہیں۔

اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''جنسی تجربہ انسان کی زندگی کا نہایت اہم تجربہ ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں اور اس کے ساتھ اور بہت سے اہم اور سنگین تجربات انسانی زندگی کی ترکیب میں داخل ہیں کسی ایک تجربے کو اور تجربات سے جدا کر کے اس پر ضرورت اور حق سے زیادہ زور دینا حقیقت کی ایک بگڑی ہوئی تصویر پیش کرنا ہے۔ اس سے زندگی کا غلط اندازہ ہوتا ہے۔''(۳۳)

علم نفسیات نے خصوصاً جنسی جذبے اور زندگی کے تعلق کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ اس جذبے کی ماورائیت کو ختم کر کے اسے زمینی رشتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اور اس سے ادب میں اور وسعت پیدا کی ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

''نفسیات کے مطالعہ نے ہمارے لکھنے والوں کو یہ احساس دلا دیا کہ جنسی جذبہ خیر اور برکت کی چیز ہے، قدیم معاشرتی اقدار میں سب سے زیادہ اس رجحان کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی تھی۔ اب علم نفسیات کی ترقی نے اسے زندگی کی بنیادی قدروں میں شامل کر دیا ہے۔''(۳۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنسی جذبے کو جب تخلیقات میں بطور مقصد پیش کیا جاتا ہے تو یہ ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ جنس انسان کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بلکہ مددگار ہے اور اس جذبے کی قدر کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی قدر کرنا۔ جنس انسان کے اندر ٹھہراؤ اور توازن پیدا کرتی ہے اور اس کی شخصیت کو نکھار دیتی ہے۔

اس ضمن میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''TITIAN کی برہنہ تصویر دیکھنے کے بعد ہم بازار میں کود کر راستہ چلتی عورتوں کے کپڑے پھاڑنا نہیں شروع کر دیتے بلکہ اپنے جنسی جذبات میں ایک بہتر توازن اور ارتفاع پاتے ہیں شاید فحش سے پہلے والا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر آرٹ

ہمارے اندر کوئی جذبہ پیدا کرتا ہے تو وہ بقول ہربرٹ ریڈ، تحیر کا جذبہ ہے۔ اگر آرٹ صحیح قسم کا ہے اور پڑھنے والا اس سے کوئی غلط نتیجہ مرتب کرتا ہے یا اس کے اندر فاسد مادہ بھڑک اٹھتا ہے تو اس کے لیے اس فن پارہ کو ملزم نہیں گردانا جا سکتا۔ آرٹ شہوت پرستی یا دُنیا کے گناہوں پر زار و قطار رونا یا لال جھنڈا لے کر دو دو گز اونچے اُچھلنے لگنا نہیں سکھاتا بلکہ حسن، ترتیب اور آہنگ کو تحیر کی نظروں سے دیکھنا۔''(۳۵)

ایک حقیقی جنس نگار انتہائی غیر جذباتی انداز میں معروضی صورت حال کے پیش نظر جنس سے متعلق حقائق کو بیان کرتا ہے جبکہ ایک کوتاہ ہمت اور جنسی اعتبار سے محرومیوں کا شکار جنس نگار اپنے کتھارسس کے لیے اپنی تحریروں میں ہوس انگیز مناظر لے کر آتا ہے جو اس کی اپنی بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ یوں وہ اپنی لاشعوری خواہشات کا پردہ چاک کر رہا ہوتا ہے۔ دراصل وہ ان ناآسودہ خواہشات کے نام پر خود لذتی میں مصروف ہوتا ہے۔ وہ اپنے سفلی جذبات کو ارتفاع دے کر اُن سے حظ حاصل کرتا ہے جس سے اُس کی تشنہ تمناؤں کی تشفی ہو جاتی ہے۔ یوں مصنف کی تخلیقات کا مطالعہ کر کے مخصوص نفسی واردات کو اور اس کے ذہنی ارتقا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنسی جبلت ایک بہت بڑی قوت ہے مگر فن کار کے تخلیقی تجربے میں صرف جنسی قوت ہی کام نہیں کرتی بلکہ دیگر خارجی عوامل، سماجی اور معاشرے کی بدلتی ہوئی قدریں بھی فن کار کو متاثر کرتی ہیں انہیں نظر انداز کرنا بے جا ہوگا۔ جو فن کار صرف اور صرف اسی لذت (جنسی) کے حصول کے لیے فن پارہ تخلیق کرتا ہے۔ ایسی جنس نگاری ہی دراصل فحش کی ذیل میں آتی ہے۔ ایسی تحریریں جنس کی اعلیٰ سطح یا حقیقت نگاری کی نہیں بلکہ جنس کی عمومی سطح یا محض جنسی تلذذ کی عکاسی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ادب اور فنون لطیفہ میں در آنے والی عریانی کی حدود کا تعین بھی کرتے ہیں اور عریانی کے فن کارانہ استعمال کی طرف توجہ بھی دلاتے ہیں۔

اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''جنس انسانی جبلت ہے اور ہم سب اسی کا ثمر ہیں۔ عریانی ادب اور فنون لطیفہ سے وابستہ تخلیقات میں ناگفتنی کو گفتنی اور مخفی کو واشگاف کرنے کا ہنرمندانہ قرینہ ہے مگر فنکارانہ اسلوب سے بعض اوقات تخلیق کے مخصوص تقاضوں، سماجی حقیقت نگاری، مخصوص صورت حال یا کردار سے وابستہ واقعیت نگاری کے لیے لازم ہوتا ہے۔ فحاشی جنسی فعل کی انتہائی واشگاف اور غیر تخلیقی صورت ہے جو فن کارانہ حسن سے تہی غیر جمالیاتی اور محض کمرشل ہوتی ہے۔''(۳۶)

آرٹ، فحش اخلاقیات اور اقتصادیات سے بہتر اور بلند تر ہوتا ہے۔ جو فرد آرٹ کے مزے سے واقف ہو جائے، اس کے لیے فحش اپنے آپ پھُسپھُسا ہو کر رہ جائے گا کیونکہ وہ ذہنی طور پر تندرست ہوگا اور وہ فحش کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فحش سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور اپنی جمالیاتی حس کو اس سے تسکین بھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بنیادی طور پر اس کے اندر وسعت ہوتی ہے۔

ایک حقیقی جنس نگار زندگی کی رعنائیوں اور سنگینیوں کا ذکر بھی بلا تامل کرتا ہے۔ وہ اگر کوئی چیز جنس کے پردے میں بیان کر رہا ہوتا ہے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ وہ جنس نگاری محض تلذذ کے لیے کر رہا ہے بلکہ وہ تو علمی و ادبی سطح پر اعلیٰ حقائق بیان کر رہا ہے۔

اس ضمن میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''مائیکل انجلو کی مشہور تصویر ہے ''تدفین'' عیسیٰ کو بالکل برہنہ دکھایا گیا ہے کیونکہ موت کے اثر کو جسم کے ہر حصے سے ظاہر کرنا مقصود تھا اور خصوصاً ٹانگوں سے چہرے پر انتہائی سکون اور روحانیت طاری ہے۔ مصور کو یقین تھا کہ جنسی حصے عریاں کر دینے سے اس روحانی جمال پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ اگر اس کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا تو مائیکل انجلو جیسا مصور کبھی بھی عریانی کی خاطر عریانی پسند نہ کرتا چنانچہ روبنز نے اپنی تصویر ''مردہ مسیح'' میں تھوڑا سا حصہ ڈھک دیا ہے حالانکہ یہاں چہرہ پُر جمال نہیں بلکہ بالکل کسی عام مصلوب لاش کا سا ہے۔ یہ پردہ اس وجہ سے کہ سر پیچھے کی طرف ڈھلکا ہوا ہے۔ اگر جنسی حصے جن کی جگہ تصویر میں آگے ہے، کھلے ہوتے تو وہ نظروں کو وہیں روک لیتے اور بازوؤں کی قوت اظہار میں بھی حارج ہوتے۔ یہ فیصلہ تو فن کارانہ احساس ہی کرتا ہے کہ کس جگہ عریانی موزوں ہے اور کہاں ناموزوں۔''(۳۷)

شاعری، تمثیل نگاری، موسیقی، مصوری اور بُت تراشی میں جنسی محرکات و عوامل شروع سے کارفرما ہیں۔ پوری دنیا میں عظیم شعرا نے جذبۂ عشق کی پُرجوش ترجمانی کی ہے۔ کسی قوم کے ادب میں اُس کے اخلاق کا عکس پڑتا ہے اور اس قوم کی فاسقانہ زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کسی عہد کے اخلاقی محاسن کو بھی اُس زمانے کے مصائب کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ پھر ایسا ادب ہی معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے جبکہ محض فحش ادب کسی معاشرے کی قدروں کی حقیقی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ وہ سراسر پریشانہ خیال آرائی پر مبنی ہوتا ہے۔ ایسے ادب میں زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے ایک ایسے خیالی عالم میں پناہ تلاش کی جاتی ہے جس میں سوائے جنسی تلذذ کے کچھ نہیں ہوتا جبکہ سچا ادب فحش ہو

ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ محض خیال آرائی پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کا رشتہ روزمرہ اور اس کے مسائل سے بلاواسطہ استوار ہوتا ہے اور وہ زندگی ہی سے اپنی موضوعات تلاش کرتا ہے۔ اس میں جنسی جبلت اور عشق ومحبت کا پاکیزہ جذبہ شامل ہوتا ہے۔ فحش نگاری اور نفسیاتی حقیقت نگاری میں فرق ہی یہ ہے کہ نفسیاتی حقیقت نگاری کا واحد مقصد معروضی اور غیر جذباتی انداز میں جنس سے متعلق حقائق کو کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے جبکہ ایک فحش نگار کا واحد مقصد ہوس انگیزی ہوتا ہے اگرچہ کچھ ادبی تحریریں تو سراسر فحش ہی ہوتی ہیں اور کچھ میں بعض مقامات فحش ہوتے ہیں۔

حقیقی جنس نگار حقیقت کو بیان کرنے کے لیے جنس کا سہارا لیتا ہے گویا جنس مقصد نہیں بلکہ مقصد کو بیان کرنے کا ایک زینہ ہے، اگرچہ اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جنسی خواہش انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ اس کو دبانا یا کچلنا کتنا جائز ہے۔ اس حوالے سے ایم ڈی تاثیر لکھتے ہیں:

> ''جنسی خواہش ایک فطری حقیقت ہے۔ اس کو دبانا بھی عیب ہے اور اس کو جا و بے جا ننگا کر کے دکھانا بھی مگر یہ عیب کوئی ایسا عیب نہیں کہ جس سے اس کا ارتکاب ہو جائے اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اگر بعض ادیب کبھی کبھار اعتدال کی حد سے گزر جاتے ہیں تو کیا ہوا۔ میرزا شوق کی مثنویاں، داغ کے بعض اشعار، سعدی کی گلستان کا باب پنجم، مولوی رومی کی مثنوی کی بعض کہانیاں کچھ کم ہیں؟'' (۳۸)

اب جہاں تک جنس نگاری کے حوالے سے فحاشی سے متعلق نظریات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں دو انتہا پسندانہ آراء کم و بیش ہر معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک گروہ اخلاق پسندوں کا اور دوسرا آزاد خیال لوگوں کا ہے۔ اخلاق پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد یا جنسی جرائم کی رفتار میں اضافے کا بنیادی سبب فحاشی ہے۔ اس سے فرد براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتا ہے اور آزاد خیال لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی بھی بالغ شخص کی ذاتی زندگی پر کسی بھی قسم کی قدغن نہیں ہونی چاہیے وہ زندگی کا سفر جس اور جیسی ڈگر پر بھی چل کر کرنا چاہے، اس میں کوئی فرد یا طبقہ مزاحم اور کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایسی پابندیوں کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اگر ایسا کرنے میں کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو؟ غرض اخلاق پسند کم و بیش تمام جرائم کی تہہ میں فحاشی کے عنصر کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ دیگر معاشرتی پہلوؤں نیز سیاسی و ثقافتی عوامل سے صرف نظر کر جاتے ہیں جبکہ آزاد خیال لوگ فحاشی کے مضمرات سے بحث ہی نہیں کرتے۔ وہ تمام سماجی وظائف خواہ وہ فحش ہی کیوں نہ ہوں ادا کرنے پر کسی بھی نوع کی پابندی کے سخت خلاف ہیں اور وہ اسے فرد کی آزادی پر حملے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ ایسے میں ایک فحش نگار کو بھی کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ

اپنی تحریروں میں جو چاہے رقم کرتا پھرے کیونکہ ایسا کرنے میں بظاہر کسی کا نقصان ہوتا بھی نظر نہیں آتا۔

ادب میں جنس نگاری کا رجحان شروع سے دکھائی دیتا ہے۔ ادب کی مختلف اصناف میں یہ رجحان کہیں دبا ہوا اور کہیں صراحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ شاعری، شاعری کی مختلف اصناف، خاص طور پر مثنوی، ریختی، غزل اور نظم میں جنس نگاری کے واضح نشانات موجود ہیں۔ نثر میں بھی جنس نگاری محبوب موضوع رہی ہے۔ افسانہ، طنز و مزاح، ناول، داستان غرضیکہ تمام اصناف میں یہ رجحان صاف دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں سفرنامہ ادبی صنف کی حیثیت رکھتا ہے اور اس صنف میں بھی جنس نگاری کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موضوع کی رعایت سے یہ حق ہے کہ سفرنامے میں اس رجحان پر تفصیل سے بات کی جائے جو ابواب مابعد میں پیش کی جائے گی۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ احمد دہلوی، سید، مرتب، فرہنگ آصفیہ، جلد اول لاہور: مکتبہ حسن سہیل، سنہ ندارد

2-Webster's Dictionary-England: World Publisking company, 1986-P-1305

3-Oxford dictionary- oxford: Clarendon Press, 1986-Vol II-P.958

۴۔ بحوالہ صلاح الدین درویش، اردو افسانے کے جنسی رجحانات، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰

۵۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، فرائڈ: نظریہ وتحلیل نفسی، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۳ء، ص ۴۳

۶۔ سیمون دی بووا، عورت (مترجم یاسر جواد) لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۲۔۱۱۳

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۸۔ شہزاد احمد، فرائیڈ کی نفسیات، دو دور، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۷۰

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۲

۱۰۔ زبیر رانا، عشق کا مارکسی تصور، لاہور: ری پبلکن بکس، ۱۹۸۹ء، ص ۶۹

۱۱۔ اختر علی، جنسی بے راہ روی اور قوموں کا زوال، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۴۔۱۰۵۔۱۰۶

۱۲۔ کینتھ واکر، پیٹر فلیچر، جنس اور محبت (مترجم سید قاسم محمود) لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۷

۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۹

۱۴۔ زبیر رانا، عشق کا مارکسی تصور، ص ۴۵

۱۵۔ اختر علی، ڈاکٹر، جنسیات اور ہم، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۸

۱۶۔ کینتھ واکر، پیٹر فلیچر، جنس اور محبت، ص ۹۷

۱۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں، ص ۶۷

۱۸۔ عبدالروف، ڈاکٹر، بچوں کی نفسیات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۶ء، ص ۲۵۷

۱۹۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، جہلم: خرد افروز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۸۔۲۵۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۱۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، ص ۲۵۸

۲۲۔ نیاز فتح پوری، ترغیبات جنسی یا شہوانیات، لاہور: آواز فاؤنڈیشن برائے تعلیم، سنہ ندارد، ص ۳۰۰۔۳۰۱

۲۳۔ علی عباس جلالپوری، روایات تمدن قدیم، جہلم: خرد افروز، ۱۹۹۱ء، ص ۴۲

۲۴۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۷ء، ص ۵۹

۲۵۔ قرآن مجید، سورۃ النساء، آیت ۱

۲۶۔ قرآن مجید، سورۃ الاعراف، آیت ۱۹

۲۷۔ قرآن مجید، سورۃ البقرہ، آیت ۲۵

۲۸۔ قرآن مجید، سورۃ الصافات، آیت ۴۸۔۴۹

۲۹۔ قرآن مجید، سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۳۲

۳۰۔ قرآن مجید، سورۃ الاعراف، آیت ۸۰۔۸۱

۳۱۔ حامد علی خان، مولانا، مرتب، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۶۰

۳۲۔ نیاز فتح پوری، ترغیبات جنسی یا شہوانیات، ص ۱۰

۳۳۔ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳۹

۳۴۔ فضل الرحمٰن خاں، اودھ کھایا امرود، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰

۳۵۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں (حصہ اول) (مرتبہ سہیل عمر) لاہور: مکتبہ الروایت، سنہ ندارد، ص ۱۷

۳۶۔ بحوالہ صلاح الدین درویش، اردو افسانے کے جنسی رجحانات، ص ۳۱

۳۷۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں (حصہ اول)، ص ۸

۳۸۔ ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر، مقالات تاثیر (مرتبہ ممتاز اختر مرزا) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء، ص ۲۳۶

☆☆☆

باب دوم

اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان

۱۹۴۷ء سے پہلے

اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان

۱۹۴۷ء سے پہلے

فرہنگ آصفیہ میں سفرنامہ کے یہ معنی مندرج ہیں:

''سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روزنامچہ سفر، حالات و سرگزشت سفر''(۱)

فیروز اللغات میں سفرنامہ کے یہ معنی دیے گئے ہیں:

''سفر کے حالات پر کتاب یا سیاحت نامہ''(۲)

گویا سفرنامہ کا مطلب ہے سفر کا روزنامچہ، سفر کے حالات پر مشتمل مضمون یا کتاب— سفرنامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفرنامہ کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفرنامے کی تعریف یوں کرتی ہیں:

''سفرنامے کے معنی داستان سفر، رُوداد سفر یا سفر کے قصے کے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔ انگریزی میں اسے سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصوّر تقریر بتایا گیا ہے۔''(۳)

ڈاکٹر انور سدید سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سفرنامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی

طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔"(۴)

نفیسہ حق سفر نامہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''سفر عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی مسافت طے کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونا کے ہیں۔ اُردو زبان یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

''نامہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں خط، فرمان یا مجموعی طور پر تحریر شدہ عبارت۔ اس لئے اُردو کے علماء نے ''سفر'' عربی سے اور ''نامہ'' فارسی سے لے کر سفر نامہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اُردو میں سفر نامہ روداد سفر یا سفری تجربات، مشاہدات کو رقم کرنے کے ہیں۔"(۵)

ڈاکٹر خالد محمود سفر نامے کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

''سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے۔"(۶)

سفر نامہ انسان کے جذبۂ تحیر کا اظہار ہے۔ ایک بالغ نظر سفر نامہ نگار تخلیقی قوتوں کے ساتھ سفر نامہ تحریر کرتے ہوئے قاری کے لئے تجسس اور تحیر اور آنے والی نسلوں کے لئے جیتی جاگتی تاریخ مہیا کر دیتا ہے۔ سفر نامہ نگار دورانِ سفر جو کچھ دیکھتا ہے، اس کے منتخب پہلوؤں کو اپنی تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سفر نامے کا تمام تر مواد اپنے گرد و پیش سے لیتا ہے اور ہر چیز کو ظاہری ہی نہیں، باطنی نظر سے بھی دیکھتا ہے اور پھر اس چیز کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ وہ ہر شے کو تجسس سے دیکھتا ہے۔ یہ تجسس کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اس ابتدائی انسان کی آنکھوں میں موجود تھا جو زمین پر اُترا تھا۔

اسلام کے عقیدے کے مطابق حضرت۔ آدم علیہ السلام وہ پہلے انسان ہیں جو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجے گئے۔ دراصل وہی انسان کا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے آبادی زیادہ ہوتی گئی انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل : نے لگے اور اس طرح یہ سفر مزید آگے بڑھنے لگا۔

سفر نامہ پر بحث کرتے ہوئے جو پہلا سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیا یہ کوئی ادبی صنف ہے؟ یہ سوال غالباً بعض معروف ادیبوں کے سفر نامہ لکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص سفر نامہ لکھے کیا اسے ادیب قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ بہت سے سفر نامے ایسے

بھی لکھے گئے ہیں جو صرف معلومات کا پلندہ ہیں۔ ان میں کوئی ادبی خوبی نہیں ملتی۔

سفر نامے کا مقصد اپنے تجربات اور مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ شروع شروع میں جو سفر نامے لکھے گئے ان کا مقصد کسی ملک یا مقام کے بارے میں جغرافیائی اور تاریخی معلومات فراہم کرنا تھا یا پھر ان مقامات کی سیاحت سے پیدا ہونے والی حیرت کا اظہار۔ چنانچہ ابتدائی دور کے سفر نامے اسی نوعیت کے ہوتے تھے اور لوگ ان سفر ناموں کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ اس لیے کہ اُس دور میں رسل و رسائل اور مواصلات و ابلاغ کے ذرائع نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ لوگ مہینوں بلکہ برسوں میں ملکوں کا سفر کرتے تھے۔ اُس دور کے لوگ دوسرے ممالک کے بارے میں کم جانتے تھے اس لیے تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے حصول کے لئے ان سفر ناموں کا بہت شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ اب اس ترقی یافتہ دور میں دُنیا سکڑ کر ایک ''عالمی گاؤں'' میں تبدیل ہو چکی ہے اور مختلف ذرائع ابلاغ کی ترقی کے باعث دنیا کے کسی ملک یا خطے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ قدیم سفر ناموں کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اُردوں کے قدیم سفر ناموں میں بالعموم یہی طریق عمل رائج رہا ہے۔ سفر نامہ نگار بیشتر ایسی معلومات جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جو مستقبل کے مسافروں کے لیے ضروری معلومات فراہم کرنے کا کام دیتیں اور انہیں راستے کی صعوبتوں سے بچا لیتیں۔ اُردو کے نامور مورخ ادیب شبلی نعمانی نے سفر نامہ ''مصر و روم و شام'' کے ابتدائیہ میں ملک کی حالت، انتظامیہ کا طریق، عدالت کا اُصول، تجارت کی کیفیت اور عمارتوں کے نقشہ جات وغیرہ کو سفر نامے کے لیے لازمی اور ضروری قرار دیا ہے۔"(۷)

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے سفر ناموں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور اب قارئین ان سفر ناموں کو زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں جن میں خارجی حقائق اور مشاہدات کی نسبت نجی تجربات اور داخلی تاثرات زیادہ ہوں۔ آج بھی بعض سیاح ایسے ہیں جو دوسرے ممالک کی سیاحت کے دوران میں وہاں کی جغرافیائی خصوصیات یا اس کی تاریخ کے بارے میں معلومات کا انبار لگا دیتے ہیں جبکہ یہ ساری معلومات اب اس ملک کے دفتر سیاحت کے کتابچوں سے بھی بآسانی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ اب انٹرنیٹ کی سہولت نے اس مسئلے کو کافی حد تک کم کر دیا ہے۔ اس کے برعکس قدیم سفر نامے میں داخلی احساسات بہت کم ملتے ہیں کیونکہ اُس زمانے میں قاری خارجی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:

''تاریخ'' جغرافیہ، تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، سیاست، معاشرت

مذہب، ادب، اقتصادیات غرض بیسیوں ایسے موضوعات ہیں جو قدیم سفرناموں کے دامن میں ہیرے جواہرات کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب آمد و رفت دشوار تھی۔ اس قسم کے معلومات افزا واقعات اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ تاریخی واقعات اور آثار قدیمہ سے متعلق قصے کہانیاں یا مناظر فطرت کے مرقعے ہر چیز کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لیے طبیعت بے چین رہتی تھی۔"(۸)

اس بحث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سفرنامے میں معلومات نہیں ہونی چاہئیں۔ سفرنامے میں حقیقت کا ہونا بھی بہت ضروری امر ہے کیونکہ حقیقت کے بغیر سفرنامے کی اصل روح مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ سفرنامہ نگار اگر تاریخی آثار کا ذکر کرے گا تو ان کا محل وقوع وہی رقم کرے گا جو فی الواقع ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کو اپنے تخیل کی مدد سے کسی دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس طرح وہ اپنی بصارت اور بصیرت سے پورا پورا کام لیتا ہے۔ سفرنامے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی رنگین بیانی، مبالغہ آرائی، شعوری کاوش یا بے موقع لطائف وغیرہ بھی اس کی روح کو مجروح کرتے ہیں اور ایسا سفرنامہ معتبر خیال نہیں کیا جاتا۔ سفرنامے میں اسلوب اور طریق اظہار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی صاحب طرز مصنف سفرنامہ لکھتا ہے تو اپنے طرز بیان کے باعث سفرنامے کو چار چاند لگا دیتا ہے اور اس میں ایسی ادبی شان پیدا کر دیتا ہے کہ قاری اس کی زبان اور اسلوب سے بھی محظوظ ہوتا رہتا ہے۔

اس ضمن میں شہزاد منظر اپنے مضمون "سفرنامہ نگاری۔ ایک ادبی صنف" میں لکھتے ہیں:

"جدید سفرنامے میں اسلوب اور طرز بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ سفرنامے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جو خوبصورت زبان اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہوں لیکن اس نوع کے سفرناموں میں ایک عیب یہ ہوتا ہے کہ سفرنامہ نگار سفرنامے کو افسانہ بنا دیتا ہے اور ایسی صورت اختیار کرتا ہے جیسے وہ افسانے کا ہیرو اور سیاحت کے دوران ہر ملنے والی غیر ملکی لڑکی اس کی عاشق۔"(۹)

آج کل ایسے سفرنامے کم ہی ملتے ہیں جو محض معلومات کا پلندہ ہوں۔ اصل میں عصر حاضر میں یہ بات سمجھ لی گئی ہے کہ سفرنامہ ادب کی وہ صنف ہے جو ایک عام قاری کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اسی لیے بہت سے سفرناموں میں رومانوی عناصر اور افسانے کی چاشنی کچھ زیادہ ہی ملتی ہے۔ لیکن سفرنامے کو محض تفریح کی سطح تک لے جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس میں سچائی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ واقعات اور مشاہدات کے سلسلے میں مصنف کا طرز بیان افسانوی ہو سکتا ہے لیکن حقیقت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا یا اسے افسانہ بنا دینا درست نہیں ہے۔ اس سے صداقت مجروح ہوتی ہے۔

قدیم اور جدید سفرناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"قدیم سفرنامہ زیادہ تر خارجی کوائف جمع کرتا تھا۔ لیکن جدید سفرنامے نے خارج اور داخل دونوں جہتوں کا احاطہ کیا ہے اور اب سفرنامہ ایک ایسی صنف ادب کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں داستان، کہانی اور آپ بیتی کے بیشتر عناصر شامل ہیں، تخلیقی اسلوب کی آمیزش نے اس میں شعری کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ سفرنامہ صرف نئے ملکوں اور براعظموں کو ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ سیاح کے داخل میں آباد دنیا کی بھی دریافت ہے اور اب یہ دو دنیاؤں کے سنگم پر تخلیق ہو رہا ہے۔"(۱۰)

ایک سفرنامہ نگار جب یہ سوچ کر سفر کرتا ہے کہ اسے ایک سفرنامہ بھی لکھنا ہے تو اپنی پسند اور سہولت کے مطابق تکنیک بھی وضع کر لیتا ہے۔ اس کی قوت باصرہ جس قدر تیز ہوتی ہے اسی قدرت تیزی کے ساتھ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر کام کی چیزوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے۔ مناظر اور واقعات کا یہی انتخاب اس کی بصیرت کا امتحان ہوتا ہے۔ پھر وہ اس بات کو بھی مدنظر رکھتا ہے کہ کس چیز کو نظر انداز کرنا ہے اور کس پر زیادہ توجہ صرف کرنی ہے۔ کونسی چیز اہم ہے اور کونسی غیر اہم گویا اس مقام پر سفرنامہ نگار کی جمالیاتی حس کا برمحل استعمال نہایت ضروری ہے۔

تکنیک کے مناسب استعمال سے سفرنامے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور قاری کو اکتاہٹ یا بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس طرح سفرنامہ نگار قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود سفر کر رہا ہے اور مختلف مقامات کی سیر سے محظوظ ہو رہا ہے گویا سفرنامہ پڑھتے ہوئے قاری کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

"ایک اچھے سفرنامے میں سیاح اور ادیب دونوں ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چلتے ہیں۔ سیاح اپنے تیز باصرہ سے ماحول کی جزئیات کو سمیٹتا ہے۔ ادیب ان جزئیات کو خوبصورت، دلکش اور جاذب توجہ اسلوب میں یوں پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہمکلام ہو جاتا ہے۔"(۱۱)

گویا اس طرح نہ صرف قاری کو اپنائیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ سیاح یا سفرنامہ نگار سے ایک لحاظ سے محو گفتگو بھی ہوتا ہے اور قاری سیاح کی ہر ذہنی واردات کو بھی اپنی واردات تصور کرنے لگتا ہے۔ قدیم سفرناموں میں زیادہ تر عمارات اور شہروں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں زندگی کی متحرک تصاویر کہیں نہیں بلکہ جغرافیائی حالت زیادہ ملتے ہیں۔ جبکہ جدید سفرنامے میں مختلف اقوام کے درمیان

معاشرتی تہذیبی اور فکری تصادم بھی نظر آتا ہے۔ اس سے قاری کے اندر محبت اور نفرت کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں گویا جدید جدید سفرنامے میں سیاح اور قاری کے درمیان دوئی کو بہت حد تک کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ قدیم سفرنامہ اس عنصر سے محروم ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''قدیم سیاحوں نے زیادہ تر خارج کے واقعات مشاہدات اور کوائف سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس لحاظ سے قدیم سفرنامے کا کینوس کچھ زیادہ وسیع نہیں تاہم اس کا اہم پہلو سفرنامے کی صداقت ہے اور اس پر آپ بیتی کا انداز غالب ہے۔ سفرنامہ نگار کا اسلوب سادہ ہے اور اس سفرنامے کو زیادہ تر دلچسپ اور نئی معلومات کا مرقع بنانے کی ہی کوشش کی۔ قدیم سفرنامہ صرف ایک جہت میں سفر کرتا ہے اور یہ علوم عمرانی کے لیے ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۱۲)

جدید سفرنامے میں مشاہدے کی قوت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اس میں محض علم تاریخ یا علم جغرافیہ سے کوائف ہی نہیں اکٹھے کیے جاتے بلکہ سفرنامہ نگار اپنے اسلوب سے سفرنامے میں خوشگوار اور دلچسپ واقعات بھی بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگار اپنے مشاہدے سے سفرنامے میں اس دور کا بھی تذکرہ کرتا ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ اس سے آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سفرنامہ نگار اپنے مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

سفرنامہ نگار کے لیے ایک اہم مرحلہ واقعات اور مشاہدات کی پیشکش کا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زبان و بیان کی بھی خیالات و واقعات سے مطابقت ہو۔ یوں سفرنامے کے مجموعی تاثر میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے الفاظ میں:

> ''(سفرنامہ نگار) لفظوں کے حوالے سے اپنے باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا انکشاف کرتا اور داخل میں وارد ہونے والے ہر تجربہ کو لفظوں کی مدد سے جانچتا اور پرکھتا ہے۔ ان تجربات کو محسوس کی سطح پر لانے کے لیے لسانیاتی پیکر ایک نئی کشفی حالت میں دوچار ہوتے ہیں۔ سفرنامے میں ایسے ایک دو نہیں کئی مقام آتے ہیں۔ کبھی یہ سفر خارج سے داخل کا سفر ہے۔۔۔ یا پھر داخل سے خارج کا سفر۔۔۔''(۱۳)

سفرنامہ نگار اپنے محسوسات، تاثرات اور تجربات بیانیہ انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے لہٰذا سفرنامہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوران سفر اپنی ظاہری اور باطنی آنکھیں کھلی رکھے، گرد و پیش کا بڑی ذہانت اور باریک بینی سے مشاہدہ کرے کیونکہ اس کی قوت مشاہدہ جس قدر عمیق

ہوگی اتنا ہی وہ منظر کی عکس بندی میں زیادہ کامیاب رہے گا۔ ایک اچھا سفرنامہ نگار قاری کو اپنے ان احساسات اور جذبات میں بھی شریک کرتا ہے جو سفر کے دوران میں مناظر کو دیکھنے کے بعد اس پر وارد ہوتے ہیں۔ ہر انسان اشیاء اور مناظر کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا اور اپنے داخلی احساس سے جانچتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے والا خارجی حقائق کے پس پردہ پوشیدہ بعض ایسی حقیقتوں تک پہنچتا اور انہیں سفرنامے میں بیان کرتا ہے جن تک ایک عام آدمی کی نظر نہیں جاتی۔ جہاں سفرنامہ نگار خارجی مظاہر و مناظر کا اظہار تخلیقی سطح پر کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کا رُخ خارج سے باطن کی طرف بھی مڑ جاتا ہے اور یوں سفرنامے میں ادبیت کا عنصر بھی بڑی خوبصورتی سے آ جاتا ہے کیونکہ پھر سفرنامہ نگار اپنے جذبے کا اظہار تخیل کے راستے لفظوں کی صورت میں کرتا ہے۔ اس طرح جب سفرنامے میں ادبیت کا عنصر آئے گا تو اس سے سفرنامہ نگار کے تخیل کی پرواز کا اندازہ بھی بخوبی ہو جائے گا۔ سفرنامہ نگار تشبیہ و استعارہ سے سفرنامے کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے سفرنامہ محض گائیڈ بک یا معلومات کا انبار نہیں لگتا۔ سفرنامے میں ادبی چاشنی کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور سفرنامہ کوئی بوجھل تحریر بن کر نہیں رہ جاتا۔

سفرنامہ نگار قاری کے سامنے تمام واقعات اور مشاہدات اس طرح پیش کرتا ہے کہ تمام مناظر قاری کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں اور قاری محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ خود سفرنامہ نگار کے ساتھ اس سفر میں شریک ہے۔ جس سفرنامے میں تخیل کی کارفرمائی نہ ہو وہ اپنی اہمیت اور افادیت سے محروم رہ جاتا ہے اور اس طرح کے سفرنامے ادب سے خارج متصور ہوتے ہیں۔ ایسے سفرنامے بہت جلد فراموش کر دیے جاتے ہیں اور ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سفرنامے میں تخیل کی گنجائش کس حد تک ہے؟ اصل میں یہ معاملہ ہے اعتدال کا ایسا بھی نہ ہو کہ سفرنامہ نگار صرف اپنے اسلوب میں ہی کھو کر رہ جائے اور قاری کو فقط تشبیہ و استعارہ تک ہی محدود رکھے اور وہ جو کچھ سفرنامے میں بیان کرے اس کا حقیقت سے دُور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سفرنامہ نگار سچائی کا دامن نہ چھوڑے اور سفرنامے کی سنجیدگی اور متانت کو مجروح نہ کرے۔ سفرنامہ محض تفریح کے لیے بھی نہیں لکھا جاتا بلکہ اس میں بہت سی معلومات دی جاتی ہیں۔ اگر سفرنامہ نگار صرف تخیل سے کام لے تو اس سے بھی حقیقت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ سفرناموں میں سچائی ضروری ہے خصوصاً واقعات اور مشاہدات کے سلسلے میں مصنف کا طرز بیان افسانوی ہو سکتا ہے اور اس میں اپنے تخیل کی آمیزش کو عروج تک پہنچا سکتا ہے لیکن حقائق کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا یا اسے محض افسانوی بنانا درست نہیں ہے کیونکہ اس سے صداقت مسخ ہوتی ہے جو کہ

سفرنامے کی بنیاد اور اس کی اصل روح کے بالکل منافی ہے۔

اگر ہم اُردو سفرنامے کے آغاز کا جائزہ لیں تو اس کے غیر منضبط اور بکھرے ہوئے نقوش جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم ایسی تحریروں کو باقاعدہ سفرنامہ نہیں کہہ سکتے تاہم ان میں سفرنامے کے خصائص ضرور پائے جاتے ہیں۔ سفرنامے کے یہ نقوش مثنویوں اور داستانوں میں اکثر ملتے ہیں دیگر تحریریں بھی ان سے خالی نہیں ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''پادری تھامس، پادری ولیم کیری اور پادری وارڈ نے جو وارد ہندوستان ہوئے تھے ایسی ڈائریاں اور خطوط لکھے ہیں جن سے عجیب و غریب سفرنامے مرتب ہو سکتے ہیں۔''(۱۴)

اس سب کے باوجود فورٹ ولیم کالج کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے اخذ و ترجمہ کے لیے ایسی داستانوں کا انتخاب کیا جن میں سفری کیفیت، انجانی زمینوں اور ان دیکھے لوگوں اور تہذیبوں کے حالات نسبتاً زیادہ ہیں اور ان کے کردار اپنا سفرنامہ بیان کرنے میں لطف و مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان درویشوں عاشقوں اور شہزادوں کے سفرناموں میں اتنی کشش ہے کہ قاری بڑے انہماک سے پڑھتا ہے اور یوں وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''میر امن کی ''باغ و بہار'' ان درویشوں کا سفرنامہ ہے جنھوں نے ملکوں ملکوں ٹھوکریں کھائیں اور پھر گردشِ زمانہ نے جنھیں ایک مقام پر جمع کر دیا تاکہ وہ اپنا دکھ بانٹنے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے اپنے حالاتِ سفر بیان کر سکیں۔ حیدر بخش حیدری کی ''آرائشِ محفل'' حاتم طائی کی سات سیاحتوں ہی کا سفرنامہ ہے۔ خلیل خان اشک کی ''داستانِ امیر حمزہ'' محیر العقول دنیاؤں کو سامنے لاتی ہے۔ اس کے بہت سے حصے تخیلی سفرنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہال چند لاہوری کی کتاب ''مذہبِ عشق'' میں ایک طویل سفر گل بکاؤلی کی تلاش کے لیے اختیار کیا گیا اور یہ کتاب اس سیاحت کی ہی دلچسپ داستان ہے۔ اس اجمال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ اُردو سفرنامے کی اولین روایت بالواسطہ طور پر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے قائم کی، اور مشرقی زبانوں کی متعدد سفری داستانوں کو اُردو میں منتقل کر کے اس صنفِ ادب کے نہ صرف ابتدائی نقوش مرتب کیے بلکہ اسے مضبوط بنیاد فراہم کی۔''(۱۵)

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے حقیقی سفر کے بجائے تخیلی سفر کو قصہ کہانی کے روپ میں

پیش کیا تھا۔ یہ داستانیں طبع زاد نہیں تھیں بلکہ دوسری زبانوں سے اخذ و ترجمہ اور ترمیم و اضافہ سے اُردو میں منتقل کی گئی تھیں۔ اس لیے انھیں باقاعدہ تخلیقی سفرناموں کے درجے پر رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ ان کے مصنفین و مترجمین سفرنامہ نہیں لکھ رہے تھے۔

اسی طرح اگر مثنویوں کا جائزہ لیں تو ان میں بھی کچھ سفرنامے کے نقوش ملتے ہیں جیسے میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ اس میں سفرنامے کے آثار نظر آتے ہیں لیکن وہ بھی تخیلی قصے ہیں۔ اس میں بھی ضمنی یا ثانوی حیثیت سے سفرنامے کے نقوش ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ شروع شروع میں سفرنامے کے آثار روزنامچوں اور خطوط کی شکل میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''خارج سے متعلق اصنافِ ادب میں سفرنامہ سرفہرست ہے، لیکن شاید سفرنامہ واحد نثری اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تا حال ممکن نہیں ہو سکا کچھ یہی سبب ہے کہ سفرنامہ کبھی روزنامچے کے رنگ میں لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں۔ اس میں مکالمے کی شمولیت بھی ممکن ہے اور اس میں خبر پہنچانے کا انداز بھی کھپ جاتا ہے۔''(۱۶)

اس دور (فورٹ ولیم کالج کا دور) میں ایک ایسی کتاب بھی تصنیف ہوئی جس میں ایک حقیقی سفر کے چشم دید حالات کو سفر کی جملہ جزئیات، مشاہدات اور نظریات کے ساتھ پیش کیا گیا۔ یہ کتاب ''تاریخ عجیب موسوم بہ سوانح احمدی'' ہے اور اسے مولانا محمد جعفر تھانیسری نے حضرت سید احمد شہید بریلوی کے حالاتِ زندگی اور مجاہدانہ کارناموں کے تذکرے کے لیے تالیف کیا تھا۔ سید احمد شہید کی زندگی ایثار، قربانی اور اسوۂ حسنہ کا نمونہ تھی۔ ان کے سوانح عجیب و غریب واقعات حالات اور عزم و عمل کے مظاہرات کا مرقع ہیں۔ سید صاحب کو زندگی کے ابتدائی دور میں اندرونِ ملک سفر کرنے کا موقع ملا اور بے حد نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد سے قبل انھوں نے کلکتہ کے راستے سفرِ حج اختیار کیا اور پھر اسی راستے سے واپس وطن تشریف لائے۔ اس کتاب میں اس سفر کے حالات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ گویا اُردو زبان میں بہت سے سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کو باقاعدہ سفرنامے کی صنف میں شامل کرنا ذرا مشکل ہے اگرچہ ان میں سفرنامے کے عناصر ضرور ملتے ہیں اس حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے ''عجائباتِ فرنگ'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے۔ اس میں اب تک کم و بیش ڈیڑھ دو

سو سفرنامے لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں وہ سفرنامے بھی شامل ہیں جو گائیڈ بکوں کے طور پر ضبطِ تحریر میں لائے گئے اور جن پر سفرنامے کا اطلاق ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ ایسے سفرنامے بھی جو دور دیس سے موصول ہونے والے خطوط سے حذف و تنقیح کے بعد مرتب کر دیے گئے، ایسے بھی جن میں ٹورسٹ گائیڈ بکوں والی معلومات بہت کم اور لکھنے والے کے تاثرات اور مشاہدات زیادہ تفصیل اور ادبی شان سے بیان ہوئے ہیں اور ایسے بھی جو ڈائریوں کی شکل میں لکھے گئے۔ نواب کریم خاں کا ''سیاحت نامہ'' بھی ڈائری ہی کی شکل میں لکھا گیا جس میں نواب موصوف کے قیامِ لندن کی تفصیلات موجود ہیں۔''(۱۷)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کا پہلا باقاعدہ سفرنامہ کون سا ہے۔ اُردو سفرناموں میں جو کچھ ابھی تک ہاتھ لگا ہے اس کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائباتِ فرنگ'' (تاریخِ یوسفی) ہی اُردو کا پہلا سفرنامہ ہے۔ مصنف ۱۳ اپریل ۱۸۳۷ء کو کلکتہ سے انگلستان روانہ ہوا اور وسط اپریل ۱۸۳۸ء میں بمبئی لوٹا۔ مصنف کا قیام تقریباً ایک برس بیرونِ ملک رہا۔

اس سفرنامے کو آج تک انگلستان کا سفرنامہ کہا جاتا رہا ہے درحقیقت یہ انگلستان کا ہی نہیں ہندوستان کا بھی سفرنامہ ہے کیونکہ اس سے ہندوستان سے متعلق بھی خاص معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ انگلستان و فرانس خصوصاً لندن و پیرس سے متعلق قاری کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ تماشہ گھروں، عجائب گھروں، گرجا گھروں چند تاریخی عمارات، شراب و کباب کی زیادتی اور زنانِ بازاری کی فراوانی سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان کے سفر و سیاحت کے حالات سے ۱۸۳۸ء کے ہندوستان کی زبوں حالی کا بھی اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ اس سفرنامے کا اندازِ بیان دلچسپ ہے اور جگہ جگہ عبارت کے مقفیٰ و مسجع ہونے سے تحریر میں ایسا لطف پیدا ہو گیا ہے جس سے قاری محظوظ ہوتا ہے مگر اس میں وہ خوبیاں نہیں جو اسے اولین کے ساتھ اعلیٰ بنا دیتیں۔ اس سفرنامے میں مصنف نے اپنے بارے میں معلومات نہیں دی ہیں۔ اس میں مصنف کے بارے میں شخصی کوائف نہ ہونے کے برابر ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مضمون ''اُردو کا پہلا سفرنامہ عجائباتِ فرنگ'' میں لکھتے ہیں:

''جس طرح ''باغ و بہار'' اُردو نثر کے اسلوب میں تازہ کاری کی اولین مثال ہے مگر میر امن کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملتیں اسی طرح (اب تک کی معلومات کی روشنی میں) ''عجائباتِ فرنگ'' اُردو کا پہلا سفرنامہ قرار پاتا ہے مگر اس ''سیاحِ جہان'' کے بارے میں شخصی کوائف تقریباً ناپید ہیں۔ جس طرح ''باغ و بہار'' میں

میر امن نے اپنے بارے میں جو تھوڑا بہت لکھا وہی اب اس کے حالات کا ماخذ قرار پایا۔ اس طرح یوسف خاں کمبل پوش نے اپنے بارے میں سفرنامہ میں جو کچھ لکھا وہی اس کے بارے میں شخصی معلومات مہیا کرتا ہے۔ تاہم مرتب ڈاکٹر تحسین فراقی نے مقدمہ اور محمد اکرام چغتائی نے دیباچہ میں تحقیقی کاوش سے مزید کوائف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔''(۱۸)

اُردو کا دوسرا اقدیم سفرنامہ سید فدا حسین کا ''سفرنامہ کابل'' (تاریخِ افغانستان) ہے جو تا حال شائع نہیں ہوا۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے:

''یہ سفرنامہ داستانوی رنگ لیے ہوئے ہے اور روزنامچے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ طرزِ تحریر میں ''تاریخِ یوسفی'' کے مقابلے میں ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔''(۱۹)

اُردو کا تیسرا اقدیم ترین سفرنامہ مولوی مسیح الدین علوی خان کا ''تاریخِ انگلستان'' ہے۔ مولوی صاحب نے یہ سفر واجد علی شاہ اختر کی سیاسی حیثیت کو استحکام دلوانے کی غرض سے کیا۔ مولوی صاحب سابق میر منشی گورنر جنرل تھے جو ۱۸۵۶ء میں اودھ کے معزول نواب واجد علی شاہ اختر کی والدہ ان کے بھائی اور بیٹے کے ہمراہ بطور سفیر برطانیہ گئے اور سات برس تک وہیں مقیم رہے۔ ہندوستان واپسی پر ان کا یہ سفرنامہ ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوا۔ واضح رہے کہ ہمارے محققین نے مولوی صاحب کے سفرنامہ ''تاریخِ انگلستان'' کو ''سفیرِ اودھ'' کے نام سے یاد کیا ہے حالانکہ ''سفیرِ اودھ'' ان کی خود نوشت ہے جو النّاظر پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔

''مسافرانِ لندن'' سرسید احمد خاں کا سفرنامہ لندن ہے۔ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو ہندوستان سے لندن روانہ ہوئے اور ڈیڑھ برس بعد ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان پہنچے۔ سرسید نے اپنے سفرنامے میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے، جو اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لیے دلچسپی کا باعث تھی۔ یہ سفرنامہ ان کی اپنی مرتب کردہ کتابوں میں سے نہیں۔ یوں بھی یہ سفرنامہ نامکمل رہ گیا ہے، اسے پہلی بار مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

اگرچہ سرسید احمد خاں نے نہ تو باقاعدہ سفرنامہ لکھا ہے اور نہ ہی ان کا مقصد سفرنامہ لکھنا تھا بلکہ موصوف اپنے مشاہدات و تاثرات وغیرہ کو مضامین اور خطوط کی صورت میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہے لیکن یہ مضامین اور خطوط ایسے ہیں جن کو ایک مکمل سفرنامہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان مضامین اور خطوط میں سرسید احمد خاں کی وطن سے روانگی سے لے کر واپسی تک کے تمام حالات و واقعات کا ذکر تفصیلاً موجود ہے۔ میدانی اور سمندری سفر، سمندری جانوروں، سفر میں ہندوستانیوں اور انگریزوں سے

ملاقات، انگلستان میں مختلف مقامات کے متعلق جہاں گئے، جن جن لوگوں سے ملے، اُن کی ترقی وغیرہ کی داستان، انگلستان اور ہندوستان کی حالت وغیرہ کا موازنہ اپنی مصروفیات غرضیکہ تمام حالات کا ذکر تفصیل سے اس سفرنامے میں موجود ہے۔ مختصر یہ کہ معلوماتی اعتبار سے "مسافرانِ لندن" ایک قیمتی دستاویز ہے۔ جہاں تک اس کے اسلوب کا تعلق ہے اس اعتبار سے بھی یہ کتاب دلچسپی کی حامل ہے کیونکہ سرسید احمد خاں کا عام اسلوب مدلل اور علمی تھا لیکن "مسافرانِ لندن" کا اسلوب ان کی عام نثر کے اسلوب سے مختلف ہے۔ اس سفرنامہ میں ایک افسانے کی رنگینی اور دلچسپی بھی موجود ہے یہ طرز بھی شاید اسٹیل اور ایڈیسن سے حاصل کی ہے۔ سرسید احمد خاں کے "مسافرانِ لندن" کے بعد اُردو کا ایک لاجواب سفرنامہ اودھ اخبار لکھنو کے توسط سے سامنے آیا اس سفرنامے کی نشاندہی ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے کی ہے۔ جس کے مصنف اُردو، عربی اور فارسی کے جید عالم ایڈورڈ ہنری پامر تھے۔

ایڈورڈ ہنری پامر السنہ شرقیہ سے دلچسپی رکھنے والی نمایاں ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ان کی پیدائش لندن میں ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں پامر کیمبرج سینٹ جانس کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۶۷ء میں اپنی اردو اور فارسی کی قابلیت کی وجہ سے اس کالج کے فیلو منتخب ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں حکومت برطانیہ نے خصوصی اسکالرشپ دے کر "سنائی" بھیج دیا جہاں ان کی عربی قابلیت میں اضافہ ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں اپنے کالج واپس گئے اور عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اسی زمانہ میں انگریزی فارسی لغت اور کئی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۸۱ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ حکومت کی طرف سے انہیں مصر بھیجا گیا جہاں سے واپسی پر عرب کے ایک ریگستانی علاقہ میں پامر اپنے متعدد ساتھیوں کے ساتھ قزاقوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

"سفرنامہ پامر" ایڈورڈ ہنری پامر کا ایک نایاب اُردو سفرنامہ ہے جو اودھ اخبار لکھنو میں قسط وار شائع ہوا۔ پامر بھی فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کی طرح کبھی ہندوستان نہیں آئے لیکن ان کی عربی و فارسی کے علاوہ اُردو دانی کا اعتراف باوقار اہلِ قلم نے کیا ہے۔

محمد حسین آزاد نے دو سفرنامے یادگار چھوڑے۔ "وسط ایشیاء کی سیر" اور "سیرِ ایران"۔ آخر الذکر محمد حسین آزاد کے سفرِ ایران سے متعلق ہے۔ افسوس کہ محمد حسین آزاد کو زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے سفرنامہ ایران کو خود مرتب کرتے۔ ان کی وفات کے بعد آغا محمد طاہر نے یہ جزو جزو اوراق تلاش کیے اور انہیں نامکمل حالت میں ہی شائع کروادیا تاکہ آزاد کے سفر کی یادگار باقی رہ جائے۔ دراصل آزاد نے کوئی سفرنامہ نہیں تحریر کیا بلکہ وہ روزنامچہ لکھتے تھے روزنامچے کی کڑیوں کے ربط سے سفرنامے کی تفصیلات اکٹھی کی گئی ہیں۔ اس سفرنامے کی زبان سادہ ہے کیونکہ آزاد نے جو بات سنی

یا جو کچھ دیکھا وہیں پر آسان اور سادہ زبان میں رقم کر دیا۔ اس روزنامچے میں فارسی اور اُردو کا امتزاج نظر آتا ہے۔ فنی اعتبار سے "سیرِ ایران" کم تر درجے کا سفرنامہ ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آزاد سفرنامہ نہیں لکھ رہے تھے۔ اس لیے اس میں تکنیکی کمزوریاں در آئی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلوب کے اعتبار سے اس سفرنامہ کو دیکھیں تو اس میں آزاد کا وہ رنگ انشاپردازی بھی نظر نہیں آتا۔ جس کے لیے انہیں ایک منفرد مقام حاصل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود "سیرِ ایران" اردو کا ایک اہم ادبی سفرنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ "سفرنامہ روم و مصر و شام" پہلی بار ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس خالصتاً علمی نوعیت کے سفرنامے کا آغاز ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے قسطنطنیہ کے سفر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سفر کے دوران میں عرب دنیا کے کتب خانوں اور درس گاہوں کی سیر کے ساتھ ساتھ علماء سے ملاقاتوں کے سلسلے قابلِ مطالعہ ہیں۔ خصوصاً شیخ عبدالفتاح اور شیخ علی ظبیان جیسی اہم شخصیتوں سے ان کی ملاقاتوں کی روداد دل پذیر ہے شبلی کو ترکی تہذیب سے بڑا لگاؤ تھا اور اسی لگاؤ اور جذبے نے ان کو علمی اور تحقیقی مطالعے کے لیے بلادِ اسلامیہ کے سفر پر ابھارا اور ۱۸۹۲ء کے وسط میں آپ اس سفر پر روانہ ہوئے اور اسی سال کے نومبر میں واپس آئے۔ آپ نے قسطنطنیہ، قاہرہ، بیروت اور بیت المقدس کی سیر کی۔ مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" بظاہر ایک خود نوشت سوانح ہے لیکن اس میں سفرنامے کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اس کتاب میں جعفر تھانیسری نے صرف ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو انہیں سفر کے دوران میں پیش آئے۔ جعفر تھانیسری کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایک اچھے سفرنامہ نگار کی طرح مشاہدے کی مربوط سطح کو قائم رکھا ہے اور سفر کی کڑیوں کو یوں ملایا ہے کہ سوانح پر سفرنامے کا تاثر غالب آگیا ہے۔ اس طرح اس سوانح میں سفرنامے کے کچھ فنی عناصر بھی آتے ہیں۔ ۲۰ ویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل میں یوں تو نواب سلطان جہاں بیگم (شاہ بانو) کا "سیاحت سلطانی" (۱۹۱۱ء) نواب لیاقت جنگ کا "سفرِ یورپ و امریکہ" اور "سیاحت نامہ" خواجہ احمد عباس کا "مسافر کی ڈائری" (۱۹۳۸ء) بریگیڈیئر گلزار احمد کا "تذکرہ انگلستان" اور "تذکرہ افریقہ" مولانا عبیداللہ سندھی کا "کابل میں سات سال" رفیعہ سلطانہ کا "سیرِ یورپ" عبدالغفار خاں کا "ایک نادر سفرنامہ" مرتبہ (معین الدین عقیل) شیخ ابن الکریم کا "جلوہ فرنگ" مولوی عبدالحمید فرخی کا "سفرِ یورپ" صغریٰ بیگم کا "سفرِ یورپ" سر راس مسعود کا "جاپان کا تعلیمی نظم و نسق" خواجہ بدر الاسلام کا "سفرنامہ جاپان" خواجہ حسن نظامی کا "روزنامچہ ۱۹۰۷ء" علامہ راشد الخیری کا "سیاحت ہند" مفتی محمد شفیع کا "نقوش و تاثرات" ملا واحدی کا "دلی کا پھیرا" لالہ جنید رام کا "سفرنامہ لالہ جنید رام" شورش کاشمیری کا "یورپ میں چار ہفتے"

منظر عام پر آئے لیکن سفرنامہ لکھنے والوں کی اس نئی کھیپ میں خصوصیت کے ساتھ اپنے شخصی حوالوں، طرزِ تحریر کی ندرت اور مقاصد سفر کی بوقلمونیوں کے سبب مہاراجہ کشن پرشاد، سرشیخ عبدالقادر خواجہ غلام الثقلین پانی پتی، منشی محبوب عالم، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، سید ابوظفر ندوی، قاضی ولی محمد دبیر، محمد علی قصوری، سید سلیمان ندوی، نشاط النساء بیگم اور قاضی عبدالغفار کے نام بہت اہم ہیں۔

سرکشن پرشاد وزیر اعظم دکن کا سفرنامہ بعنوان ''سفرنامہ'' ۱۹۱۴ء میں منظر عام پر آیا۔ علاقہ دکن سے متعلق یہ سفرنامہ اہم ترین ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ سرکشن پرشاد صاحب مطالعہ شخصیت تھے۔ اس دور کی سیاست، معاشرت اور فطرت انسانی سے متعلق ان کے تجزیے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔

سرشیخ عبدالقادر نے دو سفرنامے یادگار چھوڑے۔ ان کا پہلا سفرنامہ ''مقام خلافت'' ترکی کی سیاحت (۱۹۰۲) سے متعلق ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا اور اس دور کے مسلم ذہن کا عکاس ہے۔

منشی محبوب عالم نے اپنے سفرنامہ ''عجائبات یورپ'' میں صحافیانہ طریق کو اپنایا اور مشرقی ہم وطنوں کے لیے مغرب کی نت نئی خبریں یکجا کیں۔ ان کے سفرنامے میں جغرافیائی حوالوں کی خصوصی اہمیت ہے۔ مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کا سفرنامہ بعنوان ''سفرنامہ مصر و فلسطین و شام'' دہلی سے تیسری بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ ۱۹۱۱ء کے مصر، فلسطین، شام اور حجاز مقدس کے سفر سے متعلق ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کا سفرنامہ ''زہے روانئ عمرے کہ در سفر گزرد'' سیاحت امریکہ و یورپ سے متعلق ہے اور ڈاکٹر صاحب کا علمی انداز اس سفرنامے کی نمایاں خوبی ہے۔

سید ابوظفر ندوی کا ''سفرنامہ برما'' ۱۹۲۱ء میں محبوب المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ یہ برما سے متعلق اُردو کا اولین سفرنامہ ہے جو مغرب کی چکا چوند کے مقابلے میں مشرق کے اس حصے سے متعلق ہے جس کے راستے میں دیو قامت پہاڑ اور متعدد خلیجیں حائل تھیں۔ یہ سفرنامہ برما کی سیاسی، معاشرتی، علمی اور تجارتی زندگی کا عکاس ہے۔ قاضی ولی محمد دبیر نے اُردو سفرنامے کو تاریخی، سیاسی اور تہذیبی مطالعے کی صحافتی احوال نگاری کی دیکھی بھالی گزرگاہوں سے باہر نکالا۔ ان کے تین سفرناموں بعنوان ''مغرب اقصیٰ''، ''سفرنامہ اسپین'' اور ''سفرنامہ مصر'' میں غیر افسانوی اسلوب کی حد بندیوں میں رہتے ہوئے پہلی بار تخلیقی اسلوب نگارش کو اپنانے کا جتن کیا گیا۔

مولوی محمد علی قصوری کا سفرنامہ ''مشاہدات کابل و یاغستان'' سیاسی اغراض کا پابند تھا لیکن اس سے ہوا یہ کہ تاریخ کی چھان پھٹک کے طفیل عصری شعور کے در وا ہوئے۔ مولوی صاحب نے یہ

سفر مولانا عبیداللہ سندھی، حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے سے کیا تھا کہ کابل کی حکومت کو ہندوستان پر حملے کی ترغیب دیں اس مقصد کے تحت مولوی صاحب کئی برس تک کابل میں رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز روس کی حمایت کر کے افغانستان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

سید سلیمان ندوی کا سفرنامہ ''سیرِ افغانستان'' ۱۹۳۳ء کے اس سفر سے متعلق ہے جس میں سلیمان ندوی کے شریک سفر سر راس مسعود اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی تھے۔ کابل کے نادر خان نے ان زعما کو اپنی ملکی بالخصوص تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں اصلاح مشورے کے لیے افغانستان کی دعوت دی تھی۔

نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) نے ایک حج نامہ ''سفرنامہ حجاز'' کے علاوہ ایک سفرنامہ بعنوان ''سفرنامہ عراق'' یادگار چھوڑا ہے۔ یہ سفر مولانا حسرت موہانی کے ہمراہ ۱۹۳۵ء میں کیا گیا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ محض سیاسی معاملات اور صحافتی و ادبی مسائل میں ہی حسرت موہانی کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھیں بلکہ سفر و حضر میں بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کا ''سفرنامہ عراق'' مولانا حسرت موہانی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس سفرنامے کی نمایاں خوبی نسوانی نقطۂ نظر سے جزئیات نگاری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ بیگم حسرت موہانی نے اپنے عورت ہونے کا احساس دلایا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے۔

قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ ''نقشِ فرنگ'' اس زمانے کی یادگار ہے۔ جب قاضی صاحب تحریک خلافت کے چند زعماء کے ہمراہ ترکی میں خلافت کے احیاء کے مشن پر لندن گئے تھے۔ قاضی صاحب کا یہ سفرنامہ پڑھ کر ۱۹۲۰ء کا وہ زمانہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے جب احیائے خلافت کے مسئلہ پر دو ٹوک گفتگو کے لیے یہ وفد برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملنے لندن گیا۔

سر رضا علی کو ایک قانون دان کی حیثیت میں کئی بار سوویت یونین اور یورپ کی سیاحت کا موقع ملا لیکن انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند نہیں کیا۔ سر رضا علی کی خود نوشت بعنوان ''اعمال نامہ'' نومبر ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۵ء کے سفر سے متعلق ہے۔ پہلی بار وہ مسٹر پیڈیسن کی سربراہی میں ڈیپوٹیشن ممبر کی حیثیت میں جنوبی افریقہ میں بس جانے والے ہندوستانیوں کے حالات سے متعلق تحقیقات کی خاطر جنوبی افریقہ گئے۔ یہ وفد لارڈ ہارڈنگ نے ترتیب دیا تھا جس میں سر رضا علی کی حیثیت ایک ہندوستانی قانون دان کی تھی۔ اس وفد کے دیگر اراکین سر دیو اپرشاد اور گرجا شنکر باجپائی وغیرہ تھے۔ سر رضا علی دوسری بار ۱۹۳۵ء میں بطور ایجنٹ جنرل (ہائی کمشنر) جنوبی افریقہ گئے اور تین برس تک وہاں رہے۔[20]

اب ہم یہ جائزہ لیں گے کہ قیام پاکستان سے پہلے جو سفرنامے لکھے گئے ان میں جنس نگاری کے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے جو سفرنامے لکھے گئے ان میں جغرافیائی معلومات زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس دور میں ایک تو سفر کرنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے اور دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص سفر کرتا اور سفرنامہ لکھتا بھی تھا تو لوگ اس سے یہی تقاضا کرتے تھے کہ وہ اس سفرنامے میں ان کو بھی اس ملک کی سیر کروائے جس کا اس نے سفر اختیار کیا تھا چنانچہ ان سفرناموں میں جنس اور جنس نگاری کی فراوانی نہیں ہے البتہ جزوی طور پر جنس نگاری کے عناصر در آئے ہیں۔

اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ سفرنامہ ''عجائباتِ فرنگ'' ہے جس کو یوسف خان کمبل پوش نے تحریر کیا۔ وہ کسی کاروباری غرض سے لندن روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے اندر فطری سیاح موجود تھا جو اسے متحرک رکھے ہوئے تھا گویا وہ اپنے ذوقِ سیاحت کو تسکین دینے کے لیے لندن روانہ ہوا۔ اس نے لندن کے خوبصورت مقامات کی سیر کی اور وہاں کے رہن سہن، کھیل تماشوں اور وہاں کے لوگوں کے علم کے ساتھ لگاؤ، وہاں کی تاریخی عمارات اور تہذیب و تمدن کی خوبصورت عکاسی کی۔

کمبل پوش کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھتا ہے اس طرح یہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ اس سفرنامے کا اسلوب بیان بھی بہت پُرکشش ہے جو قاری کو کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ وہ جس منظر اور مقام کا بھی نقشہ کھینچتا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کمپیوٹر کے موجودہ دور میں ہمارے لیے اتنے اجنبی نہیں رہے لیکن آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے مغربی معاشرت اجنبی تھی۔ اس اجنبیت کو ختم کرنے میں کمبل پوش نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔

کمبل پوش کو بار بار ہندوستان کے لوگوں کی تن آسانی، کاہلی، منافقت اور اس کے رئیسوں نوابوں اور دولت مندوں کی عیش پرستی لہو کے آنسو رونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس نے ان کی بیٹر بازی اور مرغ بازی کی مذمت کی ہے اور ان کے گرد جمع ہونے والے خوشامدیوں پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ کمبل پوش کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دورانِ سیاحت دیکھا اس کو بالکل ویسے ہی بیان کر دیا۔ اس لیے اس سفرنامے میں مبالغہ آرائی بھی کم ہی محسوس ہوتی ہے۔ کمبل پوش کا اسلوب پیچیدہ نہیں بلکہ سیدھا اور بیانیہ ہے۔ جہاں وہ نسوانی حُسن کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کے قلم میں تیزی آ جاتی ہے۔ جہاں وہ غیر ملکی عورتوں کے حُسن کا ذکر کرتا ہے وہاں وہ اپنی خواہشات پر بھی پردہ نہیں ڈالتا بلکہ اپنے تاثرات کو بھی کھل کر بیان کرتا ہے۔ اس نے متعدد جگہ پر ذکر کیا ہے کہ وہ غیر ملکی خواتین کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ ہونے کی خواہش نہیں کرتا۔ اس نے حقیقت کو صحیح انداز سے

بیان کیا ہے اس کے ہاں منافقانہ رویہ نہیں ملتا بلکہ اس کا طرزِ اظہار برملا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ایک مقام پر کچھ یوں رقمطراز ہے:

''سارے کپڑے تر ہوئے مگر گرتے پڑتے گھر چلے۔ راہ میں دو رنڈیاں ایک خوبصورت دوسری کریہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اوس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی، تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آتیں۔ اکبار پانو پھسلا، دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زنِ جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اوٹھایا۔ بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا۔ وہ بڑی محنت سے اوٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی مگر اوس زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی۔ آخر اوس نے ایک دھکا دیا مجھ کو زمین پر گرایا۔ دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اوٹھایا تھا۔ میری طرف ہو کر اوس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچائی غنیمت سمجھا۔ وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے پیچھے میرے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہونچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمرا ہی ہنسنے لگے۔ میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔'' (۲۱)

یوسف خاں کمبل پوش نے صداقت کو مسخ نہیں کیا بلکہ حقیقی انداز میں اپنے مشاہدات اور تاثرات کو بیان کر دیا ہے۔ اس کی بے تکلفی نے اس سفرنامے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ایک جگہ وہ دریا کے کنارے کا نقشہ کچھ یوں بیان کرتا ہے:

''تیسرے دن شہر کی سیر کو گیا جو کچھ دیکھا دل ہی جانتا ہے زبان پر نہیں آتا۔ کنارے دریا کے جا کر دیکھا، سیکڑوں جہاز وہاں تھے اور ہزاروں ناؤ رواں۔ جہاز دھویں (دھوئیں) کے ادھر اُدھر آتے جاتے۔ اوس پر سے صاحبانِ انگریز اپنی محبوبوں (بیبیوں) کے ساتھ دریا کا تماشا دیکھتے۔ کیا ہی عورتیں تھیں حسن و جمال میں پریوں کو شرماتیں۔ ایک اندھیرے تہ خانے کی سیر کی۔ صاحب خانہ نے راہ بتائی۔ دو آدمیوں نے ہاتھ میں مشعل لی۔ اوس میں پیپے شراب کے رکھے تھے۔ اگر شاید کھلتے شراب کے دریا بہتے، جہاز اون میں چلتے۔ اون پیپوں پر ایسا روغن ملا تھا کہ ہرگز اون میں آگ کا اثر نہ ہوتا۔ شراب یہ خواص رکھتی ہے کہ ایک چنگاری سے رال کی طرح بھڑکتی ہے۔ یہ اون لوگوں کی کاریگری تھی کہ آگ اوس میں اثر نہ کرتی۔ دو گھنٹے اوس میں روشنی مشعل سے پھرے تو بھی اس سرے سے اوس سرے تک نہ پہنچے۔ نہ معلوم تہ خانہ کتنا بڑا تھا کہ میں اتنے عرصہ میں کنارے نہ پہونچا۔ لاچار ہو کر باہر آیا۔ دوسری طرف جا کر دیکھا تو بہتا کو

(تمباکو) کا ڈھیر تھا۔ بخدا اس قدر ڈھیر نہ کبھی آنکھوں سے دیکھا نہ کانوں سے سنا جو تمباکو بابت چوری محصول کے چھین آتی تھی۔ ڈھیر کے ڈھیر جل رہے تھے۔ اگر اتنی تمباکو ہندوستان میں جلائی جاوے ہندوستانیوں کے دماغ سے ریش نادانی کی ہو جائے۔"(۲۲)

یوسف خان کمبل پوش جہاں نسوانی حسن کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کے اردگرد کے مناظر کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح اُس کا انداز افسانوی بھی نظر آتا ہے۔ اس افسانوی انداز میں وہ جزئیات نگاری بہت کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ جزئیات نگاری دیکھ کر غلام عباس کے افسانوں کی جزئیات نگاری ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے۔ کمبل پوش نے تشبیہ واستعارہ سے بھی بہت کام لیا ہے اور نثر کو مزید خوبصورت بنادیا ہے۔ اس طرح اُس کے ہاں شوخ نگاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور جزئیات نگاری کی بھی۔ ایک اور اقتباس دیکھیے جہاں وہ ایک خاتون کی خوبصورتی کا ذکر کرتا ہے اس میں بھی کمبل پوش کی جزئیات نگاری کی داد دینا پڑتی ہے:

"راہ میں ایک عورت نوجوان مرہٹن پری زاد زعفرانی اطلس کے کپڑے پہنے ہوئے ملی۔ نیزہ ہاتھ میں لیے ایک کمیت گھوڑے پر سوار جاتی تھی۔ شعر

جمالش چو در نیم روز آفتاب

کرشمہ کناں نرگس نیم خواب

عجب حسن و جمال درخشاں رکھتی کہ دیدۂ خورشید نے اوس کی طرف ٹکٹکی باندھی۔ چہرہ اوس کا درمیان بالون عنبرین کے یوں چمکتا جیسے سورج کالی گھٹا سے نکلا۔ زیور خورشید طلائی بالوں میں گندھا۔ عجب کیفیت دکھاتا انداز اوس کا معشوقانہ تھا۔ دل دیکھتے ہی لوٹ جاتا۔ جدھر آنکھ اوٹھا کر دیکھتی فتنہ بپا کرتی۔ فقیر جونہی چار چشم ہوا، آئینہ ساں حیران ہو کر دیکھتا رہا۔ جب قریب آپہونچی۔ میں نے بے اختیار شوق سے یہ بات کہی: اگر اجازت پاؤں کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ نگاہ تیز سے میری طرف دیکھا اور اشارے سے حکم کیا۔ میں نے کہا اوس مصور بیچوں پر صد آفرین کہ تیری یہ تصویر کھینچی نازنین۔ اس کلام سے وہ معشوقہ ہنس کر کہنے لگی۔ اے فقیر صاحب کمال سچ بتا کہ عمل مرہٹوں کا ہندوستان میں کب ہوگا اور کتنے دنوں میں انگریز پر زوال آوے گا۔ میں نے کہا اے جان جب میرا نکاح تیرے ساتھ ہووے گا، عمل انگریزوں کا ہندوستان میں نہ رہے گا۔ اوس نے کہا فقیر کو نہ چاہیے ایسی خوش طبعی اور استہزا۔ میں نے کہا تمہاری خاطر نازک میں رنج نہ آوے۔ سابق میں رہتا تھا نیچ صحبت پریوں کے۔ ہر وقت اون

نے جمال کا تماشائی اور ہم کلام تھا۔ شامت اعمال سے وہاں سے نکلا۔ پھر وہاں جانے کی آرزو رکھتا ہوں۔ خدا سے استمداد چاہتا ہوں یعنی انگلستان میں تھا، وہاں کی رنڈیوں پری وشوں کا جمال دیکھتا۔ اس وقت جو تجھ کو دیکھا دل میں ولولہ آیا۔ اس سبب سے حرف شوق بے اختیار زبان سے نکلا۔ بعد اس گفتگو کے اوس معشوقۂ رعنا نے ہوا کی طرح گھوڑ اتیز کیا اور یوسف حلیم کمبل پوش آہ وفغاں کرتا ہوا اورنگ آباد کی طرف چلا۔"(۲۳)

"عجائبات فرنگ" کو پڑھتے ہوئے یورپ اور افریقہ کے ساحلی علاقوں اور پرتگال اور مصر کی تہذیب وتمدن کے علاوہ زوال آمادہ ہندوستان کے حالات کا بھی پتا چلتا ہے۔ انگریزوں کی روز افزوں قوت۔ ہندوستان کے لوگوں کی بے حسی اور عیش پرستی کی بھی افسوسناک تصویر سامنے آتی ہے۔ اس سفرنامے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بیس سال پہلے مقامی قوموں میں پیدا ہونے والی نفرت اور انگریز کے اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کا عزم بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا واقعہ اس کا مظہر ہے۔ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے کمبل پوش کے قلم میں شوخی بھی در آئی ہے۔ بہر حال ایسا اسلوب قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ کمبل پوش کے اس سفرنامے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ جس طرح اُس نے دیکھا ہے اس کو بالکل ویسے ہی بیان کر دیا ہے۔ اس نے نہ اپنے آپ کو کہیں پارسا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ اپنی ذات کی زیادہ نمائش کی ہے۔ اس نے جہاں بھی جنس کا تذکرہ کیا ہے اس میں اس معاشرے کی تہذیب وتمدن کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس سے اُس معاشرے اور ہمارے معاشرے میں جو نمایاں فرق ہے وہ بھی واضح ہوتا ہے۔ جیسے ایک جگہ مصنف نے ناچ گھر کا نقشہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

"پچھلے دن میں بوچز صاحب کے ساتھ کھانا کھاتا۔ ایک بوڑھا (بڈھا) بہرا اسرا میں اوترا (اترا) تھا۔ شام پین لچا کر دوست ہوا۔ مجھ سے اور ولیم بوچز صاحب سے کہنے لگا۔ آؤ ہم تم مل کر ناچ گھر چلیں۔ وہاں کا سیر وتماشا دیکھیں۔ اوس مکان کو اون کی زبان میں اپرہ کہتے ہیں۔ ہم اون کے کہنے پر راضی ہو کر ناچ گھر چلے۔ وہاں جا کر سب مصروف تماشا ہوئے۔ دو رنڈیاں کہ ناچنے گانے میں یکتائے زمان تھیں، رقص وسماع میں مشغول ہوئیں۔ ایسے کرتب دکھائے کہ سب سرور میں آئے مگر مجھ کو ایک امر اون کا پسند نہ آیا۔ وہ یہ کہ اونہوں نے ناچتے وقت ایسا کپڑا مہین پہنا کر تمام بدن خصوص جسم نہانی اون کا صاف نظر آتا۔ ناچتے ناچتے جب پانوں اُٹھاتیں گویا لوگوں کو شرم گاہ اپنی دکھاتیں۔ مرد رنڈی سب تماشا دیکھتے۔ اس امر نامناسب کو خلاف حیا نہ

سمجھتے۔ یہ ماجرا خلافِ عقل نظر آیا۔ میں نے اکثر انگریزوں کا حال سنا کہ ہندوستان کی کسبیوں سے سبب پہنے تنگ پوشاک اور کپڑے باریک چست کے نفرت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اون کا راگ گانا نہیں سنتے ہیں۔ پر وہاں کوئی مانع نہوا کہ اون کو اس حرکت بیجا سے باز رکھتا۔ قصہ مختصر وہ بوڑھا ساتھی ہمارا دیکھنے ہجروں ناچ اور مقام مخصوص اون کے سے اور پینے شراب سے ایسا بے حال و بے خود ہوا کہ شور و غل مچاتا۔ اوس محفل میں حکم بادشاہی سوائے ناچنے گانے والوں کے کسی کے بولنے کا نہ تھا۔ جب وہ بوڑھا چلانے لگا دو تین آدمیوں عزت دار قوم نے منع کیا۔ وہ بہرا اون ناچنے والیوں کے دریائے عشق میں ایسا ڈوبا تھا کہ ہرگز شنوا نہوا۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ نہیں سنتا ہے اور رنگ مجلس بدلتا ہے بلکہ اپنے نکالے جانے کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اشارے کنایے سے سمجھایا۔ شور و غل سے اوس کو باز رکھا اور اپنے دل میں عہد کیا کہ اس کے ساتھ اب کہیں نہ جاویں گے ہمراہی اس کے سے آپ کو بچاویں گے۔ رات بھر ناچ کے تماشے میں رہے صبح اپنے مقام پر آئے۔"(۴۴)

کمبل پوش کے ہاں جنس نگاری کے حوالے سے عموماً تہذیبی نمونے زیادہ ملتے ہیں۔ اُس نے بیشتر جگہوں پر افسانوی رنگ کو بھی اپنایا ہے لیکن اس افسانوی انداز میں بھی زیادہ مبالغہ نظر نہیں آتا۔ وہ جو کچھ بھی جس مقام پر دیکھتا ہے فوراً اپنے تاثرات بھی وہیں پر قلمبند کر دیتا ہے۔ اُس نے اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے بعض دلچسپ اور حیرت انگیز پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ کمبل پوش کو تاریخ و توہمات ہند سے بھی خاصی واقفیت ہے۔ ایک مقام پر اُس نے ایک فقیر فربہ لحیم و جسیم ہندو کا ذکر کیا ہے۔ جو سر سے پاؤں تک ننگا بیٹھا ہے اور ہندو عورتیں اس کے عضوِ تناسل کو پُوج رہی ہیں۔ یہ امر کمبل پوش کو اچھا نہیں لگا۔ اس کا اس نے ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ کہیں کہیں مزاح کا سہارا بھی لیتا ہے اور سفرنامے کو بوریت سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً یہ منظر دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ میں سپہ گری چھوڑوں اور اس فقیر کی جگہ پر بیٹھ جاؤں اور نوکری کی اذیت سے نجات پاؤں کیوں کہ یہ مزہ نوکری میں کہاں ہے۔ یہاں مزاح بھی ہے اور جنس کو ہندو مذہب کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کس قسم کے تصورات ہیں جن کو ہم نے نہ صرف بیہودہ سمجھتے ہیں بلکہ ان سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ کمبل پوش نے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

"قصہ مختصر بندہ ایک دن سیر و تماشے کے لیے وہاں بازار اور دریا کی سیر کو گیا۔ ایک جگہ ایک فقیر فربہ لحیم و جسیم ہندو مذہب بیٹھا تھا۔ سر سے پاؤں تک ننگا۔

عورتیں ہندوؤں اور مہاجنوں کی اوس کے عضوِ تناسل کو پوج رہی تھیں۔ اپنے نزدیک گویا عبادت کرتی تھیں۔ کوئی بہت ذوق شوق سے اوس کو ہاتھ میں لے کر چومتی کوئی چاول اور پھول اوس پر چھڑکتی۔ وہ فقیر ننگا عجب صاحب نصیب تھا کہ اندر کے اکھاڑے میں بے پروائی سے بیٹھا نظارۂ جمال پریزادوں کا کرتا۔ ایک نے ان پریوں میں سے گاڑہ (گاڑھا) دودھ میں قند کا چورہ ملایا بہت خوشامد و لجاجت سے اوس بے حیا کو پلایا۔ مجکو یہ ماجرا دیکھ کر بے اختیار غصہ آیا۔ یہی جی چاہا کہ اوس مرد بے شرم کو ایک لاٹھی ماروں اور رنڈیوں کو اوس کے پاس سے ہٹادوں۔ پھر جو غور کیا یہ امر مناسب نہ سمجھا۔ ناچار صبر کیا۔ اس واسطے کہ وہ رنڈیاں بہت حسن اعتقاد سے لنگ پوجتی تھیں۔ صورت تہدید میں اوس نابکار کو رنج ہوتا اور وہ بھی آزردہ ہوتیں۔ مزاحمت کرنا مناسب نہ دیکھا بلکہ دل میں خیال آیا۔ میں بھی سپہ گری اور دو اوش ملکوں کی چھوڑوں، ننگا ہو کر اپنے تئیں مہاپرش بناؤں اور ان رنڈیوں حسینوں سے اپنے لنگ پجواؤں، زندگی کا مزہ اور لطف پاؤں۔ نوکری میں اذیت ہے پر اس فقیری میں عجب کیفیت ہے۔ پریاں اطاعت میں حاضر رہتی ہیں۔ دودہ (دودھ) اور موہن بھوگ لا کر کھلاتی ہیں۔ بھلا یہ مزہ نوکری میں کہاں۔ اس سے اوس سے تفاوت زمین و آسمان۔ ہندو عجب بے تمیز ہوتے ہیں کہ اپنی جوروؤں کو برہنہ مکار فقیروں پاس بھیج کر لنگ پجواتے ہیں۔ چاہیے تھا اون کو اس امر بے جا سے روکنا ہو برعکس بخوشی اجازت دیتے ہیں ننگے آدمی سے مرد آنکھ بچا جاتے ہیں حیف ہے کہ اوس کے پاس رنڈیاں جا کر لنگ پوجیں۔ یہ کیا حرکت لچر ہے اور کیسی رسم ابتر ہے۔"(۴۵)

کمبل پوش شاعر بھی تھا اور اُس کے اشعار لکھنوی دبستان کے مزاج کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس طرح "عجائبات فرنگ" میں بھی بعض مقامات پر اُس کی نثر پر شاعری کا گماں ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو قافیہ پیمائی کا بھی شوق ہے لیکن اس کی قافیہ پیمائی کے باوجود اُس کا اپنا مخصوص اسلوب متاثر نہیں ہوتا۔ کمبل پوش جب کسی خوبرو عورت کو دیکھتا ہے تو اس کے جذبات سوتے کی طرح پھوٹنے لگتے ہیں۔ جہاں کہیں اس کو نسوانی حسن نظر آتا ہے اس کے بیان میں وہ بعض اوقات شاعروں کی طرح اُس کی مدح سرائی میں غلو کا شکار بھی ہو جاتا ہے گویا ولی کی طرح اس کے بھی بے شمار محبوب ہیں۔ اس مدح سرائی میں وہ کہیں کہیں اشعار کا بھی استعمال کرتا ہے اور تشبیہ و استعارہ سے بھی اپنی نثر کو سجاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نسوانی حسن و جمال کے بیان میں اس کے قلم میں

زیادہ تیزی آجاتی ہے اور وہ اور بھی رواں ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دو اقتباسات درج ذیل ہیں:

''ناگاہ ایک معشوقہ چودہ برس کی دیکھی۔ ایک دوکان میں بیٹھی۔ پری صورت، حور سیرت، چاند اوس کو دیکھ کر شرمائے، سورج اوسی کے فراق میں دن بھر چکر کھائے۔ عجب حسن و جمال بے مثال کہ بیاں اوس کا امر محال۔ گورے گورے گال۔ ہونٹھ لعل لعل۔ دانتوں میں چمک، کمر میں لچک۔ شیریں ادا دلربا۔ اوبھری اوس کی چھاتیاں، دل عاشقوں کا پھسلا پھاں۔ فرد:

برس پندرہ یا کہ چودہ کا سن
جوانی کا عالم تماشے کے دن

میں اوس کے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا اور نشۂ بادۂ وصال اوس کے سے مدہوش ہوا۔''(۲۶)

''ایک مکان میں باجے والے بادشاہی نوکر عجیب و غریب باجے بجاتے سامنے اوس کے دوسرے مکان میں گیس اور چراغ اور فانوس بہت روشن تھے۔ اوس میں میز لگی ہوئی اور شیشہ کے برتن اور کھانے عمدہ چنے ہوئے۔ شرابیں طرح طرح کی شیشہ کے ظروف میں رکھیں۔ پریاں لندن کی وہ کھانے اور شراب چکھتیں۔ سب کی سب خوبصورت تھیں سوائے اوس شہر کے مقابل اون کا روئے زمین میں نہیں۔ اون میں سے ایک پری چودہ برس کی سراپا غضب تھی۔ نگاہ اوس کی آفت ڈھاتی، تعریف جمال اوس کے کی محال۔ بالوں اوس کے سے عاشقوں کی زندگی وبال۔ شعر

زلفیں یوں بکھری ہوئی چہرہ پہ ناگنیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہیٹں دو بالک (۲۷)

یوسف خاں کمبل پوش کے نزدیک سفر وسیلۂ ظفر نہیں بلکہ اکتساب لذت کا حصول ہے۔ وہ دل کو تنہا چھوڑنا پسند کرتا ہے اور عقل کی نگہبانی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ غیر ملکی عورتوں کے حُسن سے حظ اٹھاتا ہے اور کہیں بھی اپنے آپ کو منافقت کے پردے میں نہیں لپیٹتا بلکہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہ صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیتا ہے۔ اس نے جس والہانہ شوق سے ان کی سراپا نگاری کی ہے اس سے اُس کے دلی جذبات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اس نے حقیقت کو مسخ نہیں کیا بلکہ بات برملا کی ہے کمبل پوش نے صداقت کو مجروح نہیں کیا بلکہ مشاہدات کو حقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ سفرنامے میں کہیں کہیں شراب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کو ایک مقام پر کمبل پوش نے مزاح کے پردے میں جس طرح بیان کیا ہے اس پر بجا طور پر داد دینا پڑتی ہے:

''وہاں شراب عمدہ کھینچی جاتی ہے۔ ہر کسی کی طبیعت اوس کے دیکھنے کو للچاتی ہے۔ وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا اوس نے مجھ سے کہا تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو شراب کیوں پیتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبرؐ نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔ اس بات سے صاحب خانہ خوش ہو کر ہنسا۔ جس جگہ اپنے معشوق کے ساتھ شراب پیتا ہے گیا۔''(۲۸)

کمبل پوش نے لندن، پیرس، مصر اور ہندوستان کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کو جیسا پایا بیان کر دیا۔ اس نے انگلستان کی تہذیب کے مثبت اثرات کو بیان کیا ہے وہاں اس کے منفی پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اگرچہ کمبل پوش کی انگلستان کی تہذیب سے بے حد مرعوبیت قابلِ افسوس ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے وہاں کی معاشرت کے بعض منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''ولایت کے سب سامان اور رسمیں اچھی ہیں مگر بعضی رسمیں خلاف آئین ہیں۔ ایک اون میں سے مقدمہ خاوند جورو کا ہے۔ بنظرِ انصاف دیکھا چاہیے کہ مرد بہزار محنت و مشقت وجہ معاش حاصل کرتا ہے۔ حقوق والدین سے کہ اون سے زیادہ حق کسی کا نہیں، غافل ہوتا ہے، دل و جان سے بی بی کی خاطر داری میں مصروف رہتا ہے۔ سخت حیف ہے کہ وہ بی بی اوس سے ملتفت ہو ے، ننگ و ناموس شوہر برباد کرے ہزاروں لعنت اوس مرد ملعون پر کہ پرائی جورو سے مرتکب مباشرت ہو۔ مونھ کالا اوس عورت کا کہ غیر مرد سے مشغول لذت ہو۔ یہ رسم اوس ملک کی اپنے مزاج کے پسند نہ آئی۔ اس لیے کہ اس میں بہت فساد ہے اور بُرائی۔''(۲۹)

کمبل پوش پسماندہ ہندوستان کی غلامی کے اسباب پر بھی غور کرتا ہے۔ وہ انگریز کے ہاں زندگی کے متحرک پہلو اور ان کی تہذیب کے مثبت اثرات کا معترف نظر آتا ہے۔ خاص طور پر انگریز کی علم دوستی، مستقبل شناسی اور ان کی دور اندیشی کا نظریۂ حیات کمبل پوش کو بار بار ہندوستان کے لوگوں کی کاہلی، سستی اور تن آسانی اور اس کے رئیسوں اور دولت مندوں کی عیش پرستی کی یاد دلاتا ہے۔ وہ ان کی مرغ بازی اور بٹیر بازی کی مذمت کرتا ہے۔ بلکہ ان کے گرد جمع ہونے والے خوشامدیوں کے گروہ پر بھی لعن طعن کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستان کی غلامی کے اسباب میں یہی بے اعتدالیاں اور ایسے حاکموں کی رنگین مزاجیاں سرفہرست تھیں۔ کمبل پوش انگریز کی ہندوستان پر حکومت کا سبب ان

کی سچی لگن اور خلوص کو قرار دیتا ہے۔ کمبل پوش انگلستان کی برتری کا جگہ جگہ ذکر کرتا ہے اور اس کا موازنہ ہندوستان کی بے چارگی اور پسماندگی سے کرتا ہے۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کی منافقت، تعیش پسندی اور علم دشمنی پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"رئیس ہندوستان کے خواب خرگوش میں پڑے رہتے ہیں۔ بیٹر یا مرغ یا کبوتر یا پتنگ بازی وغیرہ میں عمر برباد کرتے ہیں کوئی تحصیل علم و ہنر کا شوق نہیں رکھتا۔ امورات کار آمدنی اور فنونِ سپاہ گری یا شکار شیر وغیرہ سے کاہلی کرتا ہے۔ صد آفرین امیران انگلستان پر کہ اون میں سے کوئی تمام دن میں ایک گھڑی اپنی برباد نہیں کرتا ہے۔ ہر کوئی اپنے کام میں شام تک مصروف رہتا ہے۔ رات کو عیش و عشرت کرتے ہیں خیال سیر ملکوں کا سر میں رکھتے ہیں۔ عورتیں ان کی بھی تضیع اوقات نہیں کرتی ہیں۔ علم و ہنر میں مشغول رہتی ہیں بخلاف ہندوستان کے کہ مرد یہاں کے امور بے جا میں صرف اوقات کرتے ہیں اور اپنی عورتوں کو ایک مکان میں قید کرکے دُنیا اور مافیہا سے غافل کردیتے ہیں۔ سوائے دیوار خانہ یا چھت آسمان کے اون کو نظر نہیں آتا ہے ہر مرد اس پردہ نشینی کو باعث عصمت بی بی سمجھتا ہے۔ درحقیقت اون کو سیکھنے علم و ہنر سے باز رکھتا ہے۔ میرے نزدیک یہ خیال بے جا ہے کہ پردہ نشینی باعث عفت کا ہے بلکہ جو عورت بالطبع عفیفہ اور صالحہ ہے اگر ہزار مردوں میں بیٹھے، عصمت اوس کی قائم رہے اور بدطینت عورت کو کوئی لاکھ پردے میں چھپائے وہ اپنی حرکات ناشائستہ سے باز نہ آئے۔ ولایت لندن میں ایک عورت حسینہ ناکدخدا غیر مردوں کے ساتھ ایک بگھی میں بیٹھ کر جس ملک میں چاہی چلی جاوے، ہرگز اوس سے کسی طرح کا فساد یا حرکت بد واقع نہ ہونے پائے۔ اس لیے کہ مرد نیک کار ہیں اور عورتیں حیادار، پس کیونکہ امر نامناسب کا خیال آوے۔ یہاں پردہ نشینی میں کیا کیا خرابیاں ہوتی ہیں۔ انجام کار ذلت اور رسوائیاں ہوتی ہیں۔ اگر یہاں کی عورتیں علم رکھتی ہوتیں اور بے پردہ باہر نکلتیں، ہرگز ایسا فساد نہ ہوتا۔ بھلا اس پردہ نشینی میں کیا فائدہ نکلا۔ حقیقت میں مرد نادانی کرتے ہیں کہ عورتوں اپنی کو ایک مکان تنگ پنجرے سے میں قید کرکے تماشائے عجائبات زمانہ سے باز رکھتے ہیں۔ کیا اندھیرا ہے کہ آپ سیر دیکھتے پھرتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں یعنی عورتوں کو اجازت نہیں دیتے ہیں کافی ہے اون کو یہ چند:

"ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگری پسند۔" (۳۰)

یہ سفرنامہ انگلستان کا ہی نہیں ہندوستان کا بھی سفرنامہ ہے۔ اس میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی تہذیب و معاشرت کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور انگریزوں کی ترقی کے راز بھی بیان کیے گئے ہیں۔ غلام ہندوستان کے بارے میں مصنف کے دل میں جو کسک اٹھتی ہے اس کا اندازہ بھی سفرنامے کے مطالعے کے دوران ہوتا ہے۔ سفرنامے میں ذاتی واقعات اور تاثرات کے سبب افسانہ وناول کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے حقیقی نمونے ملتے ہیں۔ کمبل پوش نے اپنی ذات کی نمائش کی بھی زیادہ کوشش نہیں کی بلکہ انگلستان میں جہاں اس نے ان کے کلچر کو جیسا دیکھا ویسا بیان کردیا۔ خاص طور پر ان کے تماشہ گھروں، تاریخی عمارتوں، شراب و کباب کی زیادتی اور خصوصاً زنان بازاری کی فراوانی کے متعلق خاصی معلومات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کمبل پوش کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے اس کا بھی تجزیہ اس نے قاری کے سامنے من وعن پیش کیا ہے کہیں بھی اپنے آپ کو پارسا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی زیادہ اپنی ذات کی نمائش کی ہے۔ اس لیے تہذیبی حوالے سے جنس نگاری کے حقیقی نمونے اس سفرنامے میں ملتے ہیں اگرچہ سفرنامہ نگار کا کہیں کہیں انداز افسانوی نظر آتا ہے لیکن پھر بھی وہ حقیقت سے آنکھیں نہیں چُراتا۔

اُردو کے بہت سے سفرنامے ایسے بھی ہیں جو ڈائریوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ نواب کریم خاں کا "سیاحت نامہ" بھی ڈائری ہی کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ جس میں نواب کریم خاں کے قیام لندن کی یادیں موجود ہیں۔ اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ نواب کریم خاں یوسف خاں کمبل پوش کا ہم عصر تھا۔ دونوں نے لندن کی معاشرت، وہاں کے رسوم ورواج، کھیل تماشوں اور وہاں کے لوگوں کے طرز فکر کی تصویر کشی کی ہے۔ دونوں نے تہذیب مغرب کو ایک ہی زمانے میں دیکھا۔ نواب کریم خاں نے ڈائری کی صورت میں سفرنامہ تحریر کیا جبکہ کمبل پوش نے بیانیہ انداز اختیار کیا۔ نواب کریم خاں کی عادت تھی کہ وہ روزانہ کے امور کو ڈائری میں باقاعدگی سے درج کرتا تھا۔ اس ڈائری میں لندن کی تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ وہ تہذیب مغرب سے شدید طور پر متاثر نظر آتا ہے۔ لندن کی تمدنی چکا چوند نے کمبل پوش کی طرح نواب کریم خاں کی آنکھوں کو بھی خیرہ کیا ہے۔ لندن کے حسن وجمال اور اس کے عجائبات ونوادرات کے بیان سے اس کا "سیاحت نامہ" بھی خالی نہیں۔ لندن اس کے نزدیک جنت ہے۔ "سیاحت نامہ" کی نثر سادہ ہے۔ نواب کریم خاں کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو بھی اپنے مشاہدے میں شریک کرلیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''پانی میں وہاں کے شراب انگوری کا اثر ہے۔ ہر ایک طرف کو عالم طلسمات کا ہے۔ کوچے سے اثر رنگ مانی مات۔ بازار میں ہر طرف چہل پہل۔ شیشہ آلات کی دکان رشک شیش محل۔''(۳۱)

نواب کریم خاں کے نزدیک وہاں کی آبادی رشک پرستان ہے۔ نواب کریم خاں وہاں کی رقص و سرور کی محفلوں میں گیا مگر شراب اور دوسری برائیوں سے اس نے اجتناب کیا ہے اگرچہ اس کا تذکرہ ''سیاحت نامہ'' میں ضرور ہے۔ نواب کریم خاں وہاں کی تہذیب و معاشرت اور خصوصاً لندن شہر سے خاصا مرعوب نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''بھانت بھانت کی مٹھائیاں وہاں جس وقت چاہو مہیا۔ زن و مرد کی وہ کثرت کہ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے''بقول شخصے اگر عالم علوی بھی وہاں آتا تو ایک نظارے میں عجائبات سماوی کو بھول جاتا۔ پھر انسان کس شمار قطار میں ہیں۔''(۳۲)

جس طرح کمبل پوش نے اپنے سفرنامے میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی بھی عکاسی کی ہے اور بعض دلچسپ اور حیرت انگیز پہلوؤں کو بھی قلمبند کیا ہے۔ اسی طرح نواب کریم خاں نے بھی ہندوستان کی بعض دلچسپ باتوں کو قلمبند کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخ وتو ہمات ہند سے متعلق خاصی معلومات رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ پیرا دیکھیے:

''اکثر سیاحوں کی زبان یوں سننے میں آیا ہے کہ گنگا کے کنارے پر انتہا تک بیشتر مخنث مرد، چور، مفسد، راہزن بستے ہیں۔ وجہ اس کی صاحب خلاصۃ التواریخ نے یہ لکھی ہے کہ از بس کہ نہانے سے گناہ لوگوں کے جسم سے دور ہوتے ہیں اغلب ہے کہ وے ہی بطور تناسخ پیکر انسانی میں جنم لے کر خلق کو یہاں اذیت دیتے ہیں۔''(۳۳)

''سیاحت نامہ'' میں نواب کریم خاں نے قاری کو سیر بھی کروائی ہے اور معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اس سفرنامے میں تہذیبی حوالے سے جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ نواب کریم خاں نے سفرنامے میں صرف خشک معلومات کا پلندہ نہیں پیش کیا بلکہ خارج کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی جذبات کو بھی بطریق احسن بیان کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' ان کے علمی اور تحقیقی سفر کی داستان ہے۔ یہاں علمی سے مراد یہ ہے کہ سرسید کا مقصد انگلستان جا کر وہاں کے نظام تعلیم اور تہذیب و معاشرت سے بذات خود واقفیت حاصل کرنا تھا اور تحقیقی سے مراد یہ ہے کہ سرسید کا مقصد سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' کا جواب تیار کرنے کے لیے مناسب ماخذ تک رسائی اور مواد کی فراہمی تھا۔ ''مسافران

لندن'' میں بھی سرسید سیاح کم اور مصلح زیادہ نظر آتے ہیں۔ شاید اسی سبب ''مسافران لندن'' میں ادبیت کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ جب وہ مشکل سفر طے کر کے لندن پہنچے تو ان کا وطن ان کے دل میں موجود تھا۔ دیار غیر میں بھی جا کر ان کو اپنی قوم کے درپیش مسائل نے چین سے نہ رہنے دیا، سفرنامے میں بھی جگہ جگہ وطن اور قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ بلکہ لندن میں سرسید کی اضطرابی کیفیت کا اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے۔ سرسید کا مقصد لندن میں جا کر انگریزوں کے نظام تعلیم اصول تدریس اور تہذیب و معاشرت سے براہ راست واقفیت حاصل کرنا تھا اور اسے اپنے ملک میں بھی رائج کرنا تھا تاکہ مسلمانوں کی کشتی بھنور سے نکل سکے۔

''مسافران لندن'' میں سرسید نے یورپ کے عجائبات اور تہذیبی خوبیوں کی تعریف بھی کی ہے اور ساتھ ہی ان کو اپنی زوال آمادہ قوم کے ذہنی افلاس اور علمی کم مائیگی کا خیال بھی ستاتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں ان پر افسردگی کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ وہ اپنی قوم کی پستی اور دوسری قوموں کی ترقی کا موازنہ بہت درد سے کرتے ہیں۔ وہ قاری کو اپنے مشاہدات میں شریک کرنے کے بجائے اپنے مشاہدات سے اخذ شدہ نتائج سے آگاہ کرتے ہیں اس سفرنامے میں تلقین کا عنصر غالب ہے۔ بلکہ ایک للکار اور تنبیہ کا لہجہ نظر آتا ہے۔

اس سفرنامے میں مقصدیت کا غلبہ ہے۔ کہیں بھی سفرنامہ نگار اس مقصدیت کے حصار سے باہر نہیں نکل سکا۔ اس میں جنس نگاری کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں کہیں جنس کا تذکرہ ملتا ہے وہ حظ اٹھانے کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ اصلاحی نقطہ نظر سے ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے یوسف خاں کمبل پوش اور سرسید کے رویے کا موازنہ کچھ یوں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یوسف خاں کمبل پوش اور سرسید کے رویے کا موازنہ کریں تو دونوں میں بعد القطبین نظر آتا ہے۔ یوسف خاں کا سفر غیر مقصدی تھا جبکہ سرسید نے کسی مقام پر مصلح قوم کا عمامہ اتارنے کی سعی نہیں کی۔ یوسف خاں کا سفرنامہ ایک آزادہ فکر اور ایک آزادہ خیال کا سفرنامہ ہے۔ سرسید قومی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور انہیں آسودگی اور طمینان کا سانس لینا بھی دشوار ہے۔ یوسف خاں کا سفر اپنا ثمر خود اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے جبکہ سرسید ثمر کی تلاش میں منزل منزل سرگرداں رہتے ہیں اور جب کچھ ہاتھ آتا ہے تو اسے ابنائے وطن میں تقسیم کر دیتے ہیں۔''(۳۴)

سرسید کا سفرنامہ شعوری کوشش کا نتیجہ ہے اور اس میں ادبیت کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔ جبکہ یوسف خاں نے فطری سیاح کی نظر سے دنیا کو دیکھا ہے اور جہاں کہیں اس کو حسن نظر آتا ہے وہ

اس سے حظ اٹھاتا ہے جبکہ سرسید نے لندن کا سفر اس لیے کیا کہ ان کے مشاہدات اور تجربات ان کے ہم وطنوں کے لیے مفید ہوں۔ سرسید کے اس سفر کو ہم تعلیمی سفر کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ایسی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی جوان کے ہم وطنوں کے علمی اور تعلیمی تقاضے پوری کر سکیں اور جن کے مطالعے سے ہندوستان کی زوال آمادہ قوم کی تربیت ہو سکے۔ انہوں نے کسی بھی مقام پر اپنے مقصد کو پس پشت نہیں ڈالا بلکہ وہ قاری کو مغرب کے عجائب خانوں، لائبریریوں اور جلسہ گاہوں میں لے جاتے ہیں اور وہاں مغرب کی ترقی کا راز کھولتے ہیں۔

سرسید کے ہاں جنس نگاری کے جو تھوڑے بہت نمونے ملتے ہیں وہ تلذذ کے لیے نہیں اور نہ ہی وہ جنس نگاری کی عمومی سطح ہے بلکہ موازنے کے ذریعے وہ جنس نگاری کی اعلیٰ علمی وادبی سطحیں پیش کرتے ہیں۔ اگر یہاں ادبی سے زیادہ صرف علمی کا لفظ استعمال کیا جائے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔ مثال کے طور پر وہ یورپین اور ہندوستانی خواتین کا موزانہ کچھ یوں کرتے ہیں:

"پس اب سمجھنا چاہیے کہ متوسط درجے سے کس قدر کم درجے کی عورتوں کی تو کیسی عمدہ تعلیم ہے۔ کیا تعجب انگیز بات نہیں کہ ایک عورت حالت بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلا وے۔ آپ نے ہندوستان میں کسی امیر، کسی نواب، کسی راجا، کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہے؟

اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار، میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمال نفرت اور کمال حقارت ان کے خیال میں گزرتی ہے۔"(۳۵)

سرسید احمد خاں کے سفرنامے "مسافران لندن" میں جنس نگاری کے زیادہ عناصر نہیں ملتے کیونکہ وہ مصلح تھے اس لیے ان کے ہاں مقصدیت کا عنصر نمایاں ہے سرسید ایک ایسے سفرنامہ نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو ایک ترقی یافتہ ملک کی تہذیبی روایات اور فنی ایجادات کو سمیٹ کر اپنے وطن لے آنا چاہتے ہیں اور اس طرح "مسافران لندن" میں ہر مقام پر مقصدیت حاوی نظر آتی ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" وہ بھی، جو ان کی خود نوشت سوانح ہے سفرنامے کے عناصر موجود ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اُن واقعات کا ذکر کیا ہے جو انہیں جزائر انڈیمان کے سفر میں درپیش آئے۔ مولانا جعفر تھانیسری کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایک اچھے سفرنامہ نگار کی

طرح اپنے مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہوئے واقعات کو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ اس کتاب پر سفرنامے کا تاثر غالب آگیا ہے۔

انڈیمان کی سرزمین پر طویل قیام کے دوران میں مصنف نے اس سرزمین کی ثقافت اور رسوم ورواج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہاں کے لوگوں کی نفسیات، رجحانات اور عقائد کے بارے میں بھی اس کتاب سے خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

"مسماۃ چاناپالک ایک اس کی جورو بھی ہے۔ اس کی جورو کو بھی فنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوئی ہے مگر اس کا درجہ خدا سے کم ہے، اس کا کام ہے کہ سمندر میں مچھلیاں پیدا کرے۔ وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔ یہ لوگ شیطان کے بھی قائل ہیں کہ سب بُرے کام شیطان کراتا ہے۔۔۔ یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرد عورت دونوں جنس سے ہیں اور جنگل میں رہتے ہیں۔۔۔ یہ لوگ دو سے زیادہ گنتی نہیں جانتے جب کوئی چیز دو سے زیادہ گنتے ہیں تو انگلیوں پر اشارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ننگے مادر زاد پھرتے ہیں۔ فقط عورتیں ایک چھوٹا سا پتہ اندام نہانی میں تاگرے میں اٹکا کر رکھ لیتی ہیں۔۔۔ ان کے گھر جا کر دیکھو تو سوائے میاں بیوی کے اور کچھ جائداد اور ملکیت نہیں۔ تیر وکمان ان کی اصل جائداد اور جان ہے۔"(۳۶)

اس اقتباس سے مولانا جعفر تھانیسری کی مردم شناسی مشاہدے اور مطالعے کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ انہوں نے وہاں کے لوگوں کے ایمان، اعتقاد اور رسوم ورواج کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے جہاں جنس کا ذکر کیا ہے۔ وہ محض حظ اٹھانے کی غرض سے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے عقائد اور رسوم ورواج کی عکاسی کے لیے ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ جعفر تھانیسری نے واقعات کو چھپانے کے بجائے انہیں صداقت اور خلوص سے بیان کر دیا ہے۔ ان کی کتاب کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ "روم ومصر وشام" بھی علم کی غرض سے لکھا گیا۔ ماضی میں مسلمانوں نے جتنے سفر کیے وہ زیادہ تر علم حاصل کرنے کی غرض سے کیے۔ کیونکہ سفر کو وسیلہ ء ظفر بھی کہا گیا ہے۔ شبلی کا یہ سفر بھی ان کی داخلی تحریک کا نتیجہ ہے۔ شبلی سیر وسیاحت کی غرض سے نہیں نکلے تھے بلکہ ان کا مقصد ان خزینوں تک رسائی حاصل کرنا تھا جن کو مغربی اقوام لوٹ کر لے گئی تھیں۔ شبلی نے اس سفر کے دوران میں قسطنطنیہ، بیروت اور بیت المقدس میں قیام کیا۔ وہاں کے صاحبانِ کمال سے ملاقات کی۔ ہر شہر کے قابل دید مقامات دیکھے۔ کتب خانوں اور تعلیم گاہوں کی سیر کی۔ ترکوں

اور عربوں کے رسم و رواج اور عادات و خصائل سے آگہی حاصل کی۔ وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ شبلی نے ہر نئی چیز کو حیرت اور شوق سے دیکھا۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں وہاں کی عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں:

''جہاز سے ہم اترے تو نہایت بلند اور شاندار عمارتوں کا سلسلہ نظر آیا جو دور تک بخط مستقیم دریا کے کنارے کنارے چلا گیا ہے۔ یہ عمارتیں ہوٹل، قہوہ خانے تھیٹر، ناچ گھر اور عیسائی تاجروں کی دکانیں ہیں اور نہایت خوش منظر اور پر فضا ہیں۔ رات کے وقت ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میلہ یا شادی کی تقریب ہے۔ قہوہ خانوں اور ناچ گھروں کے علاوہ سڑک پر کثرت سے مجمع رہتا ہے اور جدھر جاؤ نغمہ و سرود کی آواز آتی ہے۔ اس سلسلہ عمارات کے عقب میں عیسائیوں کا محلہ ہے اور اس قدر بلند اور عالی شان عمارتیں ہیں کہ میں نے اب تک نہیں دیکھیں۔'' (۳۷)

جب مولانا شبلی کو اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ یہ عظیم عمارات اور پر شکوہ ایوانات غیر مسلموں اور عیسائی تاجروں کے ہیں اور مسلمان اقتصادی اور معاشی لحاظ سے پسماندہ ہیں تو وہ آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور ان پر تاسف غالب آ جاتا۔

بابو اما شنکر کا سفرنامہ ''آئینہ سکندری'' سفر یورپ کی یادگار ہے۔ ۱۸۸۶ء میں وہ یورپ روانہ ہوئے۔ اس دور میں ہندوؤں کا بیرون ملک جانا مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بابو اما شنکر کو بھی برادری میں بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن ماسٹر پیارے لال نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو انگلستان روانہ کیا۔

اس سفرنامے میں ۱۸۸۶ء کے انگلستان کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اما شنکر نے اس سفرنامے میں یورپ کی رسوم و رواج کو بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اما شنکر لندن کی زندگی کی چکا چوند سے متاثر ہیں لیکن انہوں نے اس معاشرے کے معائب کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس سفرنامے میں دلچسپی کا عنصر بھی موجود ہے جو قاری کو بور ہونے سے بچاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں:

''چوری کرنے میں بھی یہاں کے آدمی ایسے ہی طاق ہیں جیسے کہ شرافت میں۔ میرے کوٹ کے اندر کی جیب میں پندرہ پونڈ تھے۔ ایک پونڈ کا میں نے سودا لیا۔ لالہ مدن گوپال۔ لالہ رنگ میرے ہمراہ تھے۔ تین منٹ بعد سب کے سب پونڈ غائب۔ خدا معلوم کس نے اور کیونکر نکال لیے۔'' (۳۸)

اس سفرنامے میں معروضیت پائی جاتی ہے۔ سفرنامے کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ سلاست اور اظہار کے لحاظ سے صداقت کا نمونہ ہے۔ ''آئینہ سکندری'' میں یورپ کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور یہ سفرنامہ اس دور کی ایک اہم دستاویز ہے۔

مولوی عبدالخالق موحد کا سفرنامہ ''سیر برہما'' ہے۔ انہوں نے یہ سفر تبلیغ کی غرض سے کیا تھا۔ اس میں انہوں نے اس خطے کی مذہبی رسوم اور اعتقادات کی عکاسی کی ہے۔ اس سفرنامے کا اسلوب سادہ ہے۔ اس میں برہما کے تاریخی حالات اور سماجی معلومات کو بڑی صداقت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں سفرنامہ نگار نے جنس کا ذکر کیا ہے اس میں انہوں نے وہاں کے مذہب اور رسوم و رواج کی عکاسی کی ہے۔ مولوی عبدالخالق نے وہاں جا کر برہما کی زبان سیکھی تھی اور خود ان کا استاد پھونجی اوتھواون مسلمان ہو گیا تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''جس قدر زبردست پھونجی ہوگا۔ اسی قدر زیادہ عرصے تک زیادہ سامان کے ساتھ لاش رکھی جائے گی اور کبھی کبھی ناچ بھی ہوا کرے گا۔ بعد ازاں اگر اس کے شاگرد یا پیر بھائی مریدوں معتقدوں میں سے کوئی مالدار ہوگا تو وہ ——— ورنہ چندہ کر کے نہایت دھوم دھام سے اس کو جلائیں گے۔ دستور ہے کہ جس قدر پھونجی اس کے تجہیز و تکفین میں شریک ہوں گے۔ وہ سب ایک ایک تابوت اس قسم کا لائیں گے اور قبل جلانے یا دفن کرنے کے ہر تابوت میں اس کی لاش رکھ کر سات بار جنبش دیں گے۔ جس وقت اس تابوت کو آگ دی جائے گی اس وقت سے خاک ہونے تک نہایت عمدگی سے ماتمی باجا بجتا ہے اور رنڈیاں اپنی اپنی سریلی آوازوں میں دردناک اشعار گاتی ہیں۔'' (۳۹)

لالہ بیج ناتھ کے سفرنامہ ''انگلینڈ اور انڈیا'' میں یورپ کی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ سفرنامہ پہلے انگریزی زبان میں لکھا گیا پھر لوگوں کے اصرار پر اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ اس سفرنامے میں لالہ بیج ناتھ انگریزوں کی تہذیب سے متاثر نظر آتے ہیں تاہم بعض مقامات پر انہوں نے معائب پر بھی نظر دوڑائی ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ سفرنامہ نگار نے اپنی ذات کی نمائش نہیں کی۔ جنس نگاری کے نمونے تہذیبی حوالے سے ہیں۔ ہم مشرقی لوگ جن چیزوں کو برا تصور کرتے ہیں وہ انگریزوں کے ہاں قدر کی اہمیت رکھتی ہیں۔ سفرنامہ نگار کے اسلوب میں کہیں کہیں شگفتگی بھی در آئی ہے جس سے قاری کو بوریت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سفرنامے کا یہ اقتباس دیکھیے:

''تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اخبار جو دس بیس ہزار پاؤنڈ ایک ریل یا

جہاز کے ٹوٹنے یا کسی سرنگ کے اڑنے کے حادثے کی خبر سب سے اول بہم پہنچانے میں صرف کر دے گا۔ وہ لائق سے لائق معمولی لکھنے والوں کو ایک دوگنی فی کالم سے زیادہ نہیں دے گا مگر باوجود اس بخل کے ہزاروں آدمی اس قدر رکم اُجرت پر بھی مضامین دیتے ہیں اور اسی وجہ سے انگلستان کے اخباروں میں عمدگی پائی جاتی ہے۔۔۔ (یہاں) ہر چیز اشتہار کے تابع ہے۔ ان اشتہارات میں ہر قسم کے مضمون ہوتے ہیں۔ نہ صرف خرید و فروخت مال و اسباب و خانگی نوکروں کی ضرورت کے بلکہ عاشقوں معشوقوں کے قصے بھی درج کیے جاتے ہیں۔ بعض اشتہاروں میں ماں لڑکی سے کہتی ہے کہ "اب میرے پاس آجاؤ!" بعض میں عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ "ذرا اپنے بچوں کا خیال کرو۔" بعض میں ملاقاتوں کی جگہیں قائم کی جاتی ہیں۔ بعض کے ذریعے مردوں اور عورتوں میں شادی کے معاہدے ہوتے ہیں اور جو باتیں کہ وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں وہ کی جاتی ہیں۔" (۴۰)

منشی محبوب عالم نے دو سفرنامے لکھے (۱) سفرنامۂ یورپ (۲) سفرنامۂ بغداد (۳) سفرنامۂ یورپ کا شمار اُردو کے طویل ترین سفرناموں میں ہوتا ہے۔ منشی محبوب عالم کا یہ سفرنامہ نہ صرف ان کے گوناگوں اور متنوع مشاہدات کا حاصل ہے بلکہ اسے لکھ کر انہوں نے اپنا ایک عوامی فریضہ بھی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کی پسماندگی اور علمی کم مائیگی سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اپنے اخبار (پیسہ اخبار) کے ذریعے ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں مصروف عمل رہے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ باہر کی مہذب دنیا کے سفر کیے جائیں جو اقوام ہم سے علوم و فنون میں بہت آگے ہیں۔ وہاں سے کچھ دیکھ کر اور سیکھ کر آئیں اور اپنے ہم وطنوں کو بھی اپنے تجربات سے فیضیاب کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاح کو سیاحت کے ثمرات عام لوگوں تک پہنچانے چاہئیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ خود غرضی کے زمرے میں آتا ہے۔ یعنی کوئی علم یا واقفیت جو ایک سیاح دوران سیاحت حاصل کرتا ہے وہ دوسروں پر بھی ظاہر کرے۔ منشی صاحب کی غرض صرف معلومات حاصل کرنا تھی۔ انہوں نے ہر چیز کا مشاہدہ کیا اور معمولی سے معمولی بات کو بھی اپنے سفرنامے میں تحریر کیا ہے۔ منشی محبوب عالم نے جو بھی منظر دیکھا۔ انہوں نے قاری کی آنکھوں کو بھی اس منظر سے سیراب کیا۔ انہوں نے جہاں کہیں کوئی نئی چیز دیکھی۔ اس کو اپنے سفرنامے میں سمیٹ لیا۔ انہوں نے وہاں کی تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج کی بھی عکاسی کی ہے۔ ان کے سفرناموں میں جنس نگاری کا رجحان محض حظ اٹھانے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہے بلکہ یورپ کی تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالنے کے لیے ہے۔ ان کا

قلم کہیں بھی آلودہ نہیں ہوا۔ انہوں نے یورپی ممالک کے مناظر کی عکسبندی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے سفرنامے کی مندرجہ ذیل دلچسپ مثالیں دیکھیے:

"یہودی عورتیں تو بالکل گوری چٹی اور حسین ہوتی ہیں۔ یہ کم بخت عربی اور مسلمان عورتوں کا لباس پہن کر ترکی، مصر، یونس اور مراکش چاروں مقامات کے تھیٹروں میں ناچتی تھیں۔ ہندوستان کی رنڈیوں کا ناچ ان کے مقابلے میں نہایت شریفانہ اور مہذبانہ ہوتا ہے۔ یہودیوں کا لباس اور ناچ بالکل فحش ہوتا ہے اور اہل یورپ تماشبین قدر رنا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محمڈن عورتوں کا ناچ اور تماشہ دیکھ رہے ہیں۔" (۴۱)

"ایک ریستوران سے کھانا کھا کر دس بجے ہوٹل میں جا سویا۔ راستہ میں ایک بازار میں ایک عورت نے میرے ہاتھ میں ایک مٹی کا بت ہنس کر دے دیا۔ گو بولی سے نہیں مگر بشرہ سے میں اس کا مطلب تاڑ گیا۔ ہوٹل میں آکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آوارہ عورتوں نے یہی تقریب کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ یہ وینس کا بت تھا۔ جو عشق کی دیوی تھی۔" (۴۲)

منشی محبوب عالم دوسرے متعدد سفرنامہ نگاروں کی طرح یورپ کی تہذیب سے متاثر نظر نہیں آتے بلکہ انہوں نے مغرب کو بھی مشرق کے اخلاقی زاویے سے دیکھا ہے۔ انہوں نے اخلاقیات کو پامال کیے بغیر ہر محفل میں شرکت کی۔ ان کے سفرنامے میں تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، گلیوں، گزرگاہوں، موسموں کا حال ہوٹلوں کا محل وقوع، شراب کی افراط، خصوصاً پیرس اور لندن کی سیر کا احوال بہت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ منشی محبوب عالم کا سفرنامہ یورپ رشک و حیرت کو بھی بھڑکاتا ہے۔

منشی محبوب عالم چونکہ صحافی تھے۔ انہوں نے ہر اُس بات کو اہمیت دی ہے جو قاری کے لیے مفید اور دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھیے:

"قہوہ خانوں میں لوگ کیسی بے فکری سے بیٹھے نظر آتے ہیں کہ جیسے دُنیا کی ان کو کچھ ضرورت نہیں۔ باوجودیکہ شکر کی گرانی کی وجہ سے چائے کم پی جاتی ہے مگر باوجود ایندھن کی قلت کے قہوہ ہر وقت گرم رکھنا پڑتا ہے۔ مختلف قوموں اور بازاروں کے الگ الگ قہوہ خانے معلوم ہوتے ہیں مگر جادہ خلیل پاشا پر تو ایک قہوہ خانے کے بنچیں چوتھائی میل میں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں ستھرے کپڑے پہن کر اعلیٰ کلاس کے یہود و نصاریٰ اور شاید مسلمان بھی سیر کے لیے شام کو جا کر بیٹھتے ہیں اور ادھر سے

یہودی عورتیں الجھڑک لباس پہن کر بطور قاعدہ کے گزرتی ہیں۔" (۴۳)

نواب فتح علی خان کا سفر نامہ "سیاحت فتح خانی" ہے۔ نواب فتح علی خان بہت مالدار آدمی تھے۔ اور انہیں دنیا کے عجائبات دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لیے ان کی عمر کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ انہیں اٹلی، فرانس، سسلی، انگلستان اور بلغاریہ وغیرہ کی سیر کا موقع ملا۔ اس سفر میں انہوں نے بہت سی معلومات اور تجربات حاصل کیے۔ اس سفرنامے میں عمارتوں، عجائب خانوں، چڑیا گھروں، نیشنل گیلریوں اور کتب خانوں کا تذکرہ موجود ہے۔

نواب صاحب نے اپنے سفرنامے میں امیروں، وزیروں اور سرکاری افسروں وغیرہ کی ملاقاتوں کو زیادہ اہمیت دی ہے اور جگہ جگہ انگریزی حکومت کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے اس کی برکات کو تسلیم کیا ہے۔ اس سے نواب صاحب کی ذہنی غلامی کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ ان ممالک سے متاثر نہیں بلکہ مرعوب نظر آتے ہیں۔ اس طرح کہیں کہیں ان کے ہاں احساسِ کمتری بھی ملتا ہے۔

لندن کی تہذیبی اور مجلسی زندگی کا تذکرہ بھی اس سفرنامے کا حصہ ہے۔ اس میں بہت سے ایسے واقعات موجود ہیں جن میں انگریزی امرا اور ان کی بیگمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"جب ہم بازار میں داخل ہوئے تو لیڈیاں ہر طرف سے آکر گھیرنے لگیں۔ ہر ایک اپنی دکان کی طرف کھینچنے لگی تا کہ اس کی دکان سے کچھ خریدا جائے چنانچہ میں نے مختلف دکانوں سے کچھ سگریٹ و چاندی کا سامان خریدا۔ ان فروخت کرنے والی لیڈیوں میں ڈچز آف لیڈر اور ڈچز آف مارلبرو و دیگر بہت سی معزز و خاندانی لیڈیاں ہیں جو ہر طرف سے آکر گھیرتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی چیز ضرور مول لیجیے۔ یہ اسباب جو یہاں فروخت ہوتا ہے اس کی علت غائی صرف یہ ہے کہ اس سے ہسپتال کے لیے چندہ جمع کیا جائے کیونکہ ہر چیز اصل قیمت سے چند در چند قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔" (۴۴)

ڈاکٹر حاجی محمد حسین کا مکتوباتی سفرنامہ "۱۹۰۷ء کا جاپان" بہت عرصے تک گوشہ گمنامی میں پڑا رہا۔ اسے سید طفیل منگلوری نے تلاش کیا۔ انہوں نے اسے سید الطاف علی بریلوی کو رسالہ "مصنف" میں شائع کرنے کے لیے دیا۔ چونکہ اس وقت دوسری جنگ عظیم جاری تھی اور جاپان لڑتے لڑتے ہندوستان کی عملداری کے قریب آ چکا تھا اس لیے بعض جنگی وجوہ اور صحافتی وجوہ کی بنا پر یہ شائع نہ ہو سکا۔ جنگ کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد پہلی بار ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور سے مولانا صلاح الدین احمد

نے اسے شائع کیا۔ ڈاکٹر محمد حسین نے اس سفرنامے میں اپنے سفر کا مقصد نہیں بیان کیا۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ ان کا مقصد دنیا کی سیر و سیاحت تھا۔ انہوں نے اپنے سفر کی روداد کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ سیر و سیاحت ان کے لیے اکتسابِ مسرت کا وسیلہ تھی۔ وہ مسافر سے زیادہ ہر مقام پر سیاح نظر آتے ہیں۔ ان کی زندہ دلی ہر مقام پر محسوس ہوتی ہے۔ جہاں ان کا دل انہیں کھینچتا ہے وہ اس طرف چل پڑتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

"برما کی عورتیں عام طور پر زیادہ خوبصورت نہیں مگر بعض بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ایک بات ان میں عجیب یہ ہے کہ سب کی سب خوش وضع اور خوش خلق، خوش باش اور ہمیشہ خوش۔ کسی سے یہاں ہنسی مذاق کی بات کیجیے۔ سوا ہنس ہنس کے جواب دینے کے کوئی آپ سے رنجیدہ نہیں ہوگا۔ مانڈلے میں ایک بہت بڑی ریشمی کپڑے کی دکان پر ہم لوگ پہنچے۔ دو کاندار دو نہایت حسین عورتیں تھیں۔ ان سے کپڑا ابھی خریدتے جاتے اور مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ اور وہ بھی نہایت خوش تھیں۔ ہمارے دوست علی عارف صاحب نے ایک سے کہا "یہ (میری طرف اشارہ کر کے) تم کو پسند ہیں؟" وہ ہنس پڑی اور کہا "بڑی ممنون ہوں" اس کے بعد میں نے چاہا کہ اس کا فوٹو لوں۔ فوراً راضی ہوگئی۔" (۴۵)

"بازاروں کی سیر کے بعد گائیڈ صاحب نے فرمایا کہ "یہاں گرین ہاؤس بھی اچھے ہیں۔" —— کہا "بہتر دکھایئے!" یہاں چینی حوریں دیکھیں جو واقعی بہت خوبصورت اور قابلِ قدر خوبصورت کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے ان کے چھ چھ انچ کے پیر بھی بُرے معلوم نہیں ہوتے۔۔۔۔ بڑے بڑے لوگ یہاں بغرض تفریح آتے ہیں اور چلتے ہوئے اگر جی چاہا تو کسی کو گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لے گئے۔ بندہ نے بھی یہ سمجھا کہ "من عاشد القوم فھو من ھم" ایک حور کو گاڑی میں لے آیا۔ ایک ہوٹل میں پہنچے جو خاص ہوٹلوں میں سے ہے اور یہاں چند گھنٹے اپنا غم غلط کیا۔" (۴۶)

اس سفرنامے میں بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ سفرنامہ نے اپنی آنکھ سے جاپان کو دیکھا ہے اور اسی آنکھ سے قاری کو بھی وہ مناظر دکھانے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے جس طرح جو کچھ دیکھا اس کو بالکل ویسے ہی بیان کر دیا ہے اس طرح اس سفرنامے میں اظہار سے گریز نہیں کیا گیا۔ تہذیبی و معاشرتی زندگی کی جھلکیاں دکھانے کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگار نے اپنے بعض نجی واقعات بھی بیان کر دیے ہیں۔

یعقوب علی عرفانی کا سفرنامہ "مشاہدات عرفانی" ہے۔ اس سفرنامے میں یعقوب علی عرفانی نے یورپ کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے وہاں مشاہدہ کیا کہ اہلِ یورپ اپنے مذہب کی نمائش میں پیش پیش ہیں۔ ہندوستان سے جو لوگ یورپ علم کی غرض سے جاتے ہیں وہ وہاں جا کر نہ علم سیکھتے ہیں اور نہ فن۔ عرفانی صاحب پر اس طرح کا ملال غالب نظر آتا ہے۔ انہوں نے یورپ کی تہذیب کی بھی عکاسی کی ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مناظر سے خود پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"میں ذاتی طور پر پبلک میں عام طور پر بھی نہانے کا بچپن سے عادی نہیں ہوں اور اب تو مجھے مردوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں جبکہ وہ کلیلیں کر رہے تھے، نہانا پڑا۔ میں دیکھتا تھا کہ کوئی محفوظ سی خلوت گاہ میسر آ جائے۔ وہ یہاں معدوم تھی اور میری غریب الوطنی اور اجنبیت اور بھی جاذب تھی۔ میں یہاں آنے پر پچھتاتا تھا۔۔۔ لیکن آخر میں نے سوچا "ہر چہ آید بر سرِ فرزند آدم بگزرد" اور تامل وتردد فضول تھا۔۔۔ طوعاً کرہاً میں نے غسل سے فراغت پائی۔"(۳۷)

مرزا حسین احمد بیگ کا سفرنامہ "پردیس کی باتیں" ہے۔ اس میں مرزا حسین احمد بیگ بطور سیاح سفر کی مشقت اٹھاتے ہیں لیکن ہر نئے منظر اور موڑ پر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ مرزا حسین احمد بیگ تبدیلی آب وہوا کی غرض سے کولمبو، قاہرہ، سوئٹزرلینڈ، بیت المقدس، دمشق، وی آنا اور برلن ہوتے ہوئے لندن پہنچے۔ مرزا صاحب وسعت نظر رکھنے والے سیاح نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مناظر اور چہچہاتے ہوئے واقعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا نقطہ نظر بھی مثبت نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب خوش نگاہ بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"۱۱ جون کو صبح آٹھ بجے کے قریب ہم وی آنا سے برلن روانہ ہوئے۔ راستہ میں منظر بہت اچھا تھا۔ بہت دور کا کنارہ ملا۔ کثرت سے مرد اور عورت نہاتے ہوئے دکھائی دیے۔ سرسبز پہاڑ اور چشمے بہت دلکش تھے۔ جنگل بھی خوبصورت تھا۔۔۔ آرام لینے کے لیے لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان عورت ہمارے درجہ میں آ گئی جس کی وجہ سے ہمیں بیٹھنا پڑا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ عورت شہر پراگ تک ہمارے ساتھ جائے گی۔۔۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی شادی پہلے ہوئی تھی کچھ عرصہ ہوا خاوند سے طلاق لے لی اور اب دوسری شادی کی فکر میں ہے۔ بار بار ہونٹوں پر سرخی اور منہ پر

[illegible] نکالی تھی۔ سلیم بھائی نے دوران گفتگو عمر دریافت کی اور اس پر وہ کسی قدر ناراض ہوئی اور کہنے لگی "یہاں کسی عورت کی عمر دریافت کرنا گویا اس کی توہین ہے۔"(۳۸)

بیگم حسرت موہانی کا "سفرنامہ عراق" [illegible] سفرنامہ ہے۔ انہوں نے اس میں [illegible] کا ذکر کیا ہے۔ عموماً مرد سیاح لائبریریوں، تاریخی [illegible] لیکن بیگم حسرت موہانی نے عورت ہونے کی حیثیت [illegible] اقسام کے کھانوں وغیرہ کا ذکر زیادہ کیا ہے۔ [illegible] کوائف اکٹھے کیے ہیں جن میں خواتین کی دلچسپی کا [illegible] عورتوں کی آزادی کے بارے میں بھی انہوں نے وہاں کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ [illegible]

"یہاں پر وہ [illegible] البتہ پرانی وضع کی کچھ عورتیں عرب کا سا نقاب [illegible] پنڈلیاں اوپر تک کھلی۔ موزے باریک، لیڈی شو، باقی [illegible] خصوصاً [illegible] فراک گریبان چاک اوپر سے چسٹر۔ [illegible] سب کے سب چہروں پر زلفیں آٹھ آٹھ انگل کی اور ادھر اُدھر گالوں [illegible] کسی کسی کی چوٹی لانبی اور کسی کسی کا جوڑا پیچھے بندھا ہوا۔ ورنہ اکثر کے بال کٹے رہتے ہیں۔ بے انتہا حسین اور گداز بدن۔ سرخ وسفید۔ ناک نقشے [illegible] سکولوں میں بازاروں میں گھومتی پھرتی ہیں۔"(۳۹)

بیگم حسرت موہانی نے عراق کی آزادہ خیالی کو ظاہر کرنے کے لئے جنس کا سہارا لیا ہے۔ انہوں نے وہاں کی تہذیب وتمدن، رسوم ورواج اور لوگوں کے رہن سہن کے طریقوں کی عکاسی کی ہے۔ اس سفرنامے میں عراق کی گھریلو زندگی کی معلومات بھی ملتی ہیں۔ اس سفرنامے کا زیور اس کی سادگی ہے۔ دوران مطالعہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاتون نے اپنی آنکھ سے عراق کو دیکھا اور اس کو صداقت سے بیان کر دیا۔

قیام پاکستان سے پہلے اردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان نسبتاً بہت کم تھا البتہ ان سفرناموں میں جنس نگاری کے عناصر کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ اس دور میں ہر ایک کو سفر کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور سفر اتنی تیزی سے طے نہیں ہوتا تھا۔ آج تو سست رفتار بیل گاڑیوں کی جگہ ریل گاڑیوں اور جہازوں نے لے لی ہے۔ انسان کے سفر کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ میں بھی تیزی آ گئی ہے۔ دورِ غلامی میں ہندوستان کے لوگوں کی خواہش ہوتی تھی کہ ہندوستان سے باہر نکل کر نئی دنیاؤں

کی سیر کی جائے اور اپنے انگریز حاکموں کے طور طریقوں کا مشاہدہ کیا جائے۔ یہ حاکم ان سے سات سمندر پار رہتے تھے۔ لیکن اپنی حکمت عملی کو بروئے کار لا کر ان پر حکومت کرتے تھے۔ اس حکمتِ عملی کا مشاہدہ اور مطالعہ بھی سفرنامہ نگاروں کا مقصودِ نظر تھا۔

اس طرح ہمارے زیادہ تر سفرنامہ نگار وہاں جا کر نہ صرف اُن کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرتے تھے بلکہ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے وہاں سے سلیقہ بھی سیکھتے تھے۔ اس دور کا سفرنامہ زیادہ تر مخصوص مقاصد کے تحت لکھا جاتا رہا ہے کیونکہ جب انسان غلامی میں یا قید کی حالت میں ہوتو اس وقت وہ دنیا کی رنگینی چھوڑ کر آزادی حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان سفرناموں میں بہت سی نئی باتیں اور نئی معلومات کا تذکرہ موجود ہے جو اُس دور کے قاری کے لیے تازہ ہوا کے جھونکے سے کم نہ تھا۔ یہ تذکرہ پڑھ کر وہ ذہنی مسرت اور آسودگی محسوس کرتا تھا۔ اس دور کا سفرنامہ نگار ملکوں اور شہروں کی تاریخ، عمارات کی بناوٹ رسم ورواج اور تہذیبی و تمدنی زندگی کے کوائف کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اس سے قاری اَن دیکھی دنیاؤں کی سیر بھی کر لیتا تھا اور اس کے اندر بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اُس دور کے سفرنامہ نگار اپنی ذات کی نمائش کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور قاری کو مرعوب کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ وہ قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح وہ سفرنامے زیادہ تر اصلاحی اور مقصدی نقطہ نظر سے لکھے گئے اُس دور کا سفرنامہ نگار اپنے اصل مقصد سے غافل نہیں رہا۔ اس لیے وہ سفرنامے قوم کے لیے مہمیز کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سفرنامہ نگاروں کے ہاں جنس نگاری کے زیادہ نمونے نہیں ملتے۔ اگر کوئی سفرنامہ نگار وہاں کی رنگینی میں کچھ لمحاتی طور پر کھو بھی جاتا ہے تو جلد ہی اس کے ذہن میں غلام ہندوستان کا خیال آ جاتا ہے۔ اس خیال کے حوالے سے کہیں کہیں ان سفرناموں میں احساس کمتری کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ ان سفرناموں میں جنس نگاری محض حقیقی اور تہذیبی حوالے سے ہی نظر آتی ہے کیونکہ ان سفرنامہ نگاروں کا مقصد کچھ اور تھا۔ آج کے دور میں دنیا عالمی گاؤں بن چکی ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کی معلومات آنکھ جھپکنے سے پہلے کمپیوٹر پر آجاتی ہیں۔ گذشتہ دور میں جن معدودے چند لوگوں کو سیر کرنے کے مواقع میسر آتے تھے دوسرے لوگ ان سے تقاضا کرتے تھے کہ وہ ان کو بھی ان دنیاؤں کی سیر کروائیں۔ اس لیے اس دور کے سفرنامہ نگار کی کچھ اور مجبوریاں تھیں جو آج کے سفرنامہ نگار سے یکسر مختلف ہیں۔ آج کے سفرنامہ نگار کے ہاں افسانوی انداز کے حامل جنس کے مبالغہ آمیز نمونے اور اپنی ذات کی نمائش نظر آتی ہے جو پہلے سفرناموں میں خال خال ملتی ہے۔ پہلے دور کے سفرنامہ نگار حقیقت کو سادگی سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور ان سفرناموں کو واقعاتی صداقت و ندرت

[illegible] ملتا ہے۔

آج کا قاری سفرنامے کی طرف اس لیے متوجہ ہوتا ہے کہ اس کے لیے سفرنامہ فرحت و مسرت کا باعث [illegible] اس چیز نے بھی آج کے سفرنامہ نگار کو داخلی کیفیات کے بیان میں کافی چھوٹ دے دی ہے۔ اس لیے [illegible] سفرناموں پر افسانوی فضا چھائی نظر آتی ہے۔ اسی طرح بہت سے سفرنامہ نگار [illegible] ہیں، وہ کسی منظر کو دیکھ کر کسی شخصیت سے متاثر ہو کر یا کسی [illegible] خواہ ان کا تعلق جنس کے ساتھ ہو بلا خوف بیان [illegible] زیادہ کرتا ہے جبکہ قدیم سفرنامہ نگار مجبور [illegible] بیان کر کے قاری کو اس ملک کی معاشرت اور تہذیب سے آگاہ [illegible] داخلی جذبات اور کیفیات کو دبا کر خارجی مناظر کا بیان زیادہ کرتا تھا۔ [illegible] قاری کی طلب کا [illegible] رہتا تھا اور وہ قاری کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرتا تھا۔ اس لیے ان سفرناموں میں جنس نگاری کے زیادہ عناصر نہیں ملتے۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ احمد دہلوی، سید، مرتب، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، لاہور: مکتبہ حسن سہیل، سنہ ندارد
۲۔ فیروز الدین، الحاج مولوی، مرتب، فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۷ء
۳۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۱۹۸۷ء، ص ۴۴
۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص ۵۲
۵۔ نصیر حق، "سفرنامہ، فن اور جواز" مشمولہ سہ ماہی الذبیر، سفرنامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶، ۳۷، شمارہ نمبر ۳۔۴۔۱، بہاولپور: اُردو اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴
۶۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اُردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: دریا گنج، ۱۹۹۵ء، ص ۳۲
۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۵۳
۸۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اُردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۲۹
۹۔ شہزاد منظر، "سفرنامہ نگاری، ایک ادبی صنف" مشمولہ سہ ماہی الذبیر، سفرنامہ نمبر، جلد نمبر ۳۷، ۳۶، شمارہ نمبر ۳، ۴، ۱، بہاولپور: اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۶
۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۴۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۱۳۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۴۷
۱۴۔ حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷
۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۰۹
۱۶۔ حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۹
۱۷۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ (مرتبہ تحسین فراقی) لاہور: مکہ بکس، ۱۹۸۳ء، ص ۴۳
۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، "اُردو کا پہلا سفرنامہ عجائبات فرنگ" مشمولہ سہ ماہی، الذبیر، سفرنامہ نمبر، جلد نمبر ۳۷، ۳۶، شمارہ نمبر ۳، ۴، ۱، بہاولپور: اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۳
۱۹۔ حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص ۳۷۔۳۸
۲۰۔ اُردو سفرنامے کی تاریخ کا یہ سرسری جائزہ مندرجہ ذیل ماخذ کی مدد سے لیا گیا۔
(i) حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،
(ii) انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ،
۲۱۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، ص ۱۵۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۴
۲۳۔ ایضاً، ص ۲۰۸۔۲۰۹
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳۸۔۱۳۹
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲۹
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱۸
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۷
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۵۷
۳۰۔ ایضاً، ص ۲۲۷
۳۱۔ کریم خاں، نواب، سیاحت نامہ (مرتبہ عبادت بریلوی) لاہور: ادارۂ ادب و تنقید، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۳
۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۳۳۔ ایضاً، ص ۳۹
۳۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۳۲، ۱۳۳
۳۵۔ احمد خاں، سرسید، مسافران لندن (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۹
۳۶۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۳۲
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۶۱
۳۸۔ بابو لتا شنکر، آئینہ سکندری، دہلی: مطبع محب ہند، ۱۸۸۷ء، ص ۷۳
۳۹۔ عبدالحق موحد، مولوی، سیر برہما، لکھنؤ: مطبع نامی، ۱۸۹۳ء، ص ۲۷
۴۰۔ لالہ بیج ناتھ، انگلینڈ اور انڈیا، میرٹھ: دو یادر پرنٹ پریس، ۱۸۹۷ء، ص ۱۸۴
۴۱۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۸۴
۴۲۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۴۳۔ ایضاً، ص ۱۸۷
۴۴۔ فتح علی خاں، نواب، سیاحت فتح خانی، آگرہ: مفید عام، ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۳
۴۵۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۱۹۳۔۱۹۴
۴۶۔ ایضاً، ص ۷۰
۴۷۔ یعقوب علی عرفانی، مشاہدات عرفانی، لاہور: انقلاب پریس، ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۰
۴۸۔ حسین احمد بیگ، مرزا، پردیس کی باتیں، دکن: شمس الاسلام پریس، ۱۹۳۱ء، ص ۱۱۳
۴۹۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، ص ۲۲۶۔۲۲۷

باب سوم

اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان

۱۹۴۷ء کے بعد

اردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان
۱۹۴۷ء کے بعد

اگر ہم انسان کی تہذیبی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ ایک مرحلہ وار سفر سے عبارت نظر آتی ہے۔ انسان نے اپنی تاریخ کا آغاز غار اور پتھر سے کیا۔ اس سے آگے زرعی ترقی کا سفر تھا۔ انسان ندیوں کے کنارے آباد ہوا۔ پھر یہ صنعتی ترقی کی طرف سفر کرتا نظر آتا ہے۔ بعد ازاں انسان کا سفر خلاؤں کی طرف بھی ہوا گویا انسان کے ارتقا کی ساری کہانی سفر کے گرد گھومتی ہے۔

سفر انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ نئے اور اجنبی دیاروں کی خوشبو ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ہے اور انسان نے نئے نئے وسائل کی تلاش میں ہر دور میں سفر اختیار کیا ہے۔

اردو سفرنامے کے ارتقاء کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابتداء میں سفرنامہ اردو ادب کی مختلف اصناف میں اپنی جھلکیاں دکھاتا رہا ہے البتہ سفرنامے کی ابتدائی شکلیں ہمیں زیادہ دلچسپ نظر نہیں آتیں وہ زیادہ تر خشک اور بے رنگ سفرنامے ہیں جن میں کسی مقام کے جغرافیے محلِ وقوع اور رسوم و رواج کا بیان زیادہ نمایاں تھا اور سفرنامہ نگار کے ذاتی نقطہ نظر یا طرزِ احساس کی خاصی کمی تھی۔

بیسویں صدی عیسوی میں اس صنف نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس کی وجہ اس صنف میں موجود شگفتگی اور افسانوی طرزِ احساس ہے۔ اب یہ ایسی صنفِ ادب ہے جس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی ترقی نے ساری دنیا کو ایک عالمی گاؤں بنا دیا

ہے۔ اس لئے عصرِ حاضر میں سیر و سیاحت کو ایک صنعت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ فاصلے سمٹنے سے اگرچہ اجنبی دیاروں کے بارے میں انسان کے تحیر میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود سفر نامے کی مقبولیت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ سفر نامہ نگاروں نے اپنے مخصوص اسلوب کے ذریعے اس صنف کو دلچسپ اور شگفتہ بنا دیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اگر ہم جنس نگاری کے حوالے سے اردو سفر نامے کے ارتقا کا جائزہ لیں تو پہلا قابلِ ذکر نام محمود نظامی کا ہے جنہوں نے اردو سفر نامے کو ایک موڑ دیا۔ ''نظر نامہ'' میں انہوں نے ان ممالک کے سفر کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں جو انہوں نے یونیسکو کی طرف سے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا تھا۔ ''نظر نامہ'' کو بیسویں صدی کے سفر ناموں میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ ناقدین کے خیال میں یہ سفر نامہ اردو سفر نامے کی تاریخ میں ایک موڑ کی نشاندہی کرتا ہے جہاں سے قدیم اور روایتی سفر نامہ ایک نئے اور جدید دور میں داخل ہوتا ہے اور اُردو سفر نامہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق دکھائی دیتا ہے۔ یہ اُردو ادب کا پہلا ایسا سفر نامہ قرار دیا جاتا ہے جو جدید دور کے فنی اور فکری معیارات پر پورا اترتا ہے۔ محمود نظامی نے اس سفر نامے میں سفر نامہ نگاری کے مروجہ اصولوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے انہوں نے خاص طور پر اپنی پسند کی چیزوں اور شہروں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس سفر نامے کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ مصنف نے ایک سیاح کی نظر سے مختلف مظاہر اور مناظر کو دیکھا ہے ایک سیاح کی نظر میں بے فکری اور آزادہ روی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عام طور پر روایتی سفر ناموں میں مصنف اپنی شخصیت کو پس پردہ رکھتا ہے لیکن محمود نظامی نے اس سفر نامے میں ہر مقام پر اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے اس لیے یہ سفر نامہ سفر نامے سے زیادہ مسافر نامہ دکھائی دیتا ہے۔

سیاحت انسان کے ذہن کو وسعت عطا کرتی ہے اور وہ گروہی، علاقائی اور لسانی تعصبات کے دائرے سے نکل کر دنیا کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے لگتا ہے۔ ''نظر نامہ'' میں بھی سفر نامہ نگار کی وسعتِ قلبی اور بالغ نظری کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خاص طور پر جب وہ مشرق اور مغرب کا تقابل کرتے ہیں تو ان کے نتائج بڑے متوازن اور مدلل ہوتے ہیں۔ ''نظر نامہ'' میں جنس نگاری کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ جہاں کہیں جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں ان کو تہذیبی حوالے سے بیان کیا گیا ہے گویا کہیں افسانوی انداز کے مبالغہ آمیز نمونے نہیں پائے جاتے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس فیصلے کو تقویت اس بات سے پہنچی کہ اس راستہ میں اوپرا کے

نزدیک دو تین مزید بڑے خوفناک مقام آتے تھے۔ بلیوارد کپوسین کے خاتمے پر جو تنگ و تاریک گلیاں بڑے بازار سے کٹ کر دائیں طرف اندر کو چلی گئی ہیں۔ ان کے سایوں میں گھٹیا قسم کی رنڈیاں سرِ شام ہی اپنی یلغار پر نکل آتی ہیں اور اُن کے بے ہودہ اور حیا سوز اشارے اصل بلوارد میں سے گزرتے وقت سوہانِ روح ہو جاتے ہیں۔ ان بھڑ کیلے لباس اور شوخ میک اپ والی مکروہ الہیئت عورتوں کو اپنے شکار کی تلاش میں یوں سرگرداں دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ گو کرۂ ارض پر شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جس میں دنیا کے اس سب سے پرانے پیشے پر انحصار کرنے والی حوا کی بدنصیب بیٹیوں کا وجود نہ ملتا ہو۔ لیکن مغرب میں شاید رنڈی کو عورت کا درجہ بھی حاصل نہیں۔ ہمارے ہاں رنڈی معاشرتی طور پر اچھوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے کوٹھے پر بیٹھتی ہے چونکہ وہ بہرحال عورت ہے اور اس اعتبار سے ایک مخصوص سلوک کی مستحق ہے۔ اس لیے مرد خود چل کر اس تک جاتا ہے۔ مگر مغرب کے اکثر شہروں میں عام قسم کی رنڈی کو عورت کی جنسی توقیر بھی حاصل نہیں۔ اس کا یہ حال ہے کہ وہ خود مرد کے پیچھے دوڑتی ہے۔ اسے بآوازِ بلند للکارتی ہے اور بعض اوقات اس سے اُلجھ بھی جاتی ہے۔ لندن میں تو سوہو کے علاقے کی بعض تاریک گلیوں میں شام کے بعد سورہ یوسف کی آیہ ''وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ'' کی طرف دھیان جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ یہاں اگر کوئی شرمیلا آدمی بھولے سے جا نکلے تو بسا اوقات اس علاقے میں پھرنے والی پریشان اطوار عورتوں کے ہاتھوں اس کا حشر قرآن پاک کے ان الفاظ کے مطابق کس قدر عبرت انگیز ہوتا ہے۔''(۱)

محمود نظامی نے پاکستان اور دوسرے ممالک کے باشندوں کے مجموعی رجحانات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں انہیں قیام کا موقع ملا۔ انہوں نے ان مقامات کے تاریخی پس منظر اور ان کے حال پر موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر وہ قاہرہ، روم، پیرس، لندن اور میکسیکو کے مختلف مقامات کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے تجزیوں میں بڑی حد تک معروضیت پائی جاتی ہے کیونکہ نہ تو مغرب کی چکا چوند ان کی نگاہوں کو خیرہ کر سکی اور نہ ہی ان کی مشرقیت ان کی مغرب شناسی کی راہ میں حائل ہو سکی۔ محمود نظامی کے ہاں تاریخی پس منظر کے حوالے سے جنس نگاری کا حقیقی نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''کوئی زمانہ تھا کہ فرانسیسی مردوں کے لیے عورتوں پر جان دینا زندگی کے کاروبار کا ایک اہم اور لاینفک جزو تھا۔ اس زمانے میں حسین خواتین کی خاطر

> حریفوں سے ڈوئل لڑنا ان کے معتقدات میں شامل تھا۔ اس صدی کے آغاز میں پیرس کی ایک مشہور ایکٹرس، لابیل اوتیرو کی خاطر جواب تک زندہ ہے۔' آٹھ چاہنے والوں نے یکے بعد دیگرے خودکشی کی تھی لیکن اب ان کے لیے عورتوں پر جان دینے کی بجائے پیرس کی تیز رفتار گاڑیوں کے آگے مرنا زیادہ آسان اور عام ہو گیا ہے۔''(۲)

یوسف خاں کمبل پوش کی طرح محمود نظامی نے بھی اپنی تحریر میں اپنی ذات کا عنصر شامل کیا ہے اور انہوں ان اپنے قاری کو وہ سب کچھ دکھانے کی کوشش کی ہے جو خود ان کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ صرف یہی نہیں وہ منظر کا پورا تاثر بھی پڑھنے والے کو منتقل کرنے کا فن جانتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی ذات کو کسی منظر سے خارج نہیں کیا۔ ''نظر نامہ'' سفرنامے سے زیادہ ایک مسافر نامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سفرنامے میں محمود نظامی نے اپنے تجربات و مشاہدات اور محسوسات کو اپنے دلکش اور منفرد اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام واقعات ایک لڑی میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محمود نظامی نے کہیں کہیں بہت دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ ان واقعات کے بیان میں انہوں نے کہیں بھی مبالغہ آمیز جنس نگاری کا سہارا نہیں لیا ہے اور نہ اپنی ذات کی بے جا نمائش ہی کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کسی مقام پر بھی اپنے آپ کو ایسا ہیرو بنا کو پیش نہیں کیا جس کے گرد بہت سی تتلیاں منڈلا رہی ہوں بلکہ انہوں نے بعض ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن کا خیال آتے ہی وہ خود بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ اس کو ہم جنس نگاری کے حقیقی نمونے کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں:

> ''ٹورنٹو کے ایک ہوٹل میں تو مجھے ایسا دلچسپ تجربہ ہوا تھا کہ اس کا خیال آتے ہی میں آج بھی کھسیانا ہو جاتا ہوں۔ کھانے کی میز پر اتفاق سے میرے سامنے ایک کینیڈین خاتون بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں کی کوشش یہ تھی کہ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھیں۔ پہلے تو ہم سمت مخالف میں اپنے اپنے سامنے کی دیواروں کو یوں دیکھتے رہے گویا ان پر کوئی عبارت لکھی ہوئی ہے۔ جس کے ہم ہجے کر رہے ہیں اور پھر یک لخت مجھے خیال آیا کہ ایسی حالت میں کہ اس خاتون کی توجہ سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر ایک اچٹتی ہوئی نظر میں اس کا جائزہ لے لیا جائے غالباً عین اسی موقع پر انہیں بھی خیال آیا ہوگا کہ یہ جو سامنے تین فٹ کے فاصلے پر گھٹے ہوئے سر کا سیاہ فام شخص دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم کرنے میں کیا قباحت ہے کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے مگر جونہی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ہماری نظریں لڑیں اور فوراً ہی ہم دونوں نے جھینپ کر انہیں حسب سابق دیوار

> پر گاڑ دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں بیرا سوپ لے آیا اور آئندہ پانچ منٹ کا وقفہ اس کو چمچے سے حلق میں انڈیلنے میں صرف ہو گیا۔ اتفاق سے میں نے اپنی پلیٹ محترمہ سے ذرا پہلے صاف کر دی تھی۔ بیرا اُسے اٹھانے لگا تو موقعہ کو غنیمت جان کر میں نے پھر جلدی میں سامنے ایک نگاہ ڈالی۔ غالباً مد مقابل کے لئے بھی یہی سنہری موقع اجنبی کو دیکھنے کا تھا۔ چنانچہ ہماری نظریں پھر لڑیں اور پھر حد درجہ خفت کے عالم میں ایک دوسرے سے الگ ہو کر خلا میں اٹک گئیں۔ اس کے بعد دوسرے کورس کے آنے تک جو تین منٹ کا وقفہ گزرا وہ حد درجہ سوہان روح تھا۔ جس عرصے میں وہ خاتون وقت ٹالنے کے لئے مینو پر لکھی ہوئی فہرست طعام کا مطالعہ کرتی رہیں۔ میں کبھی چمچوں کو نیپکن سے صاف کرتا تھا کبھی پلیٹ کو پونچھتا تھا اور کبھی تضیع اوقات کی نیت سے چھری پر لکھے ہوئے حروف کو پڑھتا تھا۔ اور پھر جب کورس ختم ہو رہا تھا تو پانی پیتے میں اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ محترمہ کی توجہ کسی اور طرف ہے۔ شاید انہوں نے جھکتے ہوئے سر کو ایک تیز حرکت سے دوسری طرف موڑا تھا۔ فوراً یہ خیال میرے دل میں بجلی کی طرح کوندا کہ موقعہ غنیمت ہے اور میں نے وہیں گلاس کو ہونٹوں سے لگائے ہوئے ایک نظر ڈرتے ڈرتے محترمہ پر ڈالی لیکن قسمت اب کے بھی یاور نہ تھی۔ خطرے کے کسی غائبانہ اشارے کے ماتحت محترمہ نے پلک جھپکنے میں گردن موڑی۔ ہماری نظریں پھر ملیں اور پانی کا گھونٹ میرے حلق میں سنگ ریزہ بن کر اٹک گیا۔''(۳)

ڈاکٹر محمد باقر کا سفرنامہ ''لاہور سے لندن تک'' ہے۔ اس سفرنامے میں ایسے واقعات پیش کیے گئے ہیں جنہیں قاری آج بھی دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ ان واقعات سے مصنف کی شخصیت کا بالواسطہ طور پر بخوبی اندازہ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

> ''میرے قریب کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے جب (بیئر کی) پہلی بوتل کا کاک اڑایا تو سرسراتی ہوئی جھاگ کو زمین پر گراتے ہوئے اس نے چھلکتی ہوئی بوتل میرے ہاتھ پر رکھ دی اور فرانسیسی میں اسے پینے کی دعوت دی (یہ میرا قیاس ہے) میں نے انگریزی میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پینے سے انکار کر دیا اور اسے بوتل واپس دینا چاہی تو وہ بے حد مصر ہوا میں نے بہت شور مچایا لیکن کوئی پیش نہ چلی۔ میرے ساتھ ہی نشست پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی ـــــ میری اس بیچارگی پر غالباً لڑکی کو ترس آگیا اور اس نے بیئر کی کھلی بوتل میرے ہاتھ سے لے کر فرانسیسی میں جلدی جلدی کچھ

کہتے ہوئے فوجی کو واپس کر دی اور اس طرح مجھے اس پریشانی سے نجات دلا دی۔''(۴)

اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سفرنامہ نگار نے اپنے مشاہدے کو مزے سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ اس طرح اس سفرنامے میں لذت پیدا ہو گئی ہے گویا اس سفرنامے میں رعنائی اور اثر آفرینی کا عنصر غالب ہے جو قاری کو بور نہیں ہونے دیتا۔

''عروسِ نیل'' سلطانہ آصف فیضی کا سفرنامہ ہے۔ یہ مصر کا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں مجلسوں اور دعوتوں کے علاوہ نسوانی تاثرات کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے تہذیبی نمونے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں سلطانہ آصف فیضی نے جزئیات نگاری سے بھی کام لیا ہے۔ سلطانہ آصف فیضی نے مصر کی تہذیب کو دیکھا وہاں کے رسم و رواج لوگوں کی عادات اور آداب محفل کیا تھے۔ وہاں کی تہذیب و معاشرت کا بغور مشاہدہ کیا۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ مصر کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرنے کے لیے کہیں کہیں اُن کی تحریر میں جنس نگاری کے تہذیبی نمونے در آئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''شام کو نہر کے کنارے بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ گرہستن دیہاتن لانبے سیاہ کرتے کو کمر میں گھرس کر اور نیا بچہ بغل میں دبا کے یا پیٹھ پر باندھ کر گرہستی کے کاموں میں مشغول ہے۔ نہر کے مٹیلے پانی میں ٹخنوں ٹخنوں اندر جا کر وہ برتن مانجھ رہی ہیں یا کپڑے دھو رہی ہیں۔ برتن دھونے کے بعد ایک خوبصورت سی صراحی میں وہ اس پانی کو بھر کے گھر کے کام کاج کے لیے لے جائیں گی جس میں کھانا پکے گا اور پینے کے لیے بھی استعمال ہوگا۔ دیہات کی نوجوان لڑکیاں جن کی جوانی ان کے موٹے موٹے فراکوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ آنکھوں میں خوب سا کاجل ڈالے کانوں میں موٹی چاندی کی بالیاں لٹکائے اور گلے میں رنگین موتی کی مالائیں ڈالے درختوں کے سائے میں بیٹھی شام کی بہار کا تماشہ دیکھ رہی ہیں۔''(۵)

قیوم نظر کا سفرنامہ ''پیرس سے روم تک'' ہے۔ اس سفرنامے میں کچھ ایسے مقامات ہیں جہاں سفرنامہ نگار حُسنِ فطرت یا نسوانی حسن کو دیکھتے ہیں تو اس میں محو ہو جاتے ہیں اور ان پر مسرت طاری ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''آنولیدے میں ایر فرانس کی بس میں سوار ہو کر ہوائی اڈے پر پہنچا۔ جہاں کمپنی کی ایک نوجوان لڑکی نے اس انداز سے مسافروں کا خیر مقدم کیا کہ مجھے ان اطالویوں کی خوش اخلاقی اور ان کے حُسن کی دلآویزی کی جی ہی جی میں داد دینا

پڑی۔۔۔ پین امریکن ایرویز میں مَیں نے ایک ایسی ہی ایئر ہوسٹس کو دیکھا تھا۔ یہ لڑکی ''خسرو شریں وہاں تو تھی ہی لیکن ساتھ ہی شاہ شمشاد قداں'' بھی تھی۔۔۔ نہ جانے مجھے اس اطالوی لڑکی میں دلکشی کا کون سا ایسا انوکھا زاویہ نظر آیا کہ مَیں اس سے چند باتیں کرنے کے لیے ٹھہر گیا۔''(۶)

ڈاکٹر ثریا حسین کا سفرنامہ ''پیرس و پارس'' بہت سے سفرناموں کا مجموعہ ہے لیکن ان سب کا محور پیرس ہی ہے اگرچہ اس میں جرمنی، اٹلی، انگلستان اور ایران کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس سفرنامے میں محاکات نگاری کے بھی بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ اس سفرنامے میں مختلف مقامات پر مناظر حسن کے ساتھ ساتھ مصنفہ کا زاویہ نظر بھی تبدیل ہوا ہے۔ اس سفرنامے میں زیادہ معلومات پیرس سے متعلق ہیں چونکہ وہاں پر ان کا قیام زیادہ عرصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین نے یورپ کے بے راہ رو معاشرے پر کڑی تنقید کی ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین مشرقی اقدار کی پاسداری کرنے والی خاتون ہیں۔ جب وہ یورپ میں اخلاقی بے راہ روی، عریانی، فحاشی اور جنسی کجروی دیکھتی ہیں تو پژمردہ ہو جاتی ہیں اور ان کے سفرنامے میں جنس نگاری کا عنصر در آتا ہے۔ اس کی مثال اس اقتباس سے کچھ یوں ملتی ہے کہ:

''ماریسل بلجیم سے آئی ہوئی ایک نوعمر طالب علم تھی جو ہمارے قریب ہی بلجیم ہاؤس میں رہتی تھی۔ خوبصورت اور شگفتہ مزاج۔ وہ بھی ماں بننے والی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ نے بھی شادی سے انکار کر دیا تھا۔ ایک رات میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ سامنے کے ہوسٹل میں لوگوں کا ہجوم ہے۔ ایمبولینس گاڑی آ کر رکی۔ چند منٹ میں یہ خبر عام ہو گئی کہ ماریسل نے پانچویں منزل پر اپنے کمرے کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی ہے۔۔۔ ان کی بیٹی سے اس روز پہلی بار ملاقات ہوئی۔ کاؤنٹ اور کاؤنٹس دونوں اپنی پانچ سالہ نواسی سے کھیلنے میں مصروف تھے۔۔۔ جب میں نے کاؤنٹس سے دریافت کیا ''اس کا باپ بھی آیا ہوا ہے''؟ تو انہوں نے اطمینان سے جواب دیا کہ ''ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری نواسی کا باپ کون ہے؟ نہ ہی ہمیں جاننے کی خواہش ہے۔'' انہوں نے بڑی بے پروائی سے کہا کہ ''خود ہماری بیٹی کو بھی علم نہیں کہ وہ کون تھا؟ اور پھر اطمینان سے دوسری باتیں کرنے لگے۔''(۷)

جمیل الدین عالی نے سفرنامے میں بھی اپنے شاعر ہونے کا احساس دلایا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرنامے ''دنیا میں مرے آگے'' میں فرانس، روس، برطانیہ، لبنان، مصر، ایران اور دہلی اور ''تماشا مرے آگے'' میں امریکہ، جرمنی، اٹلی، سوئیٹزرلینڈ اور ہالینڈ کے سفر کا حال بیان کیا ہے۔ ان کے

نزدیک دنیا کی حیثیت بازیچۂ اطفال سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہیں جہاں کہیں بھی حسن نظر آتا ہے وہ اس سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ وہ کسی ایک مقام پر جمود کا شکار نہیں ہوتے بلکہ حسن کے حظ کو سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"بائیں ہاتھ کے کونے میں ان چار لڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جن کی صحت اور تازگی کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ کر مرزا غالب نے کلکتے میں یہ مصرع فرمایا تھا۔ "طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے۔" (۸)

جمیل الدین عالی قاری کو تاریخی و جغرافیائی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں لیکن وہ کہیں بھی قاری کو بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ سفرنامے کو تفریحی قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے بعض تلخ واقعات کو یوں بیان کیا ہے کہ قاری ان سے بھی حظ اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ منظر دیکھیے جس میں لڑائی کا حال بیان کیا گیا ہے لیکن اس میں بھی ایک خوبصورت خاتون کا تذکرہ کر کے انہوں نے اسے فلمی سین بنا دیا ہے۔ یہ جنس نگاری کا وہ نمونہ ہے جو قاری کو اچنبھے میں ڈال دیتا ہے کہ منہ پر گھونسہ کھا کر بھی بے مزا نہ ہوا اور اُس کے باوجود سفرنامہ نگار کی پوری توجہ خوش شکل خاتون کی طرف ہے بلکہ شاید اسی کی آمد کا کرشمہ ہے کہ سفرنامہ نگار کی مردانہ قوت نے جوش مارا اور وہ مخالف پر پل پڑے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے کوشش کی کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر ٹٹولوں اور ایک نوٹ برآمد کرلوں مگر وہ صاحب کچھ اور سمجھے۔ انہوں نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اوہو! تو آپ کے پاس ریوالور بھی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے میرے شانے والے ہاتھ سے میرے منہ کی سیدھ میں ایک زوردار گھونسہ چلا دیا جو میرے دائیں کلّے کی آخری داڑھ پر پڑا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں خون نگل رہا ہوں۔ شاید میرا احساس یہ تھا کہ میں کوئی مار دھاڑ کی فلم دیکھ رہا ہوں۔ اتنے میں برابر والی گلی سے ایک مضبوط اور خوش شکل خاتون نمودار ہوئیں جوان کا دوسرا گھونسا دیکھ کر چیخنے لگیں۔ "مردار۔۔۔ مردار" ان کی چیخیں بلند ہونے لگیں اور وہ صاحب گھبرا گئے۔ میں نے جلدی سے اپنا فلیٹ ہیٹ منہ کے آگے کیا اور دونوں مٹھیاں ملا کر ایک جوابی گھونسہ مارا جوان کی ناک پر لگا۔ وہ چکرا کر گر گئے اور گرتے ہی اٹھ بھاگے۔" (۹)

بشریٰ رحمان کا سفرنامہ "براہ راست" اٹلی، پیرس، واشنگٹن، کینیڈا اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب و معاشرت کا عکاس ہے۔ بشریٰ نے اپنے افسانوی انداز سے بھرپور فائدہ اٹھایا

ہے۔ اس سفرنامے میں وہ خود بھی خوشگوار موڈ میں نظر آتی ہیں۔ اس سفرنامے میں چٹکلے، شعری لذت اور جذبوں کے تماشوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس سفرنامے میں وہاں کے کلبوں، ہوٹلوں، خصوصاً مغربی تہذیب کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ یورپ کے بازاروں میں رک کر پاکستان کے گلی کوچوں کو ذہن میں دہراتی ہیں۔ وہاں کی خواتین کے حالات و معاملات کا موازنہ پاکستانی عورتوں سے کرتی ہیں۔ بشریٰ نے مغربی خواتین کے بے باک رویوں پر تنقید کی ہے اور وہ دل ہی دل میں اپنی اعلیٰ اقدار پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے علاوہ طنز اور مسکراہٹ کا عنصر بھی غالب ہے۔ انہوں نے جنس کے پردے میں جو بات بھی کی ہے اس میں گہرائی بھی ہے اور تلخی بھی۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"لمبے قد کا گورا ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور پاسپورٹ کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔۔۔ اچانک اس نے اپنی بنٹے جیسی آنکھیں گھما کر پوچھا "کیا آپ کوئی کھانے والی چیز لائی ہیں"؟۔۔۔ لرزتے ہوئے کہا "ہمارے ہاں تو صرف قوم کا غم کھانے کا رواج ہے۔ کبھی ہم اپنی قوم کا غم کھاتے ہیں کبھی آپ کی قوم کا۔" وہ بولے۔ "کوئی پینے کی شے لائی ہیں۔" ہم نے عرض کیا "ہماری شاعری میں تو بس آنکھوں سے پی جاتی ہے۔ ہم آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں نہ چڑھے تو واپس بھیج دیتے ہیں۔"۔۔۔ وہ ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے آسٹریلیا کا گوالا ساہیوال کی گائے کو دیکھتا ہے۔" (۱۰)

سفرنامہ نگار یقیناً ساہیوال کی گائے کی وجۂ شہرت سے آگاہ ہوں گی اور انہوں نے اپنے لیے یہ استعارہ استعمال کر کے نہ کہتے ہوئے بھی اپنے بارے میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ جنس نگاری کے ضمن میں اسے نمائشیت پسندی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارا معاشرہ خواتین کی تحلیلِ نفسی کا متحمل نہیں ہو سکتا ورنہ ہماری بعض خواتین سفرنامہ نگار بھی ایسے کٹ پیس پیش کر جاتی ہیں جن پر ان کی پکڑ ہو سکتی ہے۔

میاں غلام قادر کا "سفرنامہ یورپ" ان کے تفریحی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ اس میں انہوں نے جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ کے لوگوں کے رہن سہن عام مزاج اور طرز معاشرت پر نظر رکھی اور مشاہدات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں جغرافیائی اور تاریخی معلومات کے بجائے زیادہ انسان اور شہر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی جنس نگاری کا عنصر معدوم ہے بلکہ انہوں نے عام مشرقی سیاحوں کی طرح بوالہوسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"خرید و فروخت کے بعد ہم نے کولون کی خوب سیر کی۔ وہاں کا مشہور

عالم گرجا گھر دیکھا۔ عبادت گزار کوئی نہ تھا۔ کیمرے لیے ہر طرف سیلانی بھرے پڑے تھے۔ گرجا گھر کے اونچے ستون دیکھ کر سر چکرا گیا۔۔۔ فائدہ اٹھانے کے لیے یار لوگوں نے نت نئے طریق اختیار کر رکھے ہیں۔ آپ ڈیپارٹمنٹ سٹور کی پارکنگ پلیس میں صرف گاڑی پارک کیجیے تو دو مارک فیس ادا کیجیے اور سٹور کے اندر جا کر تھوڑا بہت سودا خرید یے تو اس صورت میں پارکنگ مفت اور سودا اس پر مستزاد۔۔۔ باہر کی فضا یورپ کے دیگر بڑے شہروں سے مختلف نہ تھی۔ وہی بے پناہ عریانی وہی بے راہ روی۔ وہی جنسی رسالے۔۔۔ راستے میں ہالینڈ کے مشہور عالم ونڈ مِل دوبارہ دیکھے۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ٹیولپس کے پھول بڑے بھلے لگ رہے تھے۔"(۱۱)

ذوالفقار علی کا سفرنامہ "یادِ یارِ مہربان" ان کی نوجوانی کے خوابوں اور رومانی یادوں کا گلدستہ ہے۔ اس میں حسینوں نے سفرنامے کی فضا کو پُر کیف بنا دیا ہے۔ اس سفرنامے میں رعنائی، روانی اور اثر آفرینی نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں سفرنامہ نگار جمالیاتی حس کی آزادی میں بے باک نظر آتے ہیں۔ اس طرح سفرنامے میں کہیں کہیں جنسیت کا عنصر غالب آ جاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"شہر رشت شمالی ایران کے ایک پُر فضا مقام پر آباد ہے۔ یہاں کی عورتیں بے حد حسین و جمیل ہوتی ہیں مگر وہاں کا موسم مردوں کے لیے صحت افزا نہیں اور اکثر کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔۔ رنگ روپ کا شاہکار خانم طیبہ اسی شہر کی باسی ہے۔۔۔ نازک اندام، صنوبر خرام تیکھے تیکھے نقوش اور مسکراہٹ سے مزین باریک گلابی ہونٹ ناک کی تلوار پر مکھی تو مکھی مچھر ایسی ہلکی پھلکی چیز بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑی ملنسار اور خوش خلق۔۔۔ طرہ و رسم میں حدود و قیود کی پاسداری بھی بڑی سختی سے کرتی تھی اور اپنے صاف دامن کو بڑی چابکدستی سے محفوظ رکھتی تھی مگر بعض نئے آنے والے حضرات اس کی ملنساری اور خوش خلقی کو عنایت خسروانہ کا کرشمہ سمجھ کر عرضِ مدعا میں قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ چند دن آہیں بھرنے اور سبک سر ہو کر اپنی وضع بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔"(۱۲)

رام لعل نے سویڈن، ڈنمارک اور لندن کا سفر اپنے دوست کی دعوت پر کیا اور "خواب خواب سفر" کے نام سے سفرنامہ تحریر کیا۔ اس سفرنامے میں انہوں نے زندگی کے بہت دلچسپ واقعات و حادثات خوبصورت پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ ان کے سفرنامے میں جنس کا جو عنصر شامل ہے اس کے ذریعے

انہوں نے یورپ کے ظاہر کے بجائے باطن کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر اس سفرنامے میں ان مسائل کا ذکر زیادہ ملتا ہے جو تارکین وطن کو لاحق ہیں۔ اس سفرنامے میں ایک کہانی پن کا انداز ملتا ہے۔ رام لعل نے پورے یورپی معاشرے اور بالخصوص تارکین وطن کی زندگی کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں جنس کا حقیقی پہلو نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"نیرا اب میرے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے لگی۔ میں نے پوچھا" تم شادی کب کرو گی"؟ ہنس کر بولی" جب بھی موقعہ مل جائے!" "کسی ہندوستانی کے ساتھ"؟ ــــ "نہیں انکل کسی بھی غیر ملکی کے ساتھ کر لوں گی" ــــ "ہندوستانی سے کیوں نہیں"؟ اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اس کی آنکھیں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں پھر گلاس رکھ کر بولی ــــ "ہندوستانی لڑکے بڑے بیوقوف ہوتے ہیں۔ وہ خود تو آزادی چاہتے ہیں۔ لڑکیوں سے ملتے بھی رہتے ہیں لیکن شادی کرنے کے لیے چھوٹی لڑکیوں کے متمنی رہتے ہیں جو یہاں تو ملنے سے رہیں۔ ہندوستان جا کر بھلے ہی ڈھونڈ کر لے آئیں" ــــ تم بھی تو ہندوستان سے کسی کو پھانس کر لے آ سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے ماں باپ یہ کوشش کریں" ــــ بولی "مائی فٹ! وہاں سے کوئی آٹھواں درجہ پاس بدھو ہی تو مل پائے گا۔ ایڈجسٹمنٹ کیسے ہو پائے گی؟ یہاں عمر، نسل، رنگ ہر چیز بھول کر اپنا لائف پارٹنر ڈھونڈنا پڑتا ہے" ــــ پھر اس کو پیچھے سے آ کر کسی گورے رنگ کے لڑکے نے بانہوں میں بھر لیا ــــ وہ مسکرا دی "ابھی تم آ گئے!"(۱۳)

"مجھے ایک بوڑھے کے پاس بیٹھا دیکھ کر اچانک ایک خوشنما چہرے والی نرس آ گئی جس کا نام ٹونے تھا۔ وہ اس بوڑھے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی اور مسکرانے لگی۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔ "ایسے خوشنما چہروں کو دیکھ کر آپ کیسا محسوس کرتے ہیں"؟ یہ سن کر اس نے لڑکی کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "اچھا لگتا ہے۔ خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن بے چینی بھی کہ اس دنیا میں اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"(۱۴)

"سترو گا" بلدیو مرزا کا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی ان کا جمالیاتی ذوق عروج پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے خوشنما واقعات کو خود حظ اٹھا کر بیان کیا ہے اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ قاری بھی ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ ان کو جہاں بھی خوشنما چہرہ نظر آتا ہے، کھل اٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''صرف دو گھنٹے میں شعرا کا قافلہ بذریعہ ہوائی جہاز اوٹریڈ ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔ وہاں شعرا کے استقبال کے لیے بے شمار مقدونی دوشیزائیں اپنے روایتی لباس میں بجی سنوری ایک ہجوم کی شکل میں موجود تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگے پھول تھے۔ ایک دوشیزہ نے آگے بڑھ کر مجھے سرخ رنگ کا کوئی پھول پیش کیا۔۔۔ ''وہ دیکھو یوزو سامنے کھڑا ہے'' ستیانت کانت بولے۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا سامان اٹھاتا یوزو بولا۔ ''ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔ سامنے کھڑی ایک خاتون کے پاس گیا اور اس کے ہاتھوں سے دو پیکٹ لے کر میرے ہاتھوں میں تھما دیے۔ ان پیکٹوں میں سے ایک میں وہاں کی تازہ مطبوعات تھیں اور دوسرے میں بیئر کی دو بوتلیں۔'' (۱۵)

اسلم کمال کا ایک سفرنامہ ''لاہور سے چین تک'' اور دوسرا ''اسلم کمال اوسلو میں'' ہے۔ ان سفرناموں میں انہوں نے اپنے مصور، خطاط، شاعر اور خصوصاً جمال پسند ہونے کا ثبوت ہر جگہ دیا ہے خاص طور پر ان کے سفرنامے ''اسلم کمال اوسلو میں'' کے متعدد مقامات پر ان کی حسن پرستی بھی عیاں ہوتی ہے۔ انہوں نے بعض واقعات کو بیباکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اکثر مقامات پر خودنمائی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ بہر حال انہوں نے واقعات کو بڑا حظ اٹھا کر بیان کیا ہے اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ قاری کے ذہن میں بھی اس تصویر کا نقش بن سکے اور وہ بھی ان واقعات سے محظوظ ہو سکے۔ مثال کے طور پر یہ چند اقتباسات دیکھیے:

''سینڈوچ اور کافی کا مزہ موسلا دھار بارش میں ایک خوبصورت چھوٹی سی گاڑی کے اندر بیٹھ کر کچھ زیادہ ہی آیا۔ میں نے سگریٹ نکالا اور ماتھی سے یہ کہتے ہوئے کہ اگر تم برا نہ مانو تو میں اسے سلگا لوں۔ اس کا جواب سننے سے پہلے ہی میں نے سلگا لیا اور ایک شاندار کش لے کر دھواں چھوڑ دیا۔ جس پر ماتھی نے بہت ہی خوفناک شکل بناتے ہوئے کہا۔ یہ بری بات ہے۔ آداب کے بالکل خلاف۔ تم نے اچھا نہیں کیا ادھر کرو سگریٹ کا پیکٹ۔ اور اس نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ نکالا اپنے ہونٹوں میں دبایا اور میں نے لائٹر روشن کر کے شعلہ اس کے سگریٹ کے قریب کیا تو اس شعلے کا عکس اس کے رخساروں میں بھی تھا۔ اس کی پیشانی میں بھی تھا۔'' (۱۶)

''اچھا تو یہ ہے ننگوں کا ساحل ——— مگر یہاں تو کوئی ننگا نہیں ہے۔ وہ جو کچھ فاصلے پر پندرہ بیس نفوس بیٹھے ہیں، سب کے سب گاؤن نما لبادے اوڑھے ایک دوسرے میں یوں گھس کر بیٹھتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ خواتین کتنی اور حضرات کتنے

ہیں۔ اور یہ صورتحال ستر پوشی کا بہترین ثبوت ہے۔ میں نے کہا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ماتھی مسکرا دی اور کہنے لگی۔ اصل میں اب موسم نہیں رہا۔ موسم گرما کا آغاز ناروے میں یکم مئی سے ہوتا ہے اور مئی کے مہینے کا ہر ایک دن پبلک ہالیڈے ہوتا ہے۔ نارویجن دیوانہ وار جنگلوں پارکوں اور بیچوں جھیلوں اور سمندر کے ساحلوں پر نکل دوڑتے ہیں۔ آج تم دیکھ رہے ہو کہ دھوپ نکلتی ہے اور غائب ہوتی ہے۔ یہ جو پندرہ بیس لوگ تم دیکھ رہے ہو یہ دراصل دھوپ کے عشق میں حد سے گزرے ہوئے دیوانے ہیں۔ بادلوں کے ٹکڑوں میں کھلتے اور بند ہوتے ہوئے خلا دھوپ کے ان شیدائیوں کے لئے امید کے دروازے کھلے رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی دھوپ نکلے گی۔ یہ اپنے لبادوں سے نکل آئیں گے۔ دھوپ جائے گی تو یہ بھی لبادوں میں واپس لوٹ آئیں گے۔ ایک طرح سے مسلسل دھوپ کی نسبت اگر دھوپ تھوڑے وقفے سے آتی اور جاتی رہے تو یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل بہت زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ماتھی کو میں نے سگریٹ پیش کیا۔ اس نے لائٹر روشن کر کے میرا اور اپنا سگریٹ سلگایا۔۔۔ میں فطرت کی کرشمہ کاریوں میں محو تھا کہ ماتھی نے انگلی سے اشارہ کر کے لبادے اتارتے ہوئے انسانوں کی طرف مجھے متوجہ کیا میں نے دیکھا ایک مرد خوشی سے پھولا نہ سما کر چھلانگیں مارتا ہوا پانی کی واپس اترتی لہر تک گیا۔ اسے پاؤں لگا کر اسی تیزی سے واپس آیا اور ایک جوان عورت نے خوشی سے دو تین بار اپنے پاؤں پر گھوم کر پانی کو چھو کر آنے والے کی پیٹھ پر ایک دولتی جھاڑی اور ایک بیٹھے ہوئے قدرے بوڑھے مرد کا سر اپنی رانوں میں لے کر اس کے شانوں پر بیٹھ گئی۔ باقی خواتین و حضرات میں سے کوئی پیٹ کے بل اور کوئی پیٹھ کے بل لیٹ گیا۔ کوئی اکڑوں بیٹھ گیا کوئی چہل قدمی کرنے لگا۔ الغرض دھوپ کی غیر حاضری میں جتنے بھی کام بند تھے اب سرانجام پانے لگے تھے۔

حیران و پریشان میں سوچنے لگا کہ انسان پانی سے پیدا ہو کر ساحل پر رینگ رہا ہے۔ جنگل کی طرف یا جنگل میں اپنے ارتقاء کے پہلے درخت سے کود کر ساحل پر پانی پینے آنکلا ہے۔ میں پندرہ بیس نفوس کی اس کلبلاہٹ پر متحیر تھا کہ مجھے ماتھی کی ہنسی کی آواز آئی۔ شاید وہ مجھ پر ہنس رہی ہے کہ میں اتنے غور سے آخر کیا دیکھ رہا ہوں۔ اس کی ہنسی کی آواز پھر آئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھ پر ہی ہنس رہی ہے کہ میں کس انہماک سے انسانی گراوٹ کے اس نظارے میں محو ہوں۔ اس کی ہنسی کی آواز

تیسری بار آئی تو میں قدرے چونک گیا کیونکہ اب کے اس کی ہنسی میں شرارت کی شوخی کی کھنک تھی۔ اور توجہ طلبی کی چمک کے ساتھ دعوت نظارہ کی لپک بھی تھی۔ میں نے تھوڑا سا گھوم کر دیکھا تو ماتھی کے جاگرز نظر آئے۔ خود غائب تھی۔ وہ کہاں گئی۔ یہ دیکھنے کے لیے میں پورا گھوما تو ماتھی ریت پر سورج کے سامنے پشت کے بل دراز تھی۔ اپنے سر کے نیچے اپنی پینٹ اور قمیض کا تکیہ بنا کر ــــ میں نے اسے پاؤں سے لے کر سر تک دیکھا وہ ساحل کی ریت پر مثل ایک آئینہ کے تھی جس میں دیکھنے کی تاب نہ لاکر۔ شرما کے دھوپ لوٹ گئی آفتاب میں۔" (۱۷)

اسلم کمال کے ہاں سفرنامے میں کہیں کہیں کہانی کا انداز نظر آتا ہے۔ وہ مغربی خواتین کے ساتھ ہر مقام پر بہت رچ بس جاتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان کوئی پردہ بھی حائل نظر نہیں آتا۔ انہوں نے سفرنامے میں ہر مقام پر اپنے مصور ہونے کا احساس دلایا ہے بلکہ ناروے میں وہ جن خواتین سے ملتے ہیں وہ خواتین عریاں ہوکر اپنے پوز بنوانے میں فخر محسوس کرتی ہیں اور اسلم کمال نے بھی آزادہ روی کے ساتھ کمبل پوش کی طرح ہر بات وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"میں نے سگریٹ سلگایا اور حواس کو مربوط کرنے کے لیے باقاعدہ کوشش کرنے لگا اور اس کیفیت کو چھپانے کے لیے میں نے اٹھ کر ایزل تھوڑا ادھر اُدھر کیا۔ کاغذ کا رول کھول کر اس کو ڈرائنگ بورڈ پر سکارچ ٹیپ سے چسپاں کیا۔ ربڑ نکال کر ڈرائنگ بورڈ کے قریب رکھ دیا۔ چارکول کی قلم کو چاقو سے تراش کر پوائنٹ بنایا۔ میری نگاہ ایسے ہی گبریلہ کی طرف اٹھی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ میں محض اسکے جواب میں مسکرا دیا۔ جس کو وہ میری طرف سے تیاری کا اشارہ سمجھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے جوڑا کھول کر بالوں کو شانوں پر جھٹک دیا۔ وہ سپارٹ لائٹ کی طرف بڑھی۔ اس کو آن کیا۔ میں نے چاہا کہ اسے کہوں کہ رک جائے۔ مگر میری آواز میرے حلق سے نہ نکل سکی۔ اتنے میں وہ پوز بنانے کی جگہ پر پہنچ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ایک ادائے دلبری سے مسکرائی اور نہایت پر اعتماد لہجے میں بولی "میں اپنے آپ کو برائے فن بے نقاب کرتی ہوں۔" میں نے پھر اسے روکنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی اس نے گاؤن اتار کر صوفے پر پھینک دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے روبز کے کینوس سے اندر آمیدہ نکل آئی ہو۔" (۱۸)

"وہ بیئر پیتی ہوئی ایزل پر اپنا خاکہ کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر پوچھنے لگی۔ تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اوسلو آنے سے پہلے نیوڈ سٹڈی کا تمھارا کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں نے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں نیوڈ ماڈل کا تصور بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر اسے کچھ جیسے یاد آیا وہ یکدم اٹھی اور اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد لوٹی تو مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔ یہ میرا نیوڈ فوٹوگراف اسی پوز میں تقریباً اسی جگہ پر دو سال پہلے پال نے بنایا تھا۔۔۔ مشرق و مغرب میں حسن اور حسن پرستی کی جدا جدا روایات ہیں۔ مغرب میں جس پیکر حسن کے دست و بازو نہیں اور دھڑ پر سر نہیں ہے مشرق میں اس پیکر حسن کے قدموں میں اہل دل اپنے اپنے سر اُتار کر رکھ دیتے ہیں۔" (۱۹)

اسلم کمال کے ہاں مغربی زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویریں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے اس ماحول کو محسوس کیا اور اس کو قاری تک پہنچانے کی سعی بھی کی ہے۔ انہوں نے خصوصاً ناروے کی تہذیب و ثقافت کو بے باکی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے وہاں کی زندگی کو بھی ایک مصور اور فن کار کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسلم کمال کے ہاں کہیں کہیں جنس کے حقیقی نمونے بھی ملتے ہیں کیونکہ بعض مقامات پر انہوں نے اوسلو کی تہذیب و ثقافت کے خد و خال اس طرح اجاگر کیے ہیں کہ قاری انہیں پڑھ کر چونک اٹھتا ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ جنس زدہ سوسائٹی ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں:

"کھاری ابھیمر واقعی تمہارا شوہر نہیں ہے؟
نہیں بالکل نہیں۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔ کھاری نے شانے اچکا کر کہا۔
لیکن تمھاری بچی کا پھر باپ کون ہے۔؟
تم اوسلو میں رہنا چاہتے ہو؟ کھاری نے ہونٹ سکیڑ کر دیدے مٹکا کر پوچھا تم شرارت پر تلی بیٹھی ہو۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے کی ٹھنڈک چہروں کو سُن کرتی گزر گئی۔ جنرل سٹور والا پاکستانی جا چکا تھا۔ اس کے سٹور کے سامنے دو تین آوارہ نوجوان بیٹھے ہوئے نشہ کر رہے تھے۔ ان سے تھوڑی آگے اندھیرے میں کھڑی ایک ٹاروینجن آوارہ سی لڑکی جیسے گھات لگا کر کھڑی تھی۔ کھاری نے ایک لفافہ نکال کر چاک کیا۔ جس میں خشک میوے تھے۔ جو ہم کھاتے ہوئے بڑی سڑک کی طرف چلنے لگے۔ میں نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں لیا تو کھاری نے اسے اپنے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔ میرا سگریٹ سلگ

اٹھا تو ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک پتہ کھاری کی گردن اور کوٹ کے کالر میں آکر اٹک گیا۔ کھاری ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر سنبھل گئی۔ میں نے وہ پتہ اٹھا کر ہوا میں چھوڑ دیا۔ ایک ٹیکسی دیکھ کر میں نے ارشارے سے روک لی۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے میں نے کہا۔ چلو نیشنل تھیٹر کی طرف۔ تمہیں اوسلو پسند آگیا ہے تو تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ ہمیبر کی طرح؟ میں نے اسی لہجے میں سوال واپس لوٹا دیا۔

نیلس آندرسن کی طرح۔ کھاری نے جواب دیا۔

یہ شریف آدمی کون ہے؟ میں نے پوچھا۔

مجھے اس سے بے حد محبت ہے۔ تیز نیلی آنکھوں والے سے تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں پہلی بار ڈیٹ کیا تھا۔ سٹور تنگ گاتا میں ہم کافی پینے ایک کیفے میں گئے تھے۔ ساتھ کی میز پر میں نے ایک نیلی آنکھوں والے سے پیار کیا تھا۔ وہی ہے نیلس آندرسن میری بچی کا باپ۔

نیشنل تھیٹر آگیا۔ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل چلتے ہوئے میں نے کہا۔ ہاں ہاں مجھے یاد آیا۔۔۔ اچھا تو وہ ہے تمہاری بچی کا باپ لیکن تم ہمیبر کی بجائے اس کے ساتھ کیوں نہیں رہتی ہو۔

میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور وہ بھی یقیناً میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ ہمارے درمیان جنسی ذوق کا اختلاف ہے۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے سڑک پر گرے ہوئے کچھ پتوں کو اڑا کر کچھ فاصلے پر ہم سے آگے پھر گرا دیا۔ سڑک پر بجلی کے کھمبے کے قریب روشنی کے دائرے میں رک کر میں نے کھاری کو متوجہ کر کے پوچھا۔ کیا تم اس سے طلاق لے چکی ہو۔ طلاق کیوں لیتی۔ ہم نے شادی ہی کب کی تھی۔ کھاری نے بے نیازی سے کہا۔ بہت سارے جھونکے ہوا کے مختلف سمتوں سے آکر جیسے میرے چہرے کے اردگرد آپس میں الجھنے لگے تھے۔ بہت ساری آوازوں کا شور میرے کانوں میں تھا اور بچی؟ میں نے تقریباً ٹھٹھرتے ہوئے پوچھا۔ میں ایک کنواری ماں ہوں۔"(۴۰)

بیگم اختر ریاض الدین نے دو سفرنامے قلمبند کیے ہیں "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے اردو ادب کی تاریخ میں ایک عمدہ اضافہ ہیں۔ انہوں نے اپنے احساسات اور مناظر میں گم ہو کر سفرنامے لکھے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں رومانی طرزِ فکر بھی نظر آتا

ہے۔ انہوں نے ٹوکیو، ماسکو، لینن گراڈ، نیپلز، قاہرہ، لندن، نیویارک، جزائر، ہوائی، میکسیکو اور ہانگ کانگ بھی کی سیر کی۔ انہوں نے کسی بھی مقام کو سطحی نظر سے نہیں دیکھا۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے وہاں کے کلبوں اور ہوٹلوں کا ذکر بھی بے باکی سے کیا ہے۔ ان ممالک کی تہذیب و ثقافت کو بھی عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ جیسے دیکھا اسے ویسے ہی بیان کر دیا کہیں بھی کچھ چھپانے کی یا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

"ایک نحیف اور ضعیف انگریز اپنی جھلملاتی جھریوں اور کانپتے ہاتھوں سے ایک گرم گرم رومان پڑھ رہا تھا 'عنوان تھا' "الوداع میری محبوبہ" یہ کتاب اسے بیس سال پہلے پڑھ لینی چاہیے تھی۔ ایک رعشہ بر اندام اسی سال کا سوئس پردادا لڑکھڑاتا پھرتا تھا۔ اسے صرف جرمن زبان آتی تھی اور اپنی بہو کی ترجمانی کے طفیل ہر ایک سے گفت و شنید کرتا تھا۔ غریب نے ہر زاویے سے میرے فوٹو کھینچے مگر ایک بھی اچھا نہ اترا کیونکہ اس کے لرزاں ہاتھوں کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ مجھے فوٹو میں لرزہ چڑھ رہا ہے۔ ایک فوٹو کے لیے جو گھٹنوں کے بل بیٹھا تو معلوم لڑھک گیا بمشکل اس کی بہو نے اور میں نے مل کر اٹھایا۔ ایک اور ستر سال کا لذیذہ کھوسٹ اپنی جوان بیوی کے ساتھ سنگاپور کا پیسہ کما کر دنیا کی سیر پر نکلا ہوا تھا۔ موٹاپے بڑھاپے کی وجہ سے ڈانس ہوتا نہیں تھا۔ ہانپ ہانپ کر ایک ہی جگہ کھڑے ڈانس کرتا تھا اور بیوی کی نظر بچتے ہی اوروں پر نظر ڈالنا شروع کر دیتا تھا۔"(۴۱)

"شام سے پہلے اسٹاف کو بھی چھٹی مل گئی۔ یہ سفید سوٹوں میں جواں سال لڑکے ہنستے 'گنگناتے' جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے نکلے۔ بجائے لہروں کے ان کی نظریں لڑکیوں پر تھیں۔ ایک دو سفید چڑیاں ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ فوراً ان کے ساتھ ہمقدم ہو گئیں۔ جوانی 'موقعہ اور جہاز ایک وقت میں ہم کنار ہوئے تھے۔"(۴۲)

بیگم اختر ریاض الدین کا اندازِ تحریر بے تکلفانہ اور شگفتہ ہے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی رنگینی و رعنائی' لطافت و روانی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے محسوسات کو بڑے فن کارانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ مختلف ممالک کی تہذیبی زندگی کی بہت سی جزئیات کو انہوں نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریر میں ایسی شوخی بے باکی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات بھی معصومیت اور ملائمت سے کہہ جاتی ہیں۔ انہوں نے دنیا کو ایک بالغ نظر سیاح کی نظر سے دیکھا ہے انہوں نے ان ممالک کے ازدواجی اور دیگر سماجی مسائل کو بھی صفحۂ قرطاس پر رقم کیا

ہے۔ بعض ممالک کے لباس ان کے قریب محض دھوکا ہیں لیکن کسی بھی مقام پر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ انہوں نے ایسے واقعات اور مسائل کا ذکر محض حظ اندوزی کے نقطہ نظر سے کیا ہے بلکہ اس سے ان کی وسعت معلومات، گہری تجزیاتی بصیرت اور منظر نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ چند اقتباسات دیکھیے:

''انسان یہاں اپنی عمر بھول جاتا ہے۔ سارے وقت جواں سال طبقہ کھیل تفریح کے نئے نئے ڈھنگ نکالتا رہتا ہے اور ہر کھیل کے لیے نئے نئے لباس تراشتا ہے۔ پیراکی کے لیے تو لباس کا نام لینا ہی غلط ہوگا۔ لڑکے نامعلوم سی لنگوٹی یا چڈی اور لڑکیاں دو کترنیں محض تکلفاً پہنتی تھیں۔''(۴۳)

''گھر میں اسی کا راج ہوتا ہے۔ خاوند کی کم چلتی ہے مردوں کو اس عورت کے خلاف شکایات ہیں کہ وہ بہک گئی ہے۔ امریکہ کی روایتی خانگی پاک دامنی پر بدھ ہے۔ خاندانی امن پر سایہ ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی سے یہ جنسی آزادی چکھ لیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔''(۴۴)

بیگم اختر ریاض الدین کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے بعض سفرنامہ نگاروں کی طرح مبالغہ سے ہرگز کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی مقام پر اپنی ذات کی نمائش کی کوشش کی ہے، انہوں نے یورپ اور دیگر مختلف ممالک کی سیر کی ہے۔ ان کو بعض ممالک میں عورت کا تجارتی اور فحش استعمال بہت کھٹکتا ہے۔ انہیں خصوصاً یورپ کی شبانہ زندگی کی عریانیاں دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ کسی صدی میں عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا جتنا۔۔۔؟ انہوں نے وہاں کی معاشرت کے بھی بعض پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔ انہوں نے اس کی تفصیلات بھی بڑی بے تکلفی سے بیان کی ہیں۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

''یہ گیشا کیا بلا ہے؟ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا اور دو تین کتابیں پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ گیشا ایک نہایت اعلیٰ شائستہ، مہذب اور ہنر مند طوائف ہے اور یہ توابی پیشہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود جاپانی معاشرہ، گیشاؤں کی تربیت میں کئی کئی سال لگتے ہیں اور انہیں گانا، بجانا، ناچنا، بامذاق گفتگو، حاضر جوابی لطیفے، پہیلیاں، کھیل، چہلیں اور کئی قسم کے فنون لطیفہ سکھائے جاتے ہیں، تاکہ شام کو مردوں کو تفریح مہیا کر سکیں، گیشا کو مرد کی رگ رگ سے واقف کیا جاتا ہے کہ کس طرح اسے بہلاتے ہیں اس کے دماغی اور جسمانی

بوجھ بٹاتے ہیں، کس طرح ناز نخرے اور پیار سے شراب پلاتے اور کھانا کھلاتے ہیں۔ عموماً کاروباری دعوتیں گیشا خانوں میں دی جاتی ہیں اور لاکھوں کروڑوں کے کاروباری معاملوں کے فیصلے بھی ان ہی رنگین محفلوں میں کیے جاتے ہیں، لیکن ایسی تفریحات کے علاوہ ٹکٹ میں اور کچھ شامل نہیں ہے۔ رات گزارنے کے لیے بہت بھاری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس لیے عموماً مرد ناچ گانے کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ عام سستی طوائفیں بھی ہیں اور ان سب کے لیے اکثر الگ علاقے مخصوص ہیں، گیشا کی طرح ان طوائفوں کا بھی ایک اپنا پرائیویٹ محکمہ یا یونین ہوتا ہے، ہر گاہک سے ایک معاہدہ کیا جاتا ہے اور کوئی مرد کسی طوائف کو مصیبت میں ڈال کر بھاگ نہیں سکتا۔ اگر طوائف کے یہاں بچہ پیدا ہو جائے تو اس مرد کو اس کا خرچ دینا ہوتا، یا بچہ سنبھالنا پڑتا ہے۔ گیشا کے پاس رات گزارنے کے لیے باقاعدہ ایک عہد نامہ بھرنا پڑتا ہے اور اگر گیشا کے یہاں بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی پرورش وہی مرد کرے گا، یا اس بچہ اور خود گیشا کو گھر لے آئے گا اور یہ ناجائز بچہ گھر کی بیوی کو ماں کہے گا اور سمجھے گا اور گیشا ایک گورنس کی حیثیت سے گھر میں رہے گی۔ بظاہر یہ قاعدہ انسانیت پر مبنی ہے، جس نے کم از کم پیشہ ور عورتوں کے حقوق تو محفوظ کر دیے۔ پھر گیشاؤں کی بھی ذاتیں ہوتی ہیں، اچھی گیشا اور بُری گیشا، اچھی گیشا (اوبی) (OB1) پیچھے باندھتی ہے اور بُری گیشا سامنے۔''(۴۵)

''جاپانی مرد کا چہرہ جاپانی عورت کے مقابلہ میں ستا ہوا ہے مثلاً اگر عورت کا چہرہ ۵ سیر کا گلابی گوشت ہے تو مردانہ مکھڑا پونے چار سیر کا، عورت وہاں کی بے تحاشا پلی ہوئی ہے۔ اب فیشن میں نوعمر لڑکیوں نے کمر پتلی کرنی شروع کر دی ہے لیکن پھر بھی اوسط چہرہ بھاری طباق اور ٹانگیں سندھی پلنگ کے پائے، کیمونو تو عیب پوشی کر سکتا تھا، یہ موٹی سکرٹ تو خود اپنی ٹانگ کھولے اور لاجوں بھی نہ مرے۔ قوم کی صحت عموماً بہت دمکتی چمکتی ہوئی نظر آئی، مرد تو زرد نظر آ بھی جاتے ہیں، عورتیں خاصی گوری، خاص طور پر جوان لڑکیوں کے گال سرخ سیب کی مانند دہکتے ہوئے اکثریت کو تو ہلکی گلابی لپ اسٹک کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، ان کے سرد موسم اپریل میں ہمارے دسمبر کی سردی تھی اور کچی مچھلی کی خوراک کو ان کی جوانی، صحت اور جنس کا راز بتایا جاتا ہے۔ مشرق بعید میں ویسے بھی عورت کا پچاس سال تک جوان رہنا بعید از امکان نہیں۔ اس خطے کے پانی میں نرمی، ہوا میں لوچ، عورت کی رنگت میں صباحت اور جلد میں ملائی کی سی

چکنائی ہے۔"(۴۶)

محمد کاظم کا سفرنامہ "مغربی جرمنی میں ایک برس" رسالہ فنون میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ یہ سفرنامہ مصنف کی ذاتی زندگی کی زیادہ عکاسی کرتا ہے وہ جرمنی حصول علم کے لیے گئے تھے۔ اس میں ان کی سفری داستان بھی ہے اور کچھ کردار بھی۔ اس سفرنامے میں انہوں نے اپنے ہم جماعت لڑکوں اور خصوصاً لڑکیوں کے کرداروں کو دلنشیں طریقے سے پیش کیا ہے۔ سفرنامہ نگار نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اس سفرنامے میں جھوٹ اور خیال آرائی کا عیب نہیں ہے۔ سفرنامے کے مطالعے کے دوران میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ صداقت نگاری میں فحاشی راہ پا گئی ہے۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں سستی لذتیت کا عنصر غالب ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"آج وہ میرے ساتھ پڑھتے ہوئے میرے اتنا قریب لگ کر بیٹھ گئی کہ مس کرتے ہوئے جسموں کی حرارت سے رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا اور مجھے اپنا چہرہ سرخ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے بعد ہماری توجہ پڑھائی میں جمی نہ رہ سکی اور ہم نے کتابیں اور کاپیاں بند کر دیں"۔۔۔ ایک بار میڈشن بیئر کے بھرے ہوئے پانچ پانچ بڑے مگ ایک ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسائے ایک ہی پھیرے میں دس آدمیوں کی سیرابی کا سامان مہیا کر رہی تھی۔ "یہ سینے کے لیے بہت اچھی ورزش ہے۔" میرے سامنے دائیں کو بیٹھا ایک ادھیڑ عمر جرمن آگے جھک کر رازداری کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔ "ان کے سینے دیکھے ہیں"؟! نے دونوں ہاتھوں سے ایک گولائی بنائی اور پھر ہی ہی کر کے ہنسنے لگا۔۔۔ "تم مجھ سے پوچھو۔ تندرستی اور خوبصورتی میں بواریا کی لڑکی نمبر ایک"! وہ انگوٹھا کھڑا کر کے کہنے لگا "تم میری بات کا یقین کرو۔ میں نے سارے علاقے دیکھے ہوئے ہیں۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے۔" اور پھر مزید سرگوشی کے انداز میں۔ "انڈزی دولن آس مٹ ماخن" اور وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوتی ہے۔"(۴۷)

پروین عاطف کا سفرنامہ "کرن۔ تتلی بگولے" ہے۔ انہوں نے بنکاک 'منیلا' ہانگ کانگ' سری نگر' ٹوکیو' کیلاش اور نیروبی کی سیر کی اور جو کچھ بھی اپنی آنکھ سے دیکھا اس کو قاری تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کے چمکیلے ظاہر کا بدنما باطن دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کو مزے سے بیان کیا ہے۔ پروین عاطف نے مناظر کی معرفت شہروں اور ملکوں کے مزاج کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ ماحول اور اس کے اثرات دکھائے ہیں۔ بنکاک عریانی کا اڈا ہے۔ پروین

نے بڑی بے باکی کے ساتھ حقائق کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے حقیقت کو چھپانے کی ہرگز کوشش نہیں کی بلکہ اسے عریاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی نمونے پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"اس رات بنکاک کے اس وسیع و عریض بازار میں کسی کا کوئی چہرہ نہیں تھا۔ کوئی ذہن نہیں تھا۔ کوئی روح نہیں تھی۔ صرف جسم تھے۔ ننگے جسم۔ بھوکے جسم۔ چپ جسم۔ بولتے جسم۔ مشتاق جسم۔ بیزار جسم۔ بس جسم ہی جسم۔ عورت کے جسم کی اتنی بڑی اکبری منڈی۔۔۔ ڈالر کی چاٹ نے اگر اسے جسم کو یوں کھلے بندوں چھابڑی میں لگانے پر مجبور کر دیا ہے تو ڈالر زندہ باد!"(۴۸)

محمد طفیل نے اپنا سفرنامہ "مسافرانہ" یورپ (اٹلی' جرمنی' برطانیہ) میں روزنامچے کی شکل میں تحریر کیا تھا۔ سفرنامہ نگار پر وہاں کے مناظر دیکھ کر جو کیفیت طاری ہوئی اس میں بھی ایک لذت موجود ہے جس کو پڑھ کر قاری حظ اٹھاتا ہے اس سفر میں ان کے فرزند جاوید طفیل بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے مغرب کی عریانیوں کا تذکرہ بلا جھجک کیا ہے۔ انہوں نے وہاں کے نسوانی حسن اور جنسی مناظر کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے لیکن جب انہیں وہاں اپنے وطن کی یاد آتی ہے تو وہ اداس سے ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے حقیقت نگاری کے لیے جنس کا سہارا لیا ہے اور وہاں جو کچھ بھی دیکھا ہے بالکل اسی طرح اس کو بیان کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ منظر دیکھیے:

"جھیل کے کنارے ایک جگہ بہت دور تک جھیل کے اندر جاتی تھی۔ اندر جانے کا ٹکٹ تھا۔ ہم نے ٹکٹ لیے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ یہاں مرد و زن تقریباً برہنہ حالت میں لیٹے ہوئے ہیں۔ بیٹھے ہوئے ہیں۔ چند ایک نہیں' سینکڑوں کی تعداد میں۔ میرا بیٹا جاوید رک گیا۔ میں بھی ذرا سی دیر کے لیے رکا۔ آگے جانے کے لیے دونوں باپ بیٹا تذبذب میں تھے۔۔۔ یہاں کے لوگ عجیب ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں تو معقول لباس پہنتی ہیں اپنے آپ کو ڈھکتی ہیں مگر نوجوان خواتین اور لڑکیاں اپنے جسم کا ہر حصہ دکھانا چاہتی ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ سفرنامہ لکھوں اپنے آپ کو بڑی مشکل میں ڈال لیا ہے۔ یہاں کھلے بندوں یہی نظارے ہیں۔ اپنے آپ کو ان حالات و واقعات سے دور رکھوں تو کیسے؟ ابھی صبح کی بات ہے کہ میں نے اپنے ہوٹل میں ایک لڑکی کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے کھڑکی میں سے گلی میں جھانکا ایک لڑکی اور ایک لڑکا کھڑے تھے۔ لڑکی رو رہی تھی مگر اس کی رضامندی سے لڑکا اسے پے

بے پے چومے جا رہا تھا۔ بالآخر بٹن کھلنے لگے تو میں شرم کے مارے پیچھے ہٹ گیا مگر اس کے بعد مجھے لڑکی کے رونے کی آواز نہ آئی سسکنے کی آواز آتی رہی۔" (۲۹)

ممتاز مفتی کا سفرنامہ "ہند یاترا" ہے اس سفرنامے میں ممتاز مفتی اپنے شعور کی آنکھ سے قدیم ہندوستان کو دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی یادوں کے ذریعے ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ اس سفرنامے میں فلیش بیک کی تکنیک کو بھی برتا گیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ قدیم طوائفوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کے پاس لوگ اپنے بچوں کو آداب کی غرض سے بھیجتے تھے۔ اس میں انہوں نے جنس نگاری کو حظ اٹھانے کے نقطۂ نظر سے استعمال نہیں کیا بلکہ اس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

"کٹڑا گھنیاں طوائفوں کا کٹڑا تھا۔ اونچی ذات کی طوائفوں کا۔ ان کے انداز میں ایک وقار تھا ایک بے نیازی تھی۔ ان کے چوباروں میں مشرقی تمدن کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ طوائفیں تھیں جن کے ہاں بادشاہ اور راجے مہاراجے اپنے بچوں کو تہذیب اور اخلاق سیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے ان کے پاس شائستگی تھی حسن تھا۔ لے تھی رنگ تھا راگ تھا۔" (۳۰)

ممتاز مفتی کے ہاں اس سفرنامے میں جنس نگاری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں زیادہ تر نفسیاتی سطح کے ہیں۔ انہوں نے ہر بات کو فلسفے کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ جہاں ہندو عورتوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کے حسن کو بھی اپنے مخصوص انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے واقعات بھی تحریر کیے ہیں جو دلچسپ ہیں اور جنہیں پڑھ کر قاری بھی حظ اٹھاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند اقتباسات دیکھیے:

"ہندو عورت میں حسن تو عام ہوتا ہے لیکن عورت کم کم ہوتی ہے۔ حسن اور چیز ہے عورت اور چیز۔ اس عظیم حقیقت کو سب سے پہلے پنڈت کوکا نے محسوس کیا تھا۔ صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنے کام شاستر میں اس کی وضاحت بھی کر دی۔ پنڈت کوکا کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ حسین عورت پدمنی ہوتی ہے لہٰذا جب بھی شادی کرو پدمنی سے کرو۔ پتہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے مگر ایسا ہے کہ عورت جتنی حسین ہوگی اتنی ہی اس میں عورت کم کم ہوگی۔ جتنی عورت زیادہ ہوگی اتنا ہی حسن کم کم ہوگا۔ عورت میں مانگ ہے۔ وہ سراسر مطالبہ ہی مطالبہ ہے۔ اتنا مطالبہ کہ اسے پورا کرنے کی مرد میں توفیق نہیں۔ حسینہ میں مطالبہ کم کم ہے ممتا زیادہ۔ حسینہ ایک خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے۔ عورت آگ سلگا دیتی ہے۔ جبھی ہندی میں اسے ناری کہتے ہیں۔ آج کی دنیا میں پدمنی

چیش چیش نہیں ناری چیش چیش ہے۔ پدمنی سے یہ خشبو نہیں آتی۔ وہ یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ رک جاؤ۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ دیکھو میں ناری ہوں دیکھو اور سنگھو۔" (۳۱)

"چوک فرید میں بشر کونے سے لگا کھڑا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ پچپن برس پہلے کھڑا ہوتا تھا۔ شرمایا شرمایا لجایا لجایا۔ ڈرا ڈرا سہما سہما۔ بشر میرا ہم جماعت تھا اونچا لمبا گورا چٹا حسین۔ حسن نے اس کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ چوک فرید کی ہر نوجوان لڑکی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ پتہ نہیں بشر کی کونسی خصوصیت انہیں بھا گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ اونچا لمبا تھا یا گورا چٹا تھا یا اس لیے کہ وہ بات بات پر شرما جاتا تھا۔ چوک کی ہر لڑکی کی خواہش تھی کہ وہ صبح سویرے اس کا منہ دیکھے اور سلام کرے۔ یہ بات بشر کے لیے سوہان روح تھی۔ کالج میں میں بشر کا واحد دوست تھا۔ اس لیے وہ اپنی جملہ مصیبتوں کا رونا میرے سامنے رویا کرتا تھا۔ آج سلطانہ نے مجھے چھ سلام کیے۔ آج بانو نے مجھے فلائنگ کس پھینکا۔ آج صبوحی نے دور سے باہیں پھیلا کر مجھے سینے سے لگا لیا ہائے اب کیا ہوگا۔ ضرور کسی نے دیکھ لیا ہوگا۔ بڑی واہیات لڑکیاں ہیں جو ایسی بیہودہ حرکتیں کرتی ہیں۔ میں منہ زبانی اس سے ہمدردی کرتا اور دل ہی دل میں آہیں بھرتا۔ کاش کوئی مجھے بھی سلام کرتی کوئی فلائنگ کس میری طرف پھینکتی۔" (۳۲)

صدیق سالک کے سفرناموں میں سفرناموں والی روایت نہیں ملتی یعنی ان میں جغرافیائی اور تاریخی تفصیلات نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے سفر کی ذاتی صعوبتوں اور مشکلات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا انہوں نے خود اعتراف بھی کیا ہے۔ ان سفرناموں میں انہوں نے جنس کو مزاح کے حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں مزاح اور جنس لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ وہ منظر کو معصوم نظروں سے دیکھتے ہیں اور دلچسپ حقیقت کو مزاح کے پردے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

"کمرے کا ٹیلی ویژن سیٹ کھولا تو وہاں ایک فلم چل رہی تھی (جو درحقیقت فلم کا ٹریلر تھا) اس میں ایک خوش شکل مگر بدکردار شخص جنسی ہوس کی تسکین کے منصوبے بناتا ہے اور بالآخر اس فلیٹ کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے جس کے اندر ایک حسینہ باتھ ٹب میں اکیلی تیر رہی ہوتی ہے۔ جذبات اور صابن کی جھاگ میں حسینہ کا جسم چھپ جاتا ہے لیکن اس کے برہنہ شانوں اور چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پھول کی پتیاں بکھرنے کو تیار ہیں خوش شکل مرد اس کے دروازے (فلیٹ کے) پر دستک دیتا ہے

دروازہ کھلتا ہے اور وہ اندر داخل ہو جاتا ہے' اس کی حرکتوں کا نوٹس لینے اور پولیس کو اطلاع دینے کی غرض سے میری نگاہیں بھی اس کے تعاقب میں کمرے کے اندر چلی جاتی ہیں لیکن دروازہ دوبارہ بند ہو جاتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ یہ فلم آج رات 11 بجے ہوٹل کے کلوز سرکٹ ٹی وی پر دکھائی جائے گی' جو مہمان دلچسپی رکھتے ہوں ہوٹل کے فلاں نمبر پر رابطہ قائم کریں' میں نے سوچا امریکہ آ کر بھی بلیو فلم پر گزارہ کرنا ہے تو حیف ہے ـــــ امریکہ پر بھی اور مجھ پر بھی! ـــــ میرے نیم وا دروازے پر ایک نسوانی دستک ہوئی گھڑی دیکھی تو گیارہ بج چکے تھے بلیو فلم کا ٹریلر دیکھنے کی وجہ سے میرے دل میں طرح طرح کے نفسانی خیالات آنے لگے مثلاً یہ خاتون رات گئے میرے در پر کیا لے کر آئی ہے' اگر میں نے اسے نامراد لوٹا دیا تو یہ کیا کہے گی اور اگر اسے بامراد لوٹانے کی کوشش کی تو دنیا کیا کہے گی۔ مجھے ویسے بھی اپنی عصمت سے زیادہ شہرت کا خیال رہتا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے آگے ناک منہ رگڑ کر گناہ تو رائٹ آف کرائے جا سکتے ہیں لیکن پبلک کے سامنے ناک منہ رگڑ کر چکنا چور شہرت کو دوبارہ نہیں جوڑا جا سکتا۔''(۳۳)

میں دل ہی دل میں مطالعے کی اس عادت کی داد دے رہا تھا اور اسے فرانس کی ترقی اور تہذیب کا اہم ستون سمجھ رہا تھا کہ ایک رینو گاڑی ٹریفک لائٹ کے سامنے رکی' ایک لڑکا گاڑی چلا رہا تھا اور لڑکی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ لڑکے نے اسٹیرنگ چھوڑا تو میں سمجھا کہ وہ کتاب اٹھائے گا لیکن اس نے کاغذی کتاب کی بجائے لڑکی کا کتابی چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا اور اس کے ہونٹوں پر دھڑا دھڑ تین چار بوسے ثبت کر دیے اتنے میں بتی سبز ہو گئی اور اس نے گیئر لگا لیا (گاڑی کو) تین دن پہلے تک پیرس میرے خوابوں کا شہر تھا۔ اب اس کا سارا رومانس ختم ہو چکا تھا۔ نہ شیشے کی سڑکیں نہ خوشبو میں رچی گلیاں نہ ''مسیو مسیو'' کے استقبالیہ کلمات اور نہ کسی شریف آدمی کے لیے کسی شریفانہ سی تواضع کا سامان' بلکہ الٹا پردیسیوں کا دل دکھانے کے لیے سرعام بوس و کنار' مجھے تو اہل فرانس کی آئیڈیالوجی کچھ مشکوک لگی' یہاں اصلاح معاشرہ کے لیے فوراً تبلیغی جماعت کا ایک وفد بھیجنا چاہیے۔''(۳۴)

صدیق سالک نے خصوصاً مغربی ممالک کی تہذیب و ثقافت کو بھی بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے جس واقعے کو دیکھا ہے اس کو مزاح کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں ان گنت مسکراہٹیں ہیں۔ اس میں جنس کو بھی مزاح کے حربے کے طور پر برتا گیا ہے۔ یورپ میں انہوں نے جو مناظر دیکھے ہیں خصوصاً بلغراد میں جو فحش مناظر دیکھے ہیں ان کو مزاحیہ انداز سے صفحۂ قرطاس پر کچھ یوں منتقل کیا ہے:

''چند فرلانگ پتھریلی گلیوں پر لڑھکنے کے بعد گاڑی ایک پارک میں داخل ہو گئی جہاں عید کا سماں تھا۔ پرانی وضع کی وسیع و عریض پارک میں نئی نسل کے لڑکے اور لڑکیاں تنگ مغربی لباس پہنے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ چند جوڑے سرعام لپ سروس میں مصروف تھے' باقی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسائے سبز تختوں پر لیٹے تھے۔ ایک لڑکی بلاؤز کے بجائے پتلی سی مردانہ قمیص پہنے گھٹنوں کے بل اکڑوں بیٹھی تھی اور تنگ جینز (Jeans) اور سرخ ٹی شرٹ والا لڑکا لڑکی کے گلے میں لٹکی (قریب سے) لاکٹ (Locket) ملاحظہ کر رہا تھا' پاس سے گزرنے والے راہگیروں کو ایک کی بجائے تین لوکٹ نظر آ رہے تھے لیکن وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھے۔''(۳۵)

''وہاں انگلینڈ کے لڑکوں نے امریکی وضع کی جینز اور بنیانیں پہن رکھی تھیں۔ کئی بازوؤں کے پچھلے پر دل کا نشان بنا تھا' کسی پر کیوپڈ کے تیر کا نشان تھا۔ بعض نے بھونڈے اور بھڑکیلے الفاظ رنگ رکھے تھے اور بعض چاک بار (Chac Bar) آئس کریم کو چاٹ رہے تھے۔۔۔ اور ان سے بڑی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کو چاٹ رہے تھے۔''(۳۶)

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا سفرنامہ ''مندر میں محراب'' ہے۔ انہوں نے ۱۹۸۷ء میں بھارت کا سفر کیا۔ یہ سفرنامہ افسانوی تخلیق زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اکثر مقامات پر دوران مطالعہ یہ کتاب سفرنامہ کے بجائے افسانہ نگاری کا مجموعہ لگتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جہاں کہیں خواتین کو دیکھتے ہیں وہاں ان کے اندر کا افسانہ نگار جاگ اٹھتا ہے بلکہ سفرنامے کا گمان بھی کہیں بہت دور دھندلکے میں کھو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر سفرنامہ افسانوی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کا قلم بھی تیز ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں انہیں کوئی کومل اور سندر چہرہ دکھائی دیتا ہے' وہاں اسے دیکھ کر وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ ان مناظر کو بیان کرتے ہوئے وہ جھجک اور شرم کی اوٹ میں ہرگز نہیں چھپتے۔ اُن کا خیال ہے کہ رستہ سب کے لیے ہوتا ہے۔ یہ جو دروازوں پر لکھا ہوتا ہے کہ بغیر اجازت اندر آنا منع ہے تو ایسے دروازے توڑ دینے چاہئیں۔ اس سلسلے میں اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ کچھ چہروں پر ایسے دروازے لگے ہوتے ہیں جنہیں بغیر اجازت کھول کر بڑا مزہ آتا ہے خواہ اس کے بعد جتنا بھی بے مزا ہونا پڑے۔ وہ جس طرح اور جس شدت سے سوچتے ہیں اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ ایک خوبصورت ہندو لڑکی کا ذکر کرتے ہیں جسے وہ سویٹ ڈش بھی قرار دیتے ہیں۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے سفرنامے میں کہیں کہیں خیالی عالم بھی بساتے نظر آتے ہیں۔ یہ جنس نگاری کی وہ قسم ہے جس میں جنسی اعتبار سے محرومیوں کا شکار جنس نگار اپنے

کتھارسس کے لیے اپنی تحریروں میں ہوس انگیز مناظر لے کر آتا ہے۔ یہ ایک نوع کا نفسیاتی عارضہ ہے۔ بسا اوقات ایک فرد معاشرے میں متمدن اور مہذب شخص سمجھا جاتا ہے۔ یہ اعتبار بھی اس کے لیے ایک نفسیاتی قدغن بن جاتا ہے۔ اس کے باطن میں ردِ عمل کے طور پر جنسی جذبات زیادہ انگیخت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس مریضانہ جنس نگاری کا شکار نظر آتے ہیں۔ سفرنامے کے مطالعے کے دوران میں اکثر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب عورت کو دیکھتے ہیں تو نجانے انہیں کیا ہونے لگتا ہے۔ بہر حال انہوں نے جن مناظر کو دیکھا اور ان کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوئے ان کو انہوں نے من و عن بیان کر دیا ہے اور کسی منافقت سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کوئی نقاب اپنے چہرے پر ڈالا ہے۔

مثال کے طور پر یہ منظر دیکھیے:

''آدمی جب نشے کی بند بوتل جیسی لڑکی سے بات کر رہا ہوتا ہے تو کیا کر رہا ہوتا ہے۔ نیکی یا گناہ۔ اب وہ لڑکی سویٹ ڈش لگ رہی تھی کھلکھلاتی ہوئی یہ شے کچھ دیر پہلے دھماکہ بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ ایسی لڑکیاں ٹائم بم ہوتی ہیں انہیں چھیڑتے ہوئے شاعرانہ یا عاشقانہ یا مدہوشانہ رعایت کے باوجود ہنرمندی بھی ضروری ہوتی ہے۔ شاعر صاحب کے نخرے سیاستداں عورتیں تو برداشت کر سکتی ہیں۔ بھارت میں مگر خالص عورتیں تو اپنے سامنے والی آنکھوں میں اپنا ملک تلاش کرتی ہیں۔ کچھ آدمی کئی کئی لڑکیوں کے وطن اجاڑنے کا مشغلہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی ریاست ہوتے ہیں اور ایک ریاست میں دو دو حکومتیں کیسے رہ سکتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک وجود میں کئی کئی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوتی دیکھی گئی ہیں مگر اس کے لیے اپنے اندر بڑی وسعت اور ویرانی چاہیے۔ بے وفا اور بے روح لوگوں کو کیسے بتایا جائے کہ وسعت اور ویرانی میں قدر مشترک کیا ہے۔ اس لڑکی کی گفتگو میں ایک انجانی خوشبو کی چاندنی تھی۔ اس کی آواز میں کوئی انکشانہ ہونے والا راز تھا اور یہ کہ اس نے شلوار پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس شب کی سب سے زیادہ محبوب چیز تھی۔ میزیں مرغوب کھانوں سے بھری پڑی تھیں۔ دالیں سبزیاں کھا کھا کر ہم لوگوں کا برا حال تھا۔ اس نے ہمارے ہاتھ میں پلیٹ تھمائی اور کہنے لگی ''بے فکر ہو کر کھائیے حلال گوشت ہے۔'' اس نے اس یقین سے کہا تھا جیسے مرغوں کو اس نے اپنی نظروں سے ذبح کیا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کے جو کچھ بھی دے دیتی وہ حرام کب رہتا۔ وہ ہندو لڑکی تھی۔ کافرانہ انداز میں بھی

ایمان اور حسن کی مالک تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو میری بھوک چمک اٹھی اس نے مجھے دیکھا تو میں سیر ہو گیا۔ آوارہ شریر بچے کی طرح ایک یاد میرے لہو میں کھیلنے کودنے لگی۔ میں اس لڑکی سے پاکستان میں بھی ایک بار مل چکا ہوں۔ یہ بات میں نے اسے نہیں بتائی ورنہ مجھے ضرور کہتی میں تمھیں بھارت میں کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ آواگان پر ایمان رکھنے والی تھی اب تو اس فلسفے کا قائل ہونا پڑے گا۔'' (۳۷)

''چلتے ہو تو چین کو چلیے''، ''آوارہ گرد کی ڈائری''، ''دنیا گول ہے'' اور ''ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں'' ابن انشاء کے سفرنامے ہیں۔ ابن انشاء اردو کے بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔ وہ مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں تنہائی، ویرانی اور عشق میں جوگ بجوگ جیسے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سفرنامے میں ان کی شخصیت بالکل مختلف رنگ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس لیے کہ شاعری زیادہ تر باطنی کیفیات، جذبات و احساسات کی کہانی ہے اور سفرنامہ [illegible] کا نام ہے۔

اشاعت کے اعتبار سے ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' ابن انشاء کا پہلا سفرنامہ ہے۔ پاکستان اور چین کی دوستی شروع سے ہی مثالی ہے چنانچہ ادبی اور ثقافتی وفود کے باہمی تبادلے کے سلسلے میں ایک وفد نے اپریل ۱۹۶۶ء میں چین کا سفر کیا۔ ابن انشاء کا یہ سفرنامہ انہی دنوں کی خوشگوار [illegible] ہے۔

اس سفرنامے میں پرانے چین کی تاریخ انقلاب کے بعد نئے چین اور اس کی ترقی و خوشحالی [illegible]۔ اس میں صاف ستھری معاشرتی، تہذیبی اور علمی و ادبی زندگی کی روشن تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ ابن انشاء نے سفرناموں کی سنجیدہ معلومات کو طنز و مزاح کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ ابنِ انشاء جب چین میں ڈراما دیکھنے کے لیے جاتے ہیں تو اس ڈرامے کا مرکزی رول ادا کرنے والی استانی پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے ابن انشاء سفرنامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ اس اُستانی کے حسن کو بیان کرنے کے لیے نثر میں جو پیرایہ اظہار استعمال کیا ہے وہ شاعری کے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس سفرنامے میں کچھ ایسے مقامات بھی نظر آتے ہیں جہاں ابن انشاء نے جنس کو مزاح کے حربے کے طور پر بھی برتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''ہم فوراً الگ ہو کر بیٹھ گئے اور بلو کا بستہ واپس لے کر ان کو موازنہ انیس و دبیر وغیرہ دیں۔ اس سلسلے میں ایک عجیب حادثہ ہم پر دوہان میں گزرا۔ وہ یوں

کہ ہم ایک ڈراما دیکھنے گئے۔ کیا بات ہے ڈرامے کی۔ بہت عمدہ تھا لیکن اس کا مرکزی کردار ایک نرم و نازک استانی تھی۔ آواز چاندی کے گھونگھر اور ہاتھ باہیں کومل کچنار۔ ہم اردو کے شاعر ٹھہرے دلوں کی پوٹلی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ ایک دل ادھر بھی پھینکا۔ عمر اس چنچل نار کی اٹھارہ بیس ہوگی چونکہ میک اپ بھی ہوتا ہے لہذا چوبیس پچیس جانئے۔ اس سے زیادہ رعایت دینی مشکل ہے۔ ہم نے دوستوں سے کہا یار دو روز اور دوہاں میں ٹھہرو تو اس پر ایک مثنوی سحر البیان کے ٹکر کی ہم لکھ جائیں۔ دوستوں نے ہمارا اشتیاق دیکھ کر اس عفیفہ کو بلا بھیجا اور اس سے ہمارا تعارف کرا دیا۔ ہم نے تعریف کی کہ اے نا ظورۂ دلفریب تیرے انگ انگ میں جادو ہے' تو یُوں ہے اور تو ووں ہے۔ ڈرامے میں تو نے کمال کر دیا۔ بولی۔ من آنم کہ من دانم۔ اتنے دن سے سٹیج پر کام کر رہی ہوں' اتنا بھی نہ کروں؟ ہم نے کہا! اے لعبتِ چین کب تو نے دلوں کو برمانے کا یہ شغل اختیار کیا تھا۔ تھوڑا رکی۔ حساب لگا کر بولی۔ چالیس برس سے بہت چھوٹی عمر میں سٹیج پر آنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت عمر اس بندی کی اڑتالیس برس دو مہینے ہے۔''(۳۸)

''چین میں عورتوں اور مردوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں۔ وہی بند گلے کی جیکٹ' وہی پتلون' ایک سا جوتا۔ نہ سرخی نہ لپ اسٹک' نہ بندے نہ جھومر نہ غرارہ نہ ساڑھی نہ دوپٹہ نہ پرس۔ یہ سب سچ ہے ہم خود جاتے ہوئے اپنی ہنڈی کرافٹ شاپ سے موتیوں کا ایک پرس لے گئے تھے خیال یہ تھا کہ کوئی بیگم ادیبہ ملیں گی یا کسی ادیب کی بیگم کو نذر کریں گے تو خوش ہوں گی لیکن وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر آخر ایک پاکستانی خاتون کو اسے کر آئے۔ وہاں تو کوئی خاتون سودا سلف لینے کو نکلے تو زیادہ سے زیادہ کپڑے کا تھیلا ساتھ ہوتا ہے اور بس۔

بالکل ہمہ یہ بات مبالغہ ہے کہ عورت اور مرد کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ حسن و رعنائی وہاں بہت ہے۔ ایسے ایسے چہرے نظر آئے کہ بس اور پھر چہروں کا حسن صحت اور شادابی سے عبارت ہوتا ہے کہ کسی مصنوعی مدد کا محتاج نہیں۔ ایک جگہ کچھ خواتین غازہ پوتے' بھڑ کیلے لباس پہنے نظر آئیں تو تحقیق پر معلوم ہوا کہ بے شک چینی ہیں لیکن سمندر پار کی چینی۔ سنگا پور سے سیر کے لیے یہاں آئی ہوئی ہیں کسی شخص کو لاغر دیکھیے یا کسی کا پیٹ بڑھا ہوا پایئے تو یہ بھید کھلے گا کہ یہاں کا متوطن نہیں باہر سے آیا ہے۔ سارے چین میں کسی مرد یا عورت کو لاغر نہ پایا۔''(۳۹)

اشاعت کے اعتبار سے ابنِ انشاء کا دوسرا سفرنامہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' ہے جو جولائی ۱۹۷۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پاکستان نیشنل سینٹر کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ۱۹۶۷ء میں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے یورپ اور مشرق وسطیٰ میں کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کے نظام کے سلسلے میں ابنِ انشاء کو پیرس' لندن' جرمنی' ہالینڈ' سوئٹزر لینڈ' قاہرہ' لبنان اور شام بھیجا۔ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' انہی دنوں کی داستان ہے جسے سفرنامہ کہنے کی بجائے اگر سفری کام کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اس سفرنامے میں بھی ابنِ انشاء کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی نمونے ملتے ہیں۔ کہیں ابتذال کا عنصر غالب نہیں آتا بلکہ انہوں نے یورپ کے معاشرے کی تہذیب و ثقافت کو مکمل کر بیان کیا ہے ابنِ انشاء نے اپنے اس سفرنامے میں خصوصاً یورپ کے معاشرے کی عکاسی کی ہے اور اس طرح ان کے ہاں جنس نگاری بھی ایک خاص موضوع بن گئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اندازِ تحریر اپنے اندر طنزیہ مزاحیہ رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ ابنِ انشاء نے کہیں بھی زبردستی بارہ مصالحوں کی چاٹ شامل نہیں کی اس لیے وہ حقیقت کو بیان کرتے ہوئے بھی جنس کے مبالغہ آمیز نمودوں سے گریز کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر رواں تبصرہ کر کے قاری کو اپنا ہم نوا بناتے چلے جاتے ہیں اگر چہ وہ زیادہ تر مناظر کو اپنی فطری شریر آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں یورپ کے لئے نئی بات نہیں اب تو پردے پر پردا اٹھ رہا ہے لیکن اتنا ہم کہیں گے کہ پیرس میں لندن کا سا ابتذال نہیں۔ لندن میں تو سیدھی سادھی جسم فروشی ہوتی ہے۔ پیرس میں لب و کنار کی دعوتیں ضرور ہوتی ہیں۔

ع چھاتی سے لگا چوم لیا ہو گئے چپکے

لیکن غنڈہ گردی اور بیسوا پن نہیں۔ عاشقی بھی سلیقے کی اور فاسقی بھی سلیقے کی۔ ادھر ہمارے پیرس سے جانے کے دن قریب آتے جا رہے تھے یعنی گاؤں کنارے باجا بجے' لندن دیس بسانا ہوگا۔ ادھر پیرس سے محبت بڑھتی جا رہی ہے۔

ع خود بخود دل میں ہے یہ شہر سمایا جاتا

شہر تو ہم نے اور بھی دیکھے ہیں لیکن جو بات پیرس کی ہے وہ اور کہاں ہے ہوا میں شراب کی تاثیر۔''(۴۰)

''نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان کی طرف کھنچتی بھی ہیں۔ بعضے ان پر

نفرین کرتے ہیں بعضے ہمدردی جتاتے ہیں۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ بعضوں کے نزدیک یہ اس معاشرے کا ردعمل ہے جو اس درجہ سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود تھا کہ باپ گھر کے اندر شام کو کھانے پر بیٹھتا تھا تو باقاعدہ ڈنر جیکٹ زیب تن کر کے عہدِ وکٹوریا کی اخلاق پرستی مشہور ہے۔ ہم نے اس صدی کے آغاز کے لباس میوزیم میں دیکھے۔ عورتیں یہ لمبے لمبے لہنگے پہنتی تھیں۔ گلے کے اوپر تک بٹن بند رہتے تھے اور پیراہن بھی خوب جھالردار ہوتے تھے۔ سو وہ لباس قطع و برید کے بعد منی اسکرٹ تک پہنچا۔ یہی قطع و برید معیارِ اخلاق میں بھی ہوئی۔ پہلے زمانے میں سرِ بازار چوما چاٹی کا ایسا دستور نہ تھا جیسا آج ہے۔۔۔ جو لوگ ذرا پرانے خیال کے ہیں۔ دانتوں میں انگلیاں دابے کہتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ کیسا زمانہ آن لگا ہے۔۔۔ جنسی جذبات کا ابال تو ہمیشہ ہر زمانے میں عورت مرد میں اعتبار رہا ہے لیکن اگلے زمانے میں بے راہروی کے مواقع کم تھے۔ اب تو خود کمانے والی لڑکیاں آزاد ہیں۔ ان پہ کوئی چاہے بھی تو کیسے پہرہ رکھ سکتا ہے۔ ہر آفت سے بچانے کے لیے گولی ہے۔ تحریص کے لئے موٹر سائیکل ہے اسپورٹس کار ہے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر سے بلکہ ملک سے باہر جا کر چھٹی منانے کی آزادی ہے۔

گر ہو شراب و ساغر و محبوب خوبرو
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ادھر نوجوانوں کے لئے بے شمار مواقع ہیں کسی بھی دوشیزہ کو اپنی راہ پر لانے کے لیے بس ذرا تیکھی مونچھیں ہوں۔ روپے پیسے کی بھی شرط نہیں کیونکہ لڑکی خود کماتی ہے۔ ادھر لڑکی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی ہے کہ اگر کوئی پیار کرنے کے لیے اس کا طالب نہیں ہوتا تو وہ سمجھتی ہے خود کو ہم چشموں کی نظر میں حقیر محسوس کرتی ہے جہاں سات سہیلیاں ملتی ہیں اور اپنے معاشقے بیان کرتی ہوں وہاں اس کا احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا قدرتی بات ہے۔

کلیوز ان صاحب نہ وعظ کرتے ہیں نہ قربِ قیامت کی نوید دیتے ہیں۔ ان کی دہائی یہ ہے کہ یارو کچھ لڑکیاں تو ایسی ہوں گی جو اپنی عصمت بچانا چاہتی ہوں گی اور شریفانہ شرطوں یعنی شادی کا انتظار کرنا چاہتی ہوں گی۔ پرانے زمانے میں ایسی لڑکیوں کو اس خیال سے تقویت رہتی تھی کہ معاشرے کا اخلاقی ضابطہ ان کی پشت پر ہے۔ ان کو بنظرِ تحسین دیکھتا ہے آج ایسی کوئی روک نہیں معاشرہ انھیں سراہے گا تو کیا عجیب نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔

ع یہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں [۴۱]

ضخامت کے اعتبار سے ابنِ انشاء کا طویل ترین سفرنامہ ''دنیا گول ہے'' ۱۹۷۲ء میں چھپا۔ اس میں فلپائن' انڈونیشیا' سنگاپور' ملائیشیا' بنکاک' ہانگ کانگ' افغانستان' ترکی' جاپان' کوریا' لندن اور پیرس کے ساتھ ساتھ امریکی ریاست ہوائی اور سان فرانسسکو کی سیاحت کا احوال درج ہے۔ مجموعی طور پر اس سفرنامے کا انداز اطلاعاتی ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ابنِ انشاء کو مناظر کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کسی جگہ زیادہ دن ٹھہر نہیں سکے۔ اس لیے اس سفرنامے میں ان کے ہاں مشاہدے کی رنگارنگی بھی زیادہ نہیں ملتی۔ اس سفرنامے میں ابنِ انشاء کے ہاں جنس نگاری کے بہت کم نمونے ملتے ہیں۔ اگر انھیں کسی منظر کو ایک خاص سطح اور زاویے سے دیکھنے کا موقع ملا ہے تو اسے بھی انہوں نے مزاح نگاری کی نذر کر دیا ہے گویا جہاں جنس کا تذکرہ ہے وہاں اس کا مقصد مزاح پیدا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اس سفرنامے میں چند ایک مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں انہوں نے مختلف ممالک کے جنسی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے کچھ ذاتی تجربات کو بیان کیا ہے مثال کے طور پر انہوں نے شبینہ کلبوں' Topless تماشا گاہوں' برہنہ رقصوں' جنسی میگزین کے تازہ شماروں کا ذکر کیا ہے بلکہ انہوں نے سفرنامے کو بوریت سے دُور رکھنے کے لیے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ بھی رات بھر Topless تماشا گاہوں کے کچھ مصور اشتہاری پمفلٹ اور جنسی میگزین کے تازہ شماروں کا اردو ترجمہ کرنے میں اور ان میں سے برہنہ رقصوں اور ٹاپ لیس کے اشتہار کاٹنے میں گزار دیتے ہیں۔ ابنِ انشاء نے ان ممالک کی عریانی و فحاشی کو بڑی بیباکی سے بیان کیا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''آج یہاں کی زندگی کے دو تجربے اور ہوئے۔ باری صاحب کو اپنے بچے کے پراجیکٹر کے لئے ۸ ملی میٹر کی فلمیں چاہیے تھیں۔ یہاں آس پاس کئی دکانیں ہیں جن کے باہر ''آرٹ فلمز'' لکھا تھا۔ دکاندار نے فوراً ایک نکال کر دکھائی۔ خالص عریاں۔ عریاں بھی ایسی کہ۔۔۔ باری صاحب نے کہا نہیں نہیں۔ دوسری طرح کی۔ اب وہ بھلا مانس دوسری نکال لایا۔ جس میں صرف عورتیں ہی ننگی نہ تھیں بلکہ مرد بھی۔۔۔ اور اس فلم میں ظاہر ہے وہ خالی دھوپ نہیں تاپ رہے تھے۔ باری صاحب بولے بابا عریاں اور جنسی تصویریں نہیں چاہئیں۔ ایسی فلمیں کہ گھر میں بھی دیکھ سکیں۔

بچے بھی عورتیں بھی۔ دکاندار ہنسا اور بولا ـــــ اچھا وہ بچوں والی جس میں مناظر ہوتے ہیں ہوائی جہاز وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ملتیں۔ ہم نے ارد گرد نظر دوڑائی آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ ایسی ہی دیدہ زیب تصویریں' رسالے اور کتابیں ہر طرف بھرے تھے اور اس قسم کی دکانوں سے یہ سارا علاقہ پٹا پڑا ہے۔" (۴۲)

"کیتھے ہوٹل سنگاپور ـــــ جس میں ہم فروکش ہیں۔ یہاں کے ممتاز ہوٹلوں میں سے ہے۔ نیچے اس کے کیتھے سینما ہے اور سوئمنگ پول اور نہ جانے کیا کیا۔ رومانی جوڑوں کے پرے کے پرے ان گلیاروں میں گھومتے ہیں۔ اگر کوئی تنہا چلتا ہے تو یہ اس کا قصور ہے۔ شاعر تو درازدستی کوتہ آستیناں کو روتا تھا۔ یہاں لباس پر بے لباسی رشک کرتی ہے۔ کیوں کہ اشارہ اور استعارہ ہمیشہ تشریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ یہ چینی اکثریت کا شہر ہے لہٰذا خوبان بھی یہاں کے چینی ہی ہیں اوپر کے لباس کی بالائی حد روز بروز نیچے کو کھسکتی ہوئی اور نیچے کا لباس روز بروز سکڑتا اور اوپر چڑھتا ہوا۔ اس ندی کے دونوں کنارے جب بالکل ہی مل جائیں گے تو دیکھئے اب میں کتنے سفینے ڈوبتے ہیں۔ ایک سے ایک دشمنِ ایمان دآ گہی۔ بلا مار کے دیوار بچاتا ہوا لیکن میاں آزادؔ آنکھیں ہماری باقی ان کا۔

اس دل کو نہ لوگو بھٹکاؤ
یہ دل ہے کسی کے بندھن میں" (۴۳)

"ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" ابنِ انشاء کا آخری سفرنامہ ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سے پہلے اس کے بعض حصے روزنامہ "جنگ" میں کالم کے طور پر چھپتے رہے۔ اس میں جرمنی' لندن' جاپان' فلپائن' لنکا اور ایران کے سفر کا احوال درج ہے۔ چونکہ ابنِ انشاء ان تمام جگہوں پر گئے جہاں ابنِ بطوطہ نے ۷۵۰ھ میں قدم رنجہ فرمایا تھا اسی لئے اس سفرنامے کا نام "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" رکھا گیا۔

اکثر ہمارے سفرنامہ نگاروں کا زیادہ تر رجحان مغربی ممالک کی سیر وسفر کا پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بذاتِ خود بھی وہاں کی فضاء سے ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور لفظوں کی صورت میں وہ کچھ نقشہ بھی ایسا پیش کرتے ہیں کہ وہاں کی عریانی فحاشی اور مادی ترقی سے قاری کی آنکھیں بھی چندھیا کر رہ جاتی ہیں۔ ابنِ انشاء کے ہاں یہ رویہ بہت کم ملتا ہے وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے نہ خود مرعوب ہوتے ہیں اور نہ قاری کی آنکھیں خیرہ کرتے ہیں۔ وہ سفرنامہ لکھنے کے لیے جنس کے

مسالے کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔

ابنِ انشاء نے اپنے اس سفرنامے میں سب سے پہلے جرمنی اور لندن کے سفر کی روداد بیان کی ہے اور حسبِ معمول سفرنامے کے کئی صفحات ہوٹلوں کے کمروں اور غسل خانوں کی تفصیلات کی نذر کر دیے ہیں لیکن ان کی شوخ آنکھ بظاہر گھسے پٹے موضوع پر اس نئے زاویے سے پڑتی ہے کہ وہ اس میں تنوع پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی ہوٹلوں اور کمروں کی معلومات تو ہر سفرنامہ نگار دے سکتا ہے لیکن ان لوگوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کے ہر ماحول کی عکاسی کرنا ہر سفرنامہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ ابنِ انشاء کے ہاں اس سفرنامے میں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے ملتے ہیں اور ان کی قوتِ مشاہدہ بھی حسِ مزاح پر حاوی نظر آتی ہے۔ اگرچہ زبان و بیان کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس سفر کی کہانی میں مربوط اور خوشگوار اسلوب کا انداز موجود ہے۔ ابنِ انشاء نے اپنی آنکھ سے جو کچھ دیکھا ہے اس کو شگفتہ انداز سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ وہ نہ کسی منظر کو دیکھ کر اس کو مزید رنگین بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اس پر پردہ ڈالتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"ٹوکیو اور بنکاک کے حماموں میں تو جہاں سب ننگے ہوتے ہیں' مالش کا کام طرحدار اور باعفت بی بیوں کے سپرد ہوتا ہے اور وہ اس وقت تک اپنی عفت کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں جب تک آپ ان کو دس بیس ڈالر مالش کی اجرت کے علاوہ نہ دیں۔۔۔ جرمنی کی عورتیں کیسی ہوتی ہیں اور کپڑے کیسے پہنتی ہیں اور پہنتی بھی ہیں یا نہیں؟ یہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کیونکہ عورتوں کی طرف ہم دیکھتے ہی نہیں۔ ایک تو اپنی طبعی شرماہٹ اور شرافت کی وجہ سے اور دوسری وجہ ہم اس وقت بھول گئے ہیں۔" (۴۴)

"ہر ملک کے اپنے آداب اور اپنی رسمیں ہوتی ہیں۔ جاپانی میزبان کا بزنس' لنچ یا ڈنر گیشا گھر میں ہوتا ہے اور مہمان کے لئے نسوانی صحبت فراہم کرنا' دعوت اور بزنس کا حصہ ہے۔ اس میں وہ جتنا گڑ ڈالے گا اتنا ہی میٹھا ہوگا لیکن بار اور گیشا گھر سے قطعِ نظر ہم نے گلیوں بازاروں میں چوما چاٹی کا وہ سلسلہ زیادہ نہیں دیکھا جو بعض دوسرے ملکوں میں ہے اور ہانگ کانگ میں ہے۔ ہانگ کانگ کا احوال ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ اب کے بھی میرامار ہوٹل والوں نے ہمیں ہانگ کانگ کی جو گائیڈ دی' وہ دردِ تنہائی دور کرنے کے لیے تیر بہدف نسخوں کی پوٹ تھی۔ ایک اشتہار کا اقتباس:
"ایسکورٹس لمیٹڈ۔ ۵۷ پیکنگ روڈ' کولون' مہمانانِ عزیز کے لیے رفیق تنہائی مہیا

کرنے کی یہ سروس یورو پین ملکیت میں ہے۔ ہمارے ہاں سے ہر طرح کی لڑکی مل سکتی ہے۔ شام کو آپ کا جب بہلانے کے لئے چلبلی اور نوجوان لڑکی سے لے کر تنہائی کے ڈنر میں عمدہ گفتگو کرنے والی مادام تک۔ آپ جسے بھی منتخب کریں وہ خوش اندام، خوش پوش اور فرمانبردار رفیق ہوگی۔ ہر قوم اور نسل کی انگریزی بولنے والی فیس فی گھنٹہ ۳۳ (ہانگ کانگ) ڈالر۔ خواتین کے لئے دل کش شخصیت کے مرد بھی ۲۲ (ہانگ کانگ) ڈالر کے حساب سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ ناپسند ہوں تو دام واپس۔ گویا خواتین مہنگی ہیں اور مرد سستے ہیں۔ ویسے ۲۲ ڈالر بھی کچھ کم نہیں ہمارے ہاں تو ٹکے ٹکے میں آدمی ملتا ہے۔ اس قسم کی خدمت کے لئے تو ہم پلے سے بھی دینے کو تیار ہیں۔''(۳۵)

کرنل محمد خان نے دو سفرنامے تحریر کیے ہیں''بجنگ آمد'' اور ''بسلامت روی'' کرنل محمد خان کے سفرناموں میں زندہ دلی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں اصلاحی پہلو مفقود ہے گویا وہ سب اچھا ہے کے قائل ہیں۔ ان کا مزاح بھی عموماً جنس ہی کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی سے حظ اٹھانے کا رویہ غالب ہے۔ خصوصاً جب وہ کوئی خوبصورت چہرہ دیکھتے ہیں تو کھل اٹھتے ہیں۔ وہ زندگی کو ایک آسودہ حال شخص کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے واقعات اور مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری بھی ان سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کرنل محمد خان نے اشیاء اور مناظر کو شریر آنکھ سے دیکھا ہے۔ وہ مناظر پر محبت کی نظر ڈالتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں ذیلی عنوانات دے کر ان کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ بعض واقعات ایسے بیانیہ انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے وہ دوسرے لوگوں کو دلچسپ واقعات سنا رہے ہوں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''ہوسٹیس دو قسم کی ہوتی ہیں: ارضی و سماوی۔ ارض یعنی گراؤنڈ ہوسٹیس نمازی شکل وصورت کی ہوتی ہیں یعنی نماز پڑھیں نہ پڑھیں، پرہیزگار لگتی ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دنیا فانی معلوم ہوتی ہے اور اُن کی صحبت میں ہوائی جہاز کی بجائے نزدیک ترین مسجد کو بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی ہوسٹیس جہاز پر پائی جاتی ہیں اور ان کی تاثیر بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ان کی ہمسفری سے یادِ الٰہی میں تو نمایاں کمی آجاتی ہے البتہ ان کے قُرب سے تولیدِ خون میں معتد بہ اضافہ ہوتا ہے اور ان کی معطر سانسوں کے طفیل، ہوائی جہاز کی ایئر کنڈیشننگ کے باوجود زندگی میں حرارت آتی ہے اور یہ چلتی پھرتی رہیں تو دنیا رہنے کے قابل معلوم

ہوتی ہے۔ ان کی مہماں نوازی اُوڈی کلون میں گھل کر جہاز کی فضا کو قطعی طور پر ایمان رُبا بنا دیتی ہے جس سے مسافروں اور مسافرات کے اپنے ارماں اور رومان تحت الشعور میں کروٹ لے کر اچانک جاگ اٹھتے ہیں حتیٰ کہ بوڑھے اور بھاری بھرکم سینیئر افسر بھی جو ریٹائرمنٹ کے دہانے پر کھڑے ہو کر آخری سرکاری دورے پر نکلے ہوتے ہیں، بار بار گھنٹی کا بٹن دباتے ہیں اور بار بار سگتریاں طلب کرتے ہیں اور اس بہانے اپنی ہلکی پھلکی میزبانوں سے خوش وقت ہو کر اپنی ہم عمر اور ہم وزن بیگمات سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر وقفۂ نجات مناتے ہیں الغرض ارضی و سماوی ہوسٹسوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔۔۔۔ ہماری جوڑواں سیٹ پر یعنی بالکل ہمارے پہلو میں ایک تنگ لباس میں صاحبہ اپنے بیشتر Secret weapons (خفیہ ہتھیار) بے نیام کیے نیم دراز تھیں مگر اس اسلحہ کی نمائش کے باوجود بے ضرر تھیں کہ قیافۃً انہیں اپنے آخری ہم نشین کو شکار کیے ہوئے کم و بیش تیس برس بیت چکے تھے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ان کی بے نیش عریانی محض ویرانی کا اشتہار تھا اور صاف ظاہر تھا کہ یہ مگر سو مرتبہ لٹا گیا۔ سو اس بے اشتغال ماحول میں آنکھیں موند لینے کے سوا کسی دیگر مفید شغل کی گنجائش نہ تھی۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد''(۳۶)

کرنل محمد خان کی تحریر آدمی کو مسکرانے پر آمادہ کرتے ہوئے حزینہ کیفیت سے محفوظ رکھتی ہے۔ انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے جنس کا بھرپور سہارا لیا ہے۔ ان کے ہاں اداسی اور ناآسودگی کے برعکس خوش طبعی اور سب ٹھیک کا اشارہ ملتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے سے مضحک کیفیات پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں جنس نگاری کی عمومی سطح ملتی ہے یعنی جنس نگاری محض تلذذ کے لیے ہے اس میں اعلیٰ حقائق یا اعلیٰ علمی و ادبی سطحیں نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں اپنے ذاتی واقعات کو بڑے مزے لے کر بیان کیا ہے اور خصوصاً جہاں کہیں خواتین کا ذکر آتا ہے تو یہ بے قابو سے ہو جاتے ہیں اور ان کا قلم اور بھی رواں ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''لیکن حسینانِ بصرہ کے ساتھ ہمارے تمام معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا مسعود یہ ہوٹل کی وہ رنگین شام کہ اس کا وسیع دالان حسینوں سے پُر تھا اور لفٹننٹ کیانی یکا یک ایک

فتنہ روزگار پر کھڑے کھڑے دل لٹانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہر چند کہ وہ کافرہ اس خراج عظیم کی مستحق تھی تاہم اس کا انتخاب اس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ کتخدا تھی اور اپنے دولہا کے عین پہلو میں بیٹھی تھی۔۔۔ حسینانِ بصرہ کا ذکر جتنا جمیل ہے اتنا ہی طویل ہے اور اس کی تفصیل سے احتراز ہی مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپیڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹ مٹھا مرکب تھی اور اس میں شک نہیں کہ شاہدے کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لئے قابلِ برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بصرے کی با معنی اور رنگین شام تھی لیکن ظاہر تھا کہ بصرے کے لذائذ ہمارے قوائے عسکری پر بتدریج غالب آ رہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی خدمت لینا مقصود تھا تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بصرہ سے نکال کر کارزار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دور نہیں تھا۔"(۴۷)

شفیق الرحمن کا سفرنامہ "دجلہ" ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے سفرنامے "دجلہ" کے ذریعے اس صنف میں مخصوص دلکش [illegible] موثر اسلوب کا اظہار کیا ہے وہاں اپنے مشاہدات اور تجربات کی بدولت "دجلہ" کو اردو ادب کا ایک منفرد اور رجحان ساز سفرنامہ بنا دیا ہے۔ اس سفرنامے میں رومانویت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے عشق کی داستانوں کا ذکر بھی چھیڑ دیتے ہیں اور جہاں کہیں کسی خوبرو خاتون کو دیکھتے ہیں اس کے حسن و جمال کو فوراً دل کے ساتھ ساتھ صفحۂ قرطاس پر بھی منتقل کر دیتے ہیں۔ "دجلہ" اپنی شگفتگی اور اسلوب کی دل آویزی اور افسانوی طرزِ احساس کی بدولت اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ شفیق الرحمن نے مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی کہیں کہیں جنس کا سہارا لیا ہے اور اس کے علاوہ ان کی مجلس آرائی ان کے سفرنامے کا ایک اہم عنصر ہے ان کی پُر لطف اور پر مزاح گفتگوئیں بھی اس مجلسی زندگی کا حصہ ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے ہیں اور مخصوص لطیفے کو ذرا سا موڑ دے کر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں۔ مجموعی طور پر رومانوی طرزِ احساس ان کے ہاں غالب نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"میں نے اصرار کیا کہ وہ میری روانگی سے پہلے دمشق جا کر وہاں یونیورسٹی میں داخلہ لے لے اور میں عنقریب آملوں گا۔ کوئی انگریز لڑکی ہوتی تو فوراً تاڑ جاتی لیکن وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلی گئی۔ جدا ہوتے وقت نہ وہ روئی نہ غم کا اظہار کیا۔ بس مستقبل کی باتیں کرتی رہی جیسے مجھ پر مکمل اعتبار ہو۔۔۔ میں وطن پہنچا۔ وہاں کئی لڑکیاں ملیں۔ ایک سے تھوڑی سی واقفیت بھی تھی۔ اس نے فوراً ان خطوط کا حوالہ دیا جو وہ مجھے لکھا کرتی تھی اور جن میں فقط سکاٹ لینڈ کے گیلے اور سرد موسم کا ذکر ہوا کرتا۔

میں اور وہ غائبانہ رواداری کے سلسلے میں ملنے لگے۔ دراصل جب جنگ کے اختتام پر لڑکے واپس گئے تو کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح جس کے ہاتھ میں ڈور آئی اس نے دبوچ لیا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمارے ہاں شناسائی برائے نام ہی ہوتی ہے۔ نہ کسی ایک لڑکی کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ کسی واحد لڑکے کا۔ کچھ عرصہ تو میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ پھر اسی موسم کے خطوط لکھنے والی لڑکی سے منگنی کر لی۔ منگنی کے اگلے دن نہ جانے کہاں سے ایک پرانی ہم جماعت آنکلی۔ اس نے ضد کی کہ چھٹی کے دن باہر لے چلو۔ شہر میں کہیں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ جسے انگوٹھی پہنائی ہے کہیں وہ نہ دیکھ لے۔ چنانچہ اسے چند میل دُور سمندر کے کنارے لے گیا۔ جب ہم چٹانوں پر دھوپ سینک رہے تھے تو سامنے سے ایک جوڑا گزرا۔ لڑکی کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ میری منگیتر تھی جو اپنے کسی پرانے دوست کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں نے کر لی۔"(۴۸)

"کبھی وہ عورت نما لڑکی نظر آتی تو کبھی لڑکی نما عورت۔ بہر حال لڑکی وہ کبھی نہیں لگی۔ ہر وقت کے بناؤ سنگار کی وجہ سے یہ بتانا مشکل تھا کہ کتنے برس کی ہوگی مگر جب اسے غصہ آتا تب چہرہ اصلی عمر کی چغلی کر دیتا۔ لوگوں کو وہ اچھی نہیں لگتی تھی لیکن بُری بھی نہ لگتی۔ مقصود گھوڑا کہا کرتا کہ تہمینہ کی واہی تباہی اور کرخت پن کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس میں کوئی نہ کوئی جاذبیت ضرور ہے۔ اس کے کزن نے بتایا کہ وہ ایک طرح کا ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ آج تک کسی لڑکے نے بھی اس میں دو تین ہفتے سے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ہمیشہ چوتھے ہفتے تک ضرور لڑائی ہو جاتی ہے۔ نہ جانے قصور ان سب لڑکوں کا تھا یا پھر تہمینہ کا۔ لیکن وہ پہلی وجہ کو ہی صحیح مانتی ہے۔ اناپ شناپ ہانکنے کا یہ عالم تھا کہ کچھ کہے بغیر وہ گھنٹوں بول سکتی تھی۔۔۔ کسی زمانے میں ملغوبہ اپنے منگیتر کو انکل کہا کرتی تھی۔ یہ کزن کا ریکٹ بعد میں شروع ہوا۔ کبھی بتاتی کہ ملغوبہ کی چھوٹی بہن کو گلہ رہتا ہے کہ آپا ثابت قدمی سے ایک عمر پر ڈٹی ہوئی ہیں۔ پچھلے مہینے جب انہوں نے اپنی سترھویں سالگرہ منائی تو درحقیقت وہ سترھویں سالگرہ کی آٹھویں یا نویں برسی تھی۔ بیچاری چھوٹی بہن اپنی عمر نہیں بتا سکتی لیکن بالغ ہونے کے لیے کسی نہ کسی روز مجبوراً اسے ملغوبہ سے آگے نکلنا پڑے گا۔"(۴۹)

شفیق الرحمن نے ٹھوس حقائق کو ادبی چاشنی کے ساتھ پیش کیا۔ وہ بظاہر کھلنڈرے سیاح

کے طور پر جلوہ گر ہوئے ہیں لیکن ان کے ہاں مختلف اقوام کی تہذیبی انحطاط کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ انہوں نے صرف منظر کو دیکھا اور پرکھا ہی نہیں بلکہ اس کے اندر بھی جھانکنے کی سعی کی ہے اور اس طرح انسان کے اندر کے اصل آدمی کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے ہیں انہوں نے وہاں کے باشندوں کی نفسیات شناسی کی بھی کاوش کی ہے۔ انہوں نے بعض مناظر ایسے پیش کیے ہیں کہ دورانِ مطالعہ قاری بھی ان سے حظ اٹھاتا ہے۔ اگر ایسے مناظر کو سنجیدگی سے پیش کیا جاتا تو ہوسکتا تھا اتنا اثر پیدا نہ ہوتا۔ انہوں نے ایسے مناظر کو مزاح کے پردے میں پیش کیا ہے شفیق الرحمٰن کے ہاں بعض مقامات پر جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں دراصل وہ زندگی کے بے حد خوش فکر ناظر ہیں۔

مثال کے طور پر یہ منظر دیکھیے:

''انہوں نے ایک الف لیلوی دھن چھیڑی جیسے کوئی فراق زدہ عاشق یا معشوق یا دونوں ازحد کرب کی حالت میں بھوں بھوں رو رہے ہوں۔ سمیعہ کمال کیا آئی طوفان آگیا' زلزلہ آگیا۔

ساز تھرائے واللہ کے نعرے لگے اور رقص شروع ہوا۔ اس کی انگلیوں میں مجیرے تھے جنہیں وہ بڑی فیاضی سے استعمال کر رہی تھی جو تھوڑا سا لباس اس نے ازراہِ کرم پہن رکھا تھا۔ وہ ملتان کی گرمیوں کے لیے تو موزوں ہوسکتا تھا لیکن قاہرہ کی خنک رات کے لیے غالباً مناسب نہیں تھا۔ دمشرق وسطےٰ کا یہ رقص خوب ہے۔ اس میں آرٹ کم ہے اور تھرکنا زیادہ جنبش اتنی تیز کہ نگاہیں ساتھ نہیں دے سکتیں بالکل جیسے کھلونے کو چابی بھر کر چھوڑ دیا جائے۔ پہلے تو وہ آرکیسٹرا والوں کے قریب ناچتی رہی' پھر میزوں کا رُخ کیا۔ راستے میں ستون آیا تو اس کے گرد تین چار چکر لگا دیے۔''(۵۰)

عطاء الحق قاسمی کے ''شوقِ آوارگی'' ''گوروں کے دیس میں'' ''دلی دور است'' اور ''دنیا خوبصورت ہے'' سفرنامے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اردو سفرنامے کو تحریر کی شوخی اور چلبلاہٹ بخشی ہے۔ قاری کو دورانِ مطالعہ میں شوخ فقروں اور ہنستی مسکراتی فضا سے اپنائیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کے سفرناموں میں جنس کے مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد جنس کا بیان نہیں بلکہ مزاح پیدا کرنے کے لیے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں قاری کے لیے دلچسپی کا عنصر پیدا کرنا ہے جیسے وہ اپنے سفرناموں میں ایئر ہوسٹسوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے علاوہ بھی جونہی کسی حسینہ دلنواز کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلم سے شگفتگی کے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

''ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا۔ ایئر ہوسٹس کی اناؤنسمنٹ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد پلاسٹک کی ایک تھیلی میں کاجو اور ایک کیک کا ٹکڑا ماتھے پر بندیا لگائے ساڑھی میں ملبوس ایک ایئر ہوسٹس نے مسافروں کو تھمانا شروع کردیا۔ میں نے ''موازنہ انیس و دبیر'' کی غرض سے انہیں غور سے دیکھا کہ پی۔ آئی۔ اے اور انڈین ایئر لائنز والوں نے بھی ایئر ہوسٹسوں کے انتخاب میں اخلاقی پہلو کو اولیت دی ہے تاکہ مسافروں کے دل میں وسوسے پیدا نہ ہوں اور یوں ان کا ایمان خطرے میں نہ پڑے تاہم اس کے بعد دہلی سے حیدر آباد' حیدر آباد سے بمبئی' بمبئی سے پھر دہلی اور دہلی سے واپس لاہور پرواز کرتے ہوئے مجھے اپنے اس خیال پر نظرثانی کرنا پڑی امید ہے پی۔ آئی۔ اے والے بھی اپنے انتخاب پر ثانی کریں گے۔''(۵۱)

''خود مجھے بہت پیاس لگ رہی تھی چنانچہ تھوڑی دیر بعد مجھے گھنٹی بجانا پڑی۔ جس پر ایک سانولی سلونی ایئر ہوسٹس ماتھے پر گلی بندیا کے ساتھ جگ ہاتھ میں لیے چلی آتی مگر پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہیں تھی ایک دفعہ تو اس کے ماتھے پر بندیا کی جگہ تیوریاں نظر آئیں اس وقت مجھے اپنا ایک دوست محمود بہت یاد آیا میں اور وہ ترکی جا رہے تھے فضا میں پرواز کے دوران ایئر ہوسٹس آئی اور اس نے شائستگی سے پوچھا آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ محمود نے اپنی عینک اتاری اس کے شیشے صاف کیے اور پھر آغا حشر کے کسی رومانوی کردار کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عاشقانہ انداز میں کہا جو آپ پلا دیں! اس پر میں اپنے جوس سے بھی محروم ہوگیا کیونکہ وہ واپس ہی نہیں آئی آج سید ضمیر جعفری میرے ہم سفر تھے تھوڑی دیر بعد کھانا ''سرو'' ہونے والا تھا میں نے انہیں بھوکا رکھنا مناسب نہ سمجھا چنانچہ خود پیاسا رہنا منظور کرلیا۔۔۔ اب جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ سیڑھیوں کے قریب وہی ایئر ہوسٹس ہاتھ جوڑے کھڑی مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی۔ محمود یہاں ہوتا تو وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔''(۵۲)

عطاء الحق قاسمی اپنے سفرناموں میں غیر ملکی معاشرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے وطن میں رہنے کی برکات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کی چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان کی عریانی اور فحاشی پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ بظاہر مزاحیہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے بات

کسی لطیفے یا واقعے سے شروع کرتے ہیں اور پھر ان کے پردے میں گمبھیر معاشرتی، تہذیبی اور معاشی مسائل کو بے نقاب کرتے جاتے ہیں لیکن وہ بات اس سلیقے سے بیان کرتے ہیں کہ قاری بدمزہ نہیں ہوتا۔ اس طرح ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں جن سے مغربی معاشرے کی بے راہ روی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

''میں نے دیکھا کہ لوگ سفرنامے پڑھتے ہیں اور اس کے بعد اپنے وطن میں ان کا دل ہی نہیں لگتا اور وہ ویزوں کے حصول کے لیے کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانا شروع ہو جاتے ہیں، اس خواہش کے پیچھے ہمارا غیر منصفانہ معاشی نظام، کونونیٹ، کیتھڈرل، ایچی سن کالج، امریکن سکولز، طبقاتی اونچ نیچ، خود غرض رویے اور ''مور اوور'' کے طور پر سفرناموں کی ترغیب بھی شامل ہے۔ چنانچہ ہوتا یوں کہ یار لوگ ''مسلح جدوجہد'' کے بعد امیگرنٹ ویزا حاصل کرتے ہیں اور پھر امریکہ یا یورپ میں جا آباد ہوتے ہیں ہنی مون پریڈ یعنی ابتدائی زمانہ تو بہت اچھا گزرتا ہے مگر پھر ایک دن یوں ہوتا ہے کہ گھر سے والد یا والدہ کی وفات کی اطلاع ملتی ہے جس نے بیٹے کی شکل دیکھنے کے لیے آخری وقت تک اپنی آنکھیں کھلی رکھیں مگر وہ جنازے کو کاندھا دینے بھی نہ پہنچ سکا۔ اسی طرح ایک دن وہ اپنی بیٹی کے کمرے کا دروازہ ناک کرتا ہے اور اندر سے آواز آتی ہے ''ڈونٹ ڈسٹرب می پاپا، آئی ایم ود مائی بوائے فرینڈ'' پھر ایک دن اسے اپنا کلچر یاد آتا ہے۔۔۔ میری خواہش ہے ہم اسی معاشرے کو خوبصورت بنائیں جس میں ہم نے اور ہماری آئندہ نسلوں نے اپنی ثقافت اور اپنی روحانی قدروں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔''(۵۳)

''ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے بچے بچیاں اسکولوں اور کالجوں میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ کوئی پاکستانی مسلمان لڑکی کسی ہندو یا سکھ لڑکے سے محبت کی پینگیں بڑھانے لگتی ہے یا کوئی ہندو سکھ لڑکی کسی مسلمان لڑکے کے ساتھ فرینڈ شپ کر لیتی ہے حتیٰ کہ کئی دفعہ شادی کی نوبت آ جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ پھر فساد ہوتا ہے، سر پر سے پگڑی اتار کر بیٹی کے پاؤں میں رکھی جاتی ہے، کبھی یہ پگڑی لڑکے کے باپ کے پاؤں میں رکھ دی جاتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو سمجھائے مگر پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے پھر خونریز ہنگامے بھی ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں اسی مسئلے پر لندن میں خوفناک فساد ہو گیا تھا۔ تو کیا مسلمان لڑکیاں بھی ہندوؤں سکھوں سے شادی کر لیتی

ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیوں نہیں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں، دراصل جب انسان صرف پاؤنڈ کمانے کی غرض سے وطن چھوڑ کر آ جائے اور اپنے بچوں کو ایسے معاشرے میں بغیر کسی رہنمائی کے دھکیل دے جہاں اپنی قدروں کے بچاؤ کی کوئی صورت ہی نہیں تو پھر یہ دن تو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔'' ''یہاں کئی پاکستانی لڑکیوں نے انگریزوں سے بھی شادیاں کر رکھی ہیں۔'' امام نے اعجاز کی تصدیق کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی اور اس ضمن میں وہ جو تکنیک استعمال کرتی ہیں وہ بہت لاجواب ہے وہ اپنے انگریز بوائے فرینڈ سے کہتی ہیں کہ وہ ان کے علاقے کی مسجد میں چند روز کے لئے جانا شروع کر دے اور پھر ایک دن اعلان کرے کہ وہ امام صاحب کی تبلیغ سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے چنانچہ مبارک سلامت کے شور میں وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد اپنی گرل فرینڈ سے شادی کر لیتا ہے۔ پاکستان میں جو علمائے کرام اور مساجد کے منتظم یہ اعلان کرتے ہیں کہ برطانیہ میں اتنے انگریز ان کے واسطے کی بدولت یہ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر وہ انگریز اسی قسم کے مسلمان ہوئے ہیں۔''(۵۲)

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں ان کی شگفتہ نگاری اور مشاہدے کی گہرائی کے بے مثال نمونے ملتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں فراوانی شوق، شوخی تحریر اور حالات و واقعات کی رنگینی بھی [illegible] محض حظ اٹھانے کے نقطہ نظر سے ان کے سفرناموں کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس میں کئی [illegible] کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کے سفرناموں میں ان ممالک کی تمدنی اور معاشرتی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے کسی بھی جذبے یا احساس کو چھپانے یا اس پر ریاکاری کا پردہ ڈالنے کی ہرگز کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے اس کا برملا اظہار کیا ہے اور خصوصاً مغربی معاشرے کے چہرے سے نقاب کشائی کی نہایت عمدہ کوشش کی ہے اور بعض مقامات پر تو انہوں نے نہایت بے دردی سے اس معاشرے کے چہرے کا نقاب نوچ پھینکا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں سفر کے تاثرات کو [illegible] مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے اس طرح انہوں نے شگفتہ انداز میں نہایت سنجیدہ موضوعات کو بیان کیا ہے اور ان کے ہاں جنس نگاری کے جو متعدد نمونے ملتے ہیں ان کا مقصد حقائق کو بیان کرنا ہے۔ نہ کہ حظ اٹھانا۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے

''رات بارہ بجے کے قریب ہوٹل پہنچے تو باہر سڑک پر ہی بے پناہ شور

سنائی دیا جس کی لہریں ہوٹل سے باہر سڑک پر آ رہی تھیں' چنانچہ میں اور کچھ دوسرے دوست اپنے کمروں میں جانے کی بجائے اس شور کی "تلاش" میں نکل کھڑے ہوئے بالآخر سراغ مل گیا' پتہ چلا کہ اس شور شرابے کا ماخذ ہوٹل کا دوسرا فلور ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک "دوشیزہ" "شائقین کے سامنے اپنے کپڑے ایک ایک کر کے اتارتی جاتی ہے اور شائقین ہر "بند قبا" کھلنے پر داد و تحسین سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ غالباً وہی "پرائیویٹ پارٹی" تھی جس کی سہولت کا اعلان ہوٹل کی طرف سے شائع شدہ بروشر میں کیا گیا تھا!" (۵۵)

"سامنے ایک سرخ و سفید حسینہ اپنے بالائی حصے پر اپنے قد سے زیادہ بوجھ اٹھائے کھڑی تھی اور اس بوجھ پر مختصر سا بلاؤز تھا جو سفید دودھیا پیٹ اور اس پر سلیقے سے بجی ناف کو چھپانے سے قاصر تھا اور نیچے ہاف پینٹ یعنی جانگئے سے ذرا بڑی نیکر تھی اور ظاہر ہے اس کے نیچے سڈول ٹانگیں اور بھری بھری سفید رانیں تھیں۔ ابھرے ہوئے بلاؤز پر جلی حروف میں لکھا تھا "I am sexy" اللہ جانے کس بے ہودہ شخص نے اس حقیقت سے اختلاف کیا تھا جو اس حسینہ کو اپنے دعوے پر اصرار کرنا پڑا۔ یہ اگرچہ کوئی مقامی مخلوق تھی لیکن آسمان سے اتری ہوئی لگتی تھی۔ اس کے خد و خال سے ظاہر ہوتا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران بدبخت انگریز فوجیوں نے مقامی آبادی کی نسل تبدیل کرنے کی جو کوششیں کی تھیں وہ کم از کم اس کیس میں پوری طرح کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔۔۔ وہاں اور بھی بہت سے تھے جو شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد بھنبھنانا شروع ہو گئے تھے وہ باری باری اس کے پاس آتے اور سرگوشیوں میں من من کر کے چلے جاتے کچھ ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ حسینہ For Sale ہے تاہم "Sale" پر نہیں بلکہ پورے دام وصول کرنا چاہتی ہے۔" (۵۶)

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں مغرب کی مادہ پرستی' نام نہاد ترقی' بے حیائی اور آزادی نسواں کا تذکرہ بہت زیادہ ملتا ہے۔ اس طرح وہ جنسی لذت کے بیان سے لطف اندوز نہیں ہوتے بلکہ ان معاشروں کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جو عورت اور شراب میں سکون تلاش کرتے ہیں' جنس اور رومان کی آغوش میں پناہ تلاش کرتے ہیں' اپنی جنسی تشنگی کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ جدید مغربی معاشرے میں عورت بظاہر آزاد ہو چکی ہے لیکن اس کا مقام پہلے سے بھی پست تر ہو گیا ہے۔ صنعتی انقلاب نے بے شک اسے مرد کی صدیوں کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے لیکن اس آزادی نے

اسے ہوس کاری کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور وہ نہیں جانتی کہ ہوس کی یہ غلامی مرد کی غلامی سے کہیں بدتر ہے۔ فرائڈ کا نظریۂ اظہار جنس نے اہل مغرب کو جنسی بے راہ روی کا علمی جواز بہم پہنچا دیا ہے چنانچہ وہ نہایت انہماک کے ساتھ جذبۂ جنس کا بے محابا اظہار کرنے لگے ہیں اور یہ علاج بذاتِ خود لاعلاج مرض بن گیا ہے۔ اُن معاشروں میں معروف ہوس کاری سے لوگوں کی تسکین نہیں ہوتی تو عجیب و غریب غیر فطری اور گھناؤنے طریقے وضع کیے جاتے ہیں جنہیں سفلی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ ان معاشروں کی بے پردگی اور ہوٹلوں میں ہونے والی پارٹیوں جو کہ ہر خاص و عام کے لیے دعوت نظارہ اور دعوت گناہ کے طور پر منعقد کروائی جاتی ہیں ان کو بھی سفرنامہ نگار نے بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں میں خصوصاً مغرب میں مخلوط پارٹیوں' کلبوں' ہوٹلوں' بازاروں اور سینماؤں کی رونق کو بڑے شگفتہ انداز سے بیان کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے مرد و عورت کے انداز نظر پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ مغرب کی زحمتوں یعنی نمائش' تصنع' بے پردگی' بے حیائی' بے حجابانہ میل جول کا نقشہ بھی جگہ جگہ کھینچا گیا ہے۔ انہوں نے وہاں کی عائلی زندگی کی جھلکیاں بھی اپنے سفرناموں میں پیش کی ہیں جیسے وہاں کے شوہر میں حمیت و غیرت نہیں ہے بلکہ یہ عالم ہے کہ بیوی شوہر کی آنکھوں کے سامنے غیر مردوں سے ہنستی بولتی' چہلیں کرتی اور بعض اوقات سینہ سے سینہ ملا کر ڈانس بھی کرتی ہے لیکن شوہر کے کان پر جوں تک بھی نہیں رینگتی۔ یہ سب "تہذیب" اور "ترقی" کے کرشمے ہیں مغرب کی مادہ پرستی کی ہوس نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔ اور ان کی گمراہ کن تہذیب سے عطا کہیں بھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اکثر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ اس سلسلے میں جنس کے بیان میں بھی ان کے قلم میں تیزی آجاتی ہے جو کہ دراصل ان کی تہذیب کی عکاسی کر رہی ہوتی ہے۔ اس طرح عطا کے ہاں جنس نگاری کے تہذیبی نمونے بھی اکثر مقامات پر ملتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"مجھے اس معاشرے کے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے میں شبہ ہے جہاں عورت کی ذلت کو قانونی تحفظ حاصل ہو چنانچہ میرے لئے ان ملکوں کو مہذب اور ترقی یافتہ تسلیم کرنا ہمیشہ سے مشکل رہا ہے جہاں کے مرد حکمران عورت کو آزادی کا بہانہ دے کر اسے نائٹ کلبوں کے اسٹیج پر ہزاروں مردوں کے سامنے برہنہ ہونے کی آزادی فراہم کرتے ہیں۔ سیٹیاں بجاتے ہوئے مردوں کے جم غفیر کے سامنے عورت اور مرد کے تعلق کو خلوت سے جلوت میں تبدیل کرتے ہیں' کتوں' خنزیروں اور گدھوں کے ساتھ ان کی محبت دکھاتے ہیں۔" (۵۷)

"زندگی کا محور اشیاء کا حصول قرار پاتا ہے اور اس کی خاطر جوان خوبرو لڑکیاں بدشکل مالدار بوڑھوں کے ساتھ شادی کرتی ہیں' سڑکوں پر بزنس تو (کاروباری محبت) کی آوازیں لگاتی ہیں' رسالوں کے لیے عریاں تصویریں اترواتی ہیں' سٹیج پر سینکڑوں مردوں کے سامنے خلوت کو جلوت بنا دیتی ہیں۔ میرے خیال میں عورت کی جس قدر تذلیل نظام زر نے کی ہے دنیا کا کوئی دوسرا نظام اس کی نظیر پیش کرنے کی "جرات" نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بوڑھوں کو سسک سسک کر مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خاندانی جھگڑوں کی صورت میں بچے والدین کے التفات اور محبت سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کے لئے بظاہر ایک جنت بسائی گئی ہے مگر یہ ظاہر ہے باطن انتہائی تاریک ہے چنانچہ جو نظام بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کی تذلیل کرتا ہے' میں اسے تہذیب یافتہ نظام ماننے سے انکاری ہوں۔ انسان کو اس کی ذات میں تنہا اور اداس کر دیا گیا ہے۔ مشینوں کے سامنے اس کی حیثیت ثانوی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اسے ان مشینوں میں استعمال کرنے کے لیے پالا پوسا جاتا ہے چنانچہ مغرب میں ترقی انسان نے نہیں کی' مشینوں نے کی ہے۔"(۵۸)

عطاء الحق قاسمی بے حیائی' بے پردگی' مہذب معاشروں کی نازیبا حرکات اور چوماچاٹی کے بیان تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ان کے سفرناموں کا ایک اہم موضوع ہم جنس پرستی بھی ہے انہوں نے نہ صرف اسے بیان کیا ہے بلکہ انسانی نفسیات کی گرہیں بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں اس عمل سے بھی بے راہ روی بد اخلاقی اور بے حیائی کی راہیں کھلیں ہیں۔ انہوں نے ان معاشروں کی جنسیت زدگی' ہم جنس پرستی' عریانی اور بے راہ روی کو شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے اور کہیں بھی جھجک اور شرم کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں جس شدت سے سوچتے ہیں اس کا اظہار بغیر منافقت کے کرتے جاتے ہیں۔ انہوں نے جن معاشروں میں غیر فطری جنسی تعلقات کو دیکھا اس کو بڑی بے باکی سے بیان کر دیا۔ خصوصاً مغرب میں جنسی تسکین حاصل کرنے کے لیے لوگ یہ غیر فطری فعل اختیار کرتے ہیں جو کہ دراصل ایک بیماری ہے۔ ہم جنسیت پرستی کے مرض میں لوگ کیسے مبتلا ہیں اور ان معاشروں میں لوگ کس طرح کھل کھیلنے کے عادی ہیں یہ عطا کے سفرناموں کا ایک بہت اہم موضوع ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنس نگاری کے یہ نمونے محض تلذذ کے لیے نہیں بلکہ حقائق کو بیان کرنے کے لیے عطا کے ہاں ملتے ہیں۔ چونکہ جنس زندگی کا حصہ ہونے کی حیثیت سے ادب کا اہم موضوع ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں بھی جنس نگاری کے حقیقی

اور تہذیبی نمونے جابجا ملتے ہیں۔ ہم جنس پرستی کے ضمن میں یہ اقتباسات دیکھیے:

"فیلینٹسی ریستوران میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی' یہاں بے شمار جوڑے پہلے سے اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ "جوڑے" اس لئے کہ مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پھرنے کا تصور صرف ہمارے ہاں ہے۔ مغرب میں بھی یہ تصور موجود ہے مگر جو مرد' مردوں کے ساتھ پھرتے ہیں' انہیں گیز (Gays) اور جو عورتیں' عورتوں کے ساتھ پھرتی ہیں' انہیں "لیزبین" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے مریضوں کے لئے علیحدہ کلب اور تفریح گاہیں موجود ہیں۔"(۵۹)

"شرابی اس پر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہتا ہے۔" یہ آزادی نسواں وغیرہ تو سب فراڈ ہے۔ تمہیں دراصل مردوں سے نفرت ہے اور تم سب ہم جنسی کی دلدادہ ہو۔ اپنے اس غیر فطری فعل پر پردہ ڈالنے کے لیے تم نے آزادیٔ نسواں کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔"

تحریک آزادیٔ نسواں کی کارکن اشتعال میں آئے بغیر اس الزام کا جواب پورے تحمل سے دیتے ہوئے کہتی ہے۔ "پہلی بات یہ ہے کہ ہم جنسی غیر فطری فعل نہیں ہے۔ تم اسے غیر معمولی فعل کہہ سکتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تحریک آزادی نسواں کی کارکنوں پر ہم جنسی کا الزام محض اتہام ہے" شرابی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "اگر یہ الزام محض اتہام ہے تو گزشتہ دنوں نیویارک کی سڑکوں سے گزرنے والے تحریک کے اس جلوس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس میں شریک اکثر لڑکیاں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں اور ان میں سے بعض کو سرعام غیر اخلاقی حرکات کرتے بھی دیکھا گیا؟ یہاں پر موجود اکثر لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر مجھے غیر معتبر راوی سمجھتی ہو تو ان ہی سے پوچھ لو۔"(۶۰)

ان مہذب معاشروں کے لاکھوں لوگوں کی ذہنی اور جسمانی اینار میلٹی کو بیان کرنے کے لیے عطا نے اپنا ایک ذاتی واقعہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے اور وہ اس ضمن میں کہیں بھی نہیں چوکے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں چلتے چلتے ایک ایسی سڑک پر آ گیا ہوں جو اتنی زیادہ آباد نہیں لیکن بہت زیادہ ویران بھی نہیں ہے۔ لوگ یہاں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن لگتا ہے وہ تفریح کے موڈ میں نہیں بلکہ کسی کام سے باہر نکلے ہیں' شاید یہ سڑک شاہراہ سے ہٹی ہوئی

ہے ورنہ سیٹرڈے نائٹ کو اتنی اداس نظر نہ آتی۔

''ہیلو'' ایک آواز میرا راستہ روکتی ہے۔

یہ ایک معمر جاپانی ہے جو تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہے مجھے اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کیونکہ جاپانیوں اور چینیوں کی عمر کا صحیح اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔ میرے حساب سے وہ چالیس پنتالیس کے پیٹے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کا ٹن تھا اور وہ بینچ پر ریلیکسنگ موڈ میں بیٹھا تھا۔

''ہیلو'' میں نے خوشدلی سے اس کے ''سلام'' کا جواب دیا۔

لگتا ہے تم بھی میری طرح سیاح ہو اور ان گوروں سے ملنے آئے ہو جو آج بھی اپنے برطانوی آباؤ اجداد سے ناتہ جوڑے ہوئے ہیں۔''

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ گپ شپ کے لئے کوئی ''اسامی'' تلاش کر رہا ہے، میں بھی چلتے چلتے تھک گیا تھا چنانچہ دم لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

''تمہارا اندازہ صحیح ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے ہم نے بھی ابھی تک اپنے ''برطانوی آباؤ اجداد'' سے ناتہ جوڑا ہوا ہے۔'' ''اوہ! یقیناً تم انڈین ہو۔'' اس نے ''نیوہ'' لگایا لیکن مجھے اس کا یہ ''نیوہ'' اچھا نہیں لگا ''میں انڈین نہیں، پاکستانی ہوں'' ''ہم جیسے بھی ہیں لیکن پاکستانی ہونے کا افتخار ابھی تک ہم میں باقی ہے چنانچہ ہمیں کوئی انڈین کہے تو ہمیں اچھا نہیں لگتا!

''اوہ پاکستانی! تم لوگ افغانستان میں بہت بہادری سے لڑے ہو۔''

مجھے سمجھ نہ آئی کہ میں اس کے ان ریمارکس کا شکریہ ادا کروں یا اسے بتاؤں کہ ہم یہ جیتی ہوئی جنگ ہار چکے ہیں اور وہ لوگ جو ہمیں ''اشکل'' دینے والے تھے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر اب اطمینان سے الگ جا بیٹھے ہیں!

''بیٹھو کھڑے کیوں ہو'' اس نے پرے سرک کر میرے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ اب میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے قریب دھرے بیگ میں سے بیئر کا ایک ٹن نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو پیو''

میں نے معذرت کی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا ''اتنی معذرت کی ضرورت نہیں، ہمارے ہاں بھی بہت سے بدنصیب صرف پانی پر گزارہ کرتے ہیں۔''

وہ خاصا دلچسپ شخص تھا اور معقول حد تک پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں؟'' اس چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے جاپانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے اچانک یہ جملہ کہا۔

مجھے یہ جملہ ''حملہ'' محسوس ہوا جو میرے لئے غیر متوقع تھا کہ لفظ یعنی جملہ اگر کسی خاتون کی طرف سے ہوتا تو اس پر خوش ہونے کی بہت گنجائش موجود تھی لیکن یہ جملہ ایک مرد کی طرف سے تھا۔ پہلے میرے دل میں اس شخص کے لئے کچھ وسوسے پیدا ہوئے مگر پھر میں نے سوچا کہ جاپان بھی تو مشرق ہی میں ہے، ممکن ہے ہماری طرح وہاں بھی کسی مرد کو دوسرے مرد کی تعریف کرنے کی ''اجازت'' ہو مغرب میں تو اس کی گنجائش نہیں، یہاں یہ کام صرف گیز ''Gays'' یعنی مرد پرست کرتے ہیں۔

مگر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ سرک کر میرے قریب آ گیا اور میری رانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ''تمہیں میری یہ تعریف بری تو نہیں لگی''؟

میں اب بھی اس شخص کے حوالے سے گومگو کی کیفیت میں تھا، میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تعریف کسے بری لگتی ہے لیکن تم میری رانوں سے ہاتھ اٹھا لو تم جانتے ہو مغرب میں اس کا کیا مطلب ہے؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں'' وہ میرے اور قریب آ گیا ''اب جاپان میں بھی اس کا یہی مطلب ہے۔''

''بیٹھو بیٹھو اتنی کیا جلدی ہے'' وہ بولا ''سیاحوں کو کمپنی کی ضرورت ہوتی ہے اور یقین جانو تم میری کمپنی سے مایوس نہیں ہو گے۔''

وہ یقیناً ان لاکھوں بدنصیبوں میں سے ایک تھا جو اپنی جسمانی اور ذہنی ابنارمیلٹی کے ہاتھوں بے بس ہیں اور پورے کرہ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سوچا۔ ہر مرد میں زنانہ ہارمونز اور عورت میں مردانہ ہارمونز ہوتے ہیں اور ان کے تناسب میں اگر گڑبڑ ہو جاتے تو یہ مخلوق جنم لیتی ہے جو مرد ہوتے ہوئے بھی عورت ہوتی ہے اور عورت ہوتے ہوئے بھی اس میں مردانہ پن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ذہنی ابنارمیلٹی بھی ہوتی ہے۔ یہ جاپانی بھی جسمانی یا ذہنی ناہمواری کا شکار تھا جس کا ردعمل Passive یا Active صورتوں میں ہوتا ہے چنانچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ابنارمیلٹی کس نوعیت کی تھی۔ میرے خیال میں یہ میرے حق میں بہتر تھا کہ میں نے زیادہ تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اللہ عز تمیں

رکھنے والا ہے۔"(۹۱)

مستنصر حسین تارڑ نے متعدد سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے سفرنامے ان کے اسلوب اور طرز بیان کی وجہ سے بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کے سفرنامے خوبصورت زبان اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں رومانویت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اس طرح کے سفرناموں میں ایک یہ عیب ہوتا ہے کہ سفرنامہ نگار سفرنامے کو افسانہ بنا دیتا ہے اور بعض اوقات ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ جیسے وہ افسانے کا ہیرو ہو اور سیاحت کے دوران میں ہر ملنے والی خوبصورت غیر ملکی لڑکی اس کی عاشق۔ مستنصر حسین تارڑ اس حوالے سے بہت مشہور ہیں۔ ان کے سفرناموں میں رومانوی عنصر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کے سفرنامے پر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ جنس نگاری کی ایسی صورت ہے، جس میں سے کہیں کہیں خودنمائی کی بو آتی ہے۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

"ساری رات ہماری گاڑی فرانس کے وسیع میدانوں اور جنگلوں میں دوڑتی رہی۔ میں نے ڈبے میں سوار مسافروں کا جائزہ لیا۔ ایک غلیظ ہسپانوی مزدور' دوراہیا میں' ایک فرانسیسی جوڑا اور گٹھے ہوئے جسم کی ایک نوجوان عورت جس کا سر نیند کی مدہوشی میں میرے شانے کے ساتھ آلگا تھا۔۔۔ فرانسیسی جوڑا آپس میں گڈمڈ ہو کر سو رہا تھا۔ نوجوان عورت کا سر بدستور میرے شانے پر آرام کر رہا تھا۔ اس کا سانس بے حد گرم تھا۔

"معاف کیجیے گا۔" میں نے آہستہ سے اپنا شانہ ہلایا۔

"اوں" عورت نے نیند میں ڈوبی ہوئی دائیں آنکھ کھول کر کہا اور پھر مسکرا کر میرے اور قریب آگئی۔

"معاف کیجیے گا' میں ڈبے سے باہر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے شانہ جھٹک کر کہا۔ "اوں۔ ہوں۔" عورت نے سر اٹھایا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی اور پھر کندھے سکیڑ کر بڑے مزے سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے ہسپانوی مزدور کے شانے پر سر رکھ کر سو گئی۔ مزدور کے خراٹے بند ہو گئے۔"(۹۲)

"وہ کھسک کر میرے ساتھ آگئی" مجھے معاف کر دو۔ میں بہت بیوقوف ہوں"۔۔۔ وہ سرک کر اور قریب آگئی بغیر آستین کے لباس میں اس کی ڈودھیا باہوں سے وینس کے نم سنگ مرمر کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔۔۔ "وینس میں موت بھی خوبصورت ہے" زبیکا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ لیڈو کے ساحل پر گنڈولا رک گیا۔ "وینس

کی یہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔" "اور میں۔۔۔ اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے خنک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "روم کے "تریوی فوارے" میں سکے ڈال کر دعا کروں گی کہ ہم دونوں پھر وینس میں ہی ملیں۔" میں نے اس کے ماتھے پر پڑی سنہری لٹ کو بڑے پیار سے ایک طرف کیا اور گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر ساحلی دیوار پر آگیا۔ گنڈولے والے نے اپنے لمبے بانس سے ساحل کی دیوار کو دھکیلا اور گنڈولا واپس سان مارکو کی طرف تیرنے لگا۔

"جب موسم بہار میں ابابیلوں کی ڈاریں "کپس ترانو" کے ساحل کو واپس لوٹیں گی یہ وہی دن ہوگا۔۔۔

جب تم میرے پاس لوٹ آؤ گے۔" (ایک اطالوی لوک گیت)(۹۳)

مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں میں اسلوب کی چاشنی اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ ان کے سفرناموں میں افسانوی انداز ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں مزاح کا رنگ بھرنے کے لیے کہیں کہیں جنس کا سہارا لیا ہے۔ انہوں نے بعض واقعات کو بڑے تجسس سے ایسے پیش کیا ہے کہ دوران مطالعہ قاری کے ذہن میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں لیکن اس واقعے کا انجام پھر صرف ایک قہقہے پر ہوتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستنصر حسین تارڑ نے قاری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے مزاح کے مختلف حربوں کا استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں بعض مقامات پر مزاح اور جنس لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"باہر سنہری وانگ لی کھڑی تھی۔ اپنے گلابی فراک میں اور حسب معمول اپنے چاند چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ سجائے جسے دیکھنے سے راہ چلتے لوگ کھمبوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔۔۔ اب پوزیشن یہ تھی کہ میں اپنے شلوار کرتے کی چرمراہٹ میں ایک چغد کی صورت کھڑا ہوں اور میرا ازار بند لٹک رہا ہے۔۔۔ میں نے اپنے تئیں نہایت پوشیدگی سے اسے اڑسنے کی کوشش کی لیکن وہ اڑسے جانے سے انکاری ہو کر پھر سے لٹکنے لگا۔

سنہری وانگ لی نے ظاہر ہے چینی میں کچھ کہا۔۔۔

میں نے بھی کچھ کہا۔۔۔ اور ظاہر ہے چینی میں نہیں کہا۔۔۔ کندھے سکیڑے۔۔۔ اپنے خضاب زدہ بال درست کرنے کی کوشش کی۔۔۔ قدرے مسکرایا۔۔۔

سنہری وانگ لی جو یقیناً اپنے حسن اور آفتابی مسکراہٹ کی اثرانگیزی سے واقف تھی، مجھے نادان اور نروس جان کر میرا ہاتھ تھام لیا اور سر جھٹک کر اشارہ کیا کہ بیوقوف میرے ساتھ آؤ۔۔۔ بیوقوف کے کمرے کے عین سامنے سنہری وانگ لی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔۔۔ وہ اسی طور پر میرا ہاتھ تھامے ہوئے مجھے اندر لے گئی اور اس لمحے مختلف قسم کی قیامتیں میرے اندر برپا ہوئیں۔۔۔ کچھ خفتہ آتش فشاں لاوا اگلنے لگے کہ یا اللہ خیر یہ خاتون میرا ہاتھ پکڑے مجھے اپنے کمرے میں کس سلسلے میں لے جا رہی ہے..... لیکن یکدم اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو کر باہر کی جانب اشارہ کیا۔ کھڑکی سے ہانگ چو کی جھیل نہ صرف پورے کینوس پر پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی بلکہ اُمڈتی ہوئی کمرے کے اندر تک آتی تھی۔ ''بیوٹی فل'' میں نے سر ہلا کر داد دی۔

سنہری وانگ لی نے پھر کوئی مٹھاس بھری بات کی اور زور زور سے سر ہلایا۔۔۔ میں نے بھی تائید میں سر ہلایا اور پھر بھرپور مسرت کا اظہار کیا۔۔۔ اس نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اب ضرور کوئی گڑبڑ ہے میں گڑبڑا گیا اور وہ مجھے کھینچتی پھر سے مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ میرے بیگ کی جانب اشارہ کیا۔۔۔ میں بدھو بنا کھڑا رہا تو اس نے میرا بیگ اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ واپس آئی تو اپنے چند ملبوسات اٹھائے چلی آئی جنہیں اس نے میرے بستر پر رکھ دیا۔ جی ہاں بستر پر اور ان پر ایک نہایت باریک نائٹی بھی تھی۔ اس بار اس نے میرے سوٹ کیس کو گرفت میں لیا اور اسے اپنے کمرے میں چھوڑ آئی۔ لوٹی تو اپنا سوٹ کیس گھسیٹتی آ رہی تھی اور اب جا کر یہ بھید کھلا۔۔۔ میری ناقص عقل میں آیا کہ سنہری وانگ لی کو کہیں سے بھنک پڑ گئی تھی کہ میں جھیل کے منظر والے کمرے کا طلبگار ہوں اور وہ محض ایک اچھی میزبان ہونے کے ناطے مجھ سے کمرے کا تبادلہ کر رہی تھی۔۔۔ البتہ میں نے اس کے ان پیکڈ ''سامان'' کو اپنے کمرے میں شفٹ کرنے میں مدد دی اور یہ ''سامان اٹھاتے ہوئے میرے کانوں کی لوئیں قدرے سرخ ہوئی جاتی تھیں کہ ان میں ہر قسم کے جامے وغیرہ تھے۔۔۔ جب یہ شفٹنگ مکمل ہو گئی تو اس نے اپنی مسکراہٹ کو مزید آتش سامان کیا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔۔۔ میں نے نوٹ کیا کہ میرا ازاربند ابھی تک لٹک رہا تھا۔''(۶۴)

''بائیں ہاتھ پر جب عمارتیں کم ہوئیں اور وادی کھٹمنڈو کی ہریالی وسیع ہوئی تو اس میں ایک دریا پھیلنے لگا۔ جس کے کناروں پر بے شمار خواتین یا تو گھریلو

کپڑے پٹخ پٹخ کر دھوتی تھیں یا اس میں اپنے آپ کو دھوتی اور اشنان کرتی تھیں۔۔۔ اور ایسے کرتی تھیں کہ کھٹمنڈو ایئرپورٹ پر متعین زنانہ پولیس کے براؤ ہیس کی مانند اُن کے براؤ ہیس بھیگی ساڑھیوں میں بدن سے چپکتے نمایاں ہوتے تھے یا ان کی ناف سے اوپر جو حصے تھے انہیں وہ تازہ ہوا اور دھوپ سے آشنائی کی خاطر کھلا چھوڑتی تھیں۔ اور سوائے ہمارے انہیں کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ کیونکہ ہم ایک پاک سرزمین سے آئے تھے انہیں جی بھر کے دیکھتے تھے اور لاحول پڑھ کر اپنے اس گناہ کی تلافی کر دیتے تھے۔۔۔ اس جزیرے میں داخلے کی شرط صرف یہ تھی کہ جو بھی آئے صرف برہنہ پا ہی نہیں برہنہ بدن بھی آئے اور اگر وہ ازحد شرمیلا ہے تو زیادہ سے زیادہ جاپانی سومو پہلوان کی برائے نام سی لنگوٹی پہن کر آئے۔۔۔ میں نے وہاں ایک ہینڈ پمپ سے پانی بھرتی خواتین کے ڈھیلے اور الجھتے ہوئے بدن کو دیکھا۔ مقامی چرچ میں اسی حالت غیر میں موم بتیاں جلاتے دیکھا تو انسانی بدن کی یکسر یکسانیت سے آگاہ ہوا اور بیزار ہوا۔۔۔ اس کا بھید اور شہوت صرف پردے اور لباس میں پنہاں تھی۔۔۔ تو میں دیکھ چکا ہوں۔۔۔ مجھے ترغیب نہ دیجیے۔۔۔''(۶۵)

مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے قارئین بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس میں بارہ مصالحوں کی چاٹ شامل کر دیتے ہیں۔ وہ شاید جانتے ہیں کہ قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے آج کے قاری کی یہی خواہش ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے سیر بھی کر لی جائے اور جنس کے حوالے سے چٹخارے دار باتوں سے اس کی ذہنی عیاشی بھی ہو جائے گویا مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ وہ اپنے سفرناموں کو یورپی میموں کے تذکرے سے رنگین بنا دیتے ہیں خصوصاً نائٹ کلب، پب، شراب، شباب اور مغربی ساحل کا ذکر پڑھنے والے کے جذبات ابھار دیتا ہے۔ ان کے سفرناموں میں جنس نگاری کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ ہر پڑھنے والا اپنے انداز میں سوچتا ہے اور حظ اٹھاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''مرزا صاحب نے ہوٹل کے لان میں چند ان پیکڈ قسم کی جسموں کو ٹانگیں پھیلائے دھوپ سینکتے ملاحظہ کیا تو نہ صرف ان کی باچھیں کھل گئی بلکہ جانے کیا کیا کھل گیا۔ انہوں نے فوراً دوبارہ شیو کی۔ ایک سگار سلگایا اور نزدیک ترین میم کے ساتھ دھڑا دھڑ انگریزی بولنی شروع کر دی۔ میم ہکا بکا رہ گئی اور سر ہلانے لگی کہ میں نہیں سمجھ

سکی۔" کمال کی میم ہے انگریزی نہیں سمجھتی۔" مرزا صاحب بولے۔" میرا خیال ہے میم جرمن ہے۔" شاہد صاحب نے اطلاع دی اور شاہد صاحب کے ٹو موٹل میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں مقیم نسوانی آبادی کا مکمل بایوڈیٹا حاصل کر چکے تھے۔ یہ نہیں کہ انہیں خواتین میں دلچسپی تھی بلکہ یونہی۔ برسبیل تحرک! بہر حال مرزا صاحب نے فوراً پینترا بدلا اور دوسری میم کی طرف راغب ہو گئے۔۔۔ یہ شمالی علاقوں کا مخصوص موسم تھا یہاں ایک سیب کے درخت کے پاس دھوپ چھاؤں میں ٹیم کے ممبران کے علاوہ چنگیزی' شیر علی اور ملک صاحب کے ٹو کہانی مہم کے حتمی انتظامات اور منصوبہ بندی کی گفتگو میں شریک ہوئے۔۔۔ "چنگیزی صاحب یہ جو اس کولے کے راستے میں مشہور زمانہ گرم چشمے ہیں۔ یہ کس مقام پر ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ جونہی کوئی غیر ملکی کوہ پیما ٹیم ان کے قریب پہنچتی ہے تو یہ دیہات لوگ اور ان میں خواتین پیش پیش ہوتی ہیں اپنے تمام کپڑے اتار کر قدرتی حالت میں ان میں ڈبکیاں لگانے لگتے ہیں۔" یہ سوال عامر نے پوچھا تھا۔

"اچھا۔۔۔" ڈاکٹر عمر جو آنکھیں بند کر کے دھوپ کے مزے لے رہے تھے یکدم بیدار ہو گئے۔" ویری انٹرسٹنگ۔۔۔ طبی نکتہ نگاہ سے نیوڈ میں نہانا صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔۔۔ ویسے میں نے بھی مبشر سے ان گرم چشموں کی گرم حکایتیں سن رکھی تھیں کہ کس طرح ایک خاتون کوہ پیما جب گرم چشمے میں سے نہا کر نکلی تو کہنے لگی۔ یہ میرے بدن پر اور بالوں میں کچھ کائی اور پتے وغیرہ چمٹ گئے ہیں انہیں اتار دیجئے اور وہ منہ پھیر کر مبشر کے سامنے کھڑی ہو گئی اور مبشر بھی منہ پھیر کر یہ کائی اور پتے اتار رہا جو یقیناً بے حد گرم ہوں گے۔ کم از کم مبشر نے مجھے تو یہی بتایا تھا کہ وہ منہ پھیر کر کھڑا تھا۔۔۔ نعیم کا خیال تھا کہ شاید ان گرم چشموں میں سیمیں بدن خواتین ہمہ وقت موجود رہتی ہیں اور پانی سے اور ان کے بدنوں سے بھاپ اٹھتی رہتی ہے۔۔۔ احمد کی شکل و صورت بہت پیدل تھی اور اس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا تھا لیکن انگریز لڑکیوں میں وہ بے پناہ مقبول تھا اور ہم اس کی مقبولیت سے بے حد حسد کرتے تھے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس فضول سے لڑکے میں کیا خصوصیت ہے جو ہر لڑکی اس کا نام سن کر ایک سسکی سی لے کر' اوہ احمد۔۔۔" کہتی ہے۔ اس دوران ایک خاتون سے میں نے یہی سوال کیا کہ۔۔۔ کیا ہے احمد میں؟ وہ کہنے لگی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ ایک سویٹ اور کڈلی سا ٹیڈی بیئر لگتا ہے' جی چاہتا ہے اسے آغوش میں لے کر خوب بھینچا جائے۔"(۶۶)

"تھوڑی دیر بعد ترک نوجوانوں کی ٹولیاں ہمارے گرد ٹہلنے لگیں۔ اس گہما گہمی کا باعث اینگے تھی جو ایک پتھر پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی اور سکرٹ اونچا کر کے اپنی خوبصورت رانوں پر آئی خراشوں پر کوئی دوائی لگا رہی تھی۔ میں نے اجتماعی سلامتی کے نام پر اس سے درخواست کی کہ وہ فی الحال یہ عمل ملتوی کر دے۔"(۶۷)

مختار مسعود کا سفر نامہ "سفر نصیب" انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں سفر کا پر لطف بیان دوران سفر ملنے والے انسانوں کے دلچسپ مکالمے اور واقعات اس سفر نامے کا حسن ہیں۔ اس سفر نامے میں جنس نگاری کے نمونے آٹے میں نمک کے برابر ملتے ہیں۔ جہاں کہیں جنس نگاری کا نمونہ ملتا ہے اس کا مقصد کسی علاقے کی ثقافت کی نشان دہی کرنا ہے۔ مختار مسعود نے منظر میں کھو جانے کے بجائے تاثر کے فکری زاویے کو اہمیت دی ہے اگرچہ انہوں نے حسن و جمال کو بھی مختلف مقامات پر سراہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"قافلہ مصافحہ اور بغل گیری میں مصروف ہو گیا اور طائفہ سوا گتی ناچ گانے میں جت گیا۔ اتنی ٹھنڈ کے باوجود طائفہ کے دس مرد اور پندرہ عورتوں نے سفید لٹھے اور ململ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آبنوسی جسم پر سفید ململ کا جھلکتا کرتا یوں لگتا ہے جیسے دھوبی نے محنت سے جان چرائی اور نیل زیادہ لگا دیا۔ مردوں نے ململ کی قمیض کھدر کی واسکٹ تنگ موری والا لٹھے کا پاجامہ اور سینڈل پہنا ہوا ہے۔ شانے اور کمر کے گرد چادر لپیٹی ہوئی ہے۔ یہ ساری چیزیں سفید رنگ کی ہیں جو بڑا اجلا لگ رہا ہے۔ ننگے پاؤں ناچنے والی عورتوں کے پاس نہ چادر ہے اور نہ واسکٹ' بس ناف تک آنے والا جمپر ہے اور گھٹنوں تک رہ جانے والا غرارہ۔ بدنظری کے لئے اس لباس میں بہت سے رستے اور رخنے بنے ہوئے ہیں۔ سردی ان جھری دار کپڑوں میں آسانی سے گھس سکتی ہے۔ چند زیورات ننگے پنڈے پر چمک رہے ہیں اور ان سے جتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہے وہ عورت ہونے کی حیثیت انہیں کافی ہے۔"(۶۸)

محمد اختر ممونکا کا سفر نامہ "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" لاہور سے چل کر مشرق وسطی سے ہوتے ہوئے یورپی ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنی جوانی کی مہماتی سرگرمیوں کو شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ سفر نامہ پڑھتے ہوئے بعض اوقات اس پر کسی ناول کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس سفر نامے میں انہوں نے جن حسینوں سے اپنی چاہت کا اظہار کیا نہ صرف اسے بیان کیا ہے بلکہ اپنی ناتک جھانک کے واقعات کو بھی بے تکلفی سے تحریر کیا ہے۔ سفر نامے کے آغاز میں انہوں

نے اس کا اقرار بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پیرس ۲۰۵ کلو میٹر سفر ناموں کی بھیڑ میں ایک اور سفرنامے کا اضافہ نہیں بلکہ یہ سیاحت نامہ ۱۴۱ ڈالر میں ۲۵ ہزار کلو میٹر کی مسافتوں '۱۸دیسوں کی سیاحتوں' ۱۸۴۷ اجنبیوں سے ملاقاتوں اور چند بیبیوں سے چاہتوں کا چشم دید گواہ ہے۔''(۶۹)

محمد اختر ممونکا کے ہاں جنس نگاری کے جو نمونے ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مبالغہ آمیز نظر آتے ہیں۔ انہوں نے شاید ایسا اپنی تحریر میں چٹخارا پیدا کرنے کے لیے کیا ہے۔ اسی لیے یہ سفرنامہ کہیں کہیں ناول لگنے لگتا ہے۔ اس میں انہوں نے زیادہ تر لڑکیوں سے اپنے تعلقات کے قصے بیان کیے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ایک نقاد نے لکھا ہے کہ:

''اختر ممونکا کے ہاں لڑکیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ جب اس سیاحت نامے کے دو چار صفحات میں سے کوئی ایک بھی الھڑ مٹیار نہ جھانکے تو تشویش ہونے لگتی ہے کہ کہیں نصیب دشمناں ہمارے سیاح کے مزاج علیل تو نہیں ہو گئے یا مطالعے کے دوران ہم سے کوئی سطر چھوٹ تو نہیں گئی۔''(۷۰)

محمد اختر ممونکا تانک جھانک میں بھی بہت لذت محسوس کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کے ذہن میں آتا ہے اور وہ جس انداز سے سوچتے ہیں اس کو صفحہ قرطاس پر بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں اگرچہ ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی نمونے مفقود ہیں۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

''یہاں ذکر ہے ان تین لڑکیوں کا جو سنسان حویلی کے اس دھواں دھار کمرے میں ہمارے ساتھ موجود تھیں ـــــ چرس کی مہک ـــــ بے ہنگم قہقہے ـــــ بے ترتیب سانسیں ـــــ لرزتے ہونٹ ـــــ انگور کی بیٹی آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں کا ابدی کھیل جاری ہوا ـــــ نشے بڑھتے گئے ـــــ بھوک بڑھتی گئی ـــــ گرمی بڑھتی گئی ـــــ بے تکلفی بڑھتی گئی اور دہکتے ہوئے انگارے راکھ بن گئے۔''(۷۱)

''جوں جوں جوان خون سے انگور کی بیٹی کے ملاپ ہوتے گئے۔ توں توں حوا کی بیٹیوں کے گریبان چاک ہوتے گئے۔۔۔ اور آدم کے بیٹے بھی بیباک ہوتے گئے۔۔۔ بیباکیاں حد سے بڑھیں تو سرِ عام 'کھیل' شروع ہو گئے۔''(۷۲)

''میں نے دیوار میں بنے ہوئے سوراخ کے ساتھ آنکھ لگا کر دوسرے کمرے میں جھانکا۔ گو کمرے کی بتیاں تو بند تھیں مگر گلی کے لیمپ پوسٹ نے کالے

کاروبار کو روشن کر دیا تھا۔ جس شو کا ذکر مرتضٰے نے پہلے دن کمرہ لیتے ہی کیا تھا۔ وہ زوروں پر تھا وہی مردوں اور عورتوں کا ابدی شو ـــــ وہی زر دے کی ضرورتیں خریدنے والے مرد ـــــ وہ ضرورتیں بیچنے والی عورتیں ـــــ خوراک اور چرس دینے والے افغان بیوپاری ـــــ جسم اور جنس دینے والی یورپین سوداگر ـــــ میں ان گورے اور ٹھنڈے بدنوں کی ہمت کی داد دوں یا ان کی ضرورت کی۔ کیونکہ شفٹیں بدل رہی تھیں اور شو جاری تھا۔ تازہ دم مزدور آتے رہے۔ پسینے سے شرابور مزدور جاتے رہے۔ جسموں کے عرق سے جنس کی آگ بجھتی رہی اور ہم دم سادھے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔''(۷۳)

محمد اختر ممونکا نے خصوصاً یورپ کی فحاشی کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں بجا طور پر کیا ہے لیکن وہ خود بھی ان مقامات سے اپنا دامن بچا کر نکلنے کی کوشش نہیں کرتے دکھائی دیتے۔ محمد اختر ممونکا نے ''پیرس ۲۰۵ کلو میٹر'' میں بہت سی باتیں ناگفتنی ہیں اور ان کا انداز بیان بھی کچھ کھلا ڈلا ہے۔ اکثر مقامات پر اس سفرنامے کے مطالعے کے دوران میں سفرنامہ نگار کی خودنمائی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنس نگاری کا وہ نمونہ ہے جس میں خودنمائی ہی مقصود ہے۔

ان کی تحریریں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کی تحلیلِ نفسی کی ضرورت ہے۔ تحلیلِ نفسی (Psycho-Anaylasis) یعنی شخصیت کے غیر معمولی افعال کے پسِ پشت محرکات کی تلاش کا طریقہ کار ہے۔ فرائڈ نے اپنی کتاب ''تعبیر خواب'' (Interpretation of Dreams) میں تحلیلِ نفسی کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ ان کے خیال میں جس طرح خوابوں میں ناآسودہ خواہشوں کا اظہار ہوتا ہے اگر ادب کی تحلیلِ نفسی کی جائے تو ان تخلیقات میں ان ہی خفتہ تمناؤں کی تشفی ہوتی نظر آئے گی۔ جنسی خواہشوں کی ناآسودگی بچپن ہی سے شخصیت کو ایک مخصوص ڈھنگ سے روشناس کرا دیتی ہے بعد میں نفسی پیچیدگیاں اظہار کے راستوں کا تعین کرتی ہیں۔ فرائڈ کے خیال میں شخصیت تین عناصر کا مجموعہ ہوتی ہے۔

۱۔ اڈ ID ۲۔ انا EGO ۳۔ فوق الانا SUPER-EGO

ID ذہن کا وہ حصہ ہے جہاں ہماری تمام جنسی خواہشات اکٹھی ہوتی ہیں۔ یہ جنسی قوت یا لبیڈو (Libdo) ہمیشہ باہر نکلنے اور شخصیت پر حاوی ہونے کی کوششوں میں مصروف رہتی ہے۔ ''انا'' اس قوت (جنسی) (Erotic Energy) کے لیے مناسب رستے کا انتخاب کر کے شخصیت کو متوازن رکھنے کا فعل انجام دیتی ہے کیونکہ فوق الانا (Super- Ego) تمام جنسی خواہشات کو باہر آنے سے روکتی ہے۔ فوق الانا فرد کے سماجی اور معاشرتی احساس کو ابھار کر ذہنی عمل پر پابندیاں عائد

کرتی رہتی ہے۔

انا یا (EGO)، اڈ (ID) کی خواہشات کے لیے ایسے راستے کا انتخاب کرتی ہے جس سے صرف معاشرے کے لیے قابلِ قبول خواہشیں ہی باہر آسکتی ہیں اور باقی دباؤ (Supression) کا شکار ہو کر دوبارہ اڈ (ID) میں واپس چلی جاتی ہیں۔ گویا اس طرح انا، ضمیر اور جبلت کے درمیان تعمیری طریقوں سے مفاہمت کر کے مضرت رساں اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔ (Super-Ego) یا فوق الانا کی نشوونما سے شخصیت کی تربیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر یہ نشوونما درست خطوط پر نہ ہوئی ہو تو خطرناک نتائج کا خطرہ رہتا ہے۔ فن کار لاشعور سے تحت الشعور تک چھپے ہوئے خیالات کو تحریروں میں سموتا ہے یہی چیزیں مصنف کی نفسی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور اصل محرکات کا پتہ لگانے میں مدد دیتی ہیں۔ گویا تحلیلِ نفسی لاشعور میں جھانکنے کا ایک راستہ ہے جس کے ذریعے ہم تخلیقات کے محرکات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

فرائڈ کے خیال میں ادیب لکھنے کے لیے مجبور ہے کیونکہ اس کے لاشعور میں کوئی بات دبی رہ گئی ہے جس کے ارتفاع پذیر ہونے سے فن پارہ سامنے آیا ہے اور اگر وہ ارتفاع پذیر نہ ہوتی تو کسی ذہنی بیماری کا روپ دھار لیتی اور اگر اس بات یا اُلجھن کو تحلیلِ نفسی کے ذریعے فن کار کے ذہن سے خارج کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ فن کارانہ صلاحیتوں کا عمل ختم ہو جائے گا جس طرح اس کا ذہنی مریضوں کے بارے میں خیال ہے کہ اگر وہ اپنی اُلجھنوں (Complexes) کے اصل محرکات سے آگاہ ہو جائیں تو ذہنی طور پر تندرست ہو جائیں گے۔ فن کار کے تندرست ہونے کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ فن تخلیق کرنے کے قابل نہ رہے بلکہ جنسی ازرجی "تخلیق کی بیماری" کی بجائے صحت مند عوامل کا باعث ثابت ہوگی۔

فرائڈ جنسی قوتوں کی (Sublimation) یا ارتفاع کا ذکر کر کے تخلیقی عمل کی زیادہ وضاحت نہیں کر سکا کہ جبلتیں کس طرح فن کا روپ دھار لیتی ہیں اور کیا جبلتوں کو کسی موثر طریقے سے ادب کے تعمیری رویوں کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایسی تحریروں میں جنسی میلانات کے عناصر کو تلاش کیا جاتا ہے۔ دراصل ایسے "Images" کا مطالعہ ذہنی بیماریوں کی تلاش کی خاطر تلاش کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے جنس نگاری کے ضمن میں یہ چند اقتباسات دیکھیے:

"ہمارے اردگرد بھرپور جسموں کی بھرمار تھی۔ گرم گرم ریت پر لوٹتے ان نیم برہنہ جسموں کا جائزہ لینے کے لیے میری آنکھیں ایکسرے مشین بن گئیں۔ جس

شدت سے ٹکٹکی باندھے میں ان جسموں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر میری آنکھوں میں آتشیں شیشے ہوتے تو یقیناً کئی جسم جل کر راکھ ہو جاتے۔۔۔ مگر میں بدستور دعوت دیدار دیتی گوری لاشوں کے بیچ گھومتا رہا۔ کئی لاشیں تو ایسی تھیں جن سے لپٹ جانے کو جی چاہتا تھا مگر ہم دل کو سمجھاتے گئے اور نگاہیں گرماتے گئے۔ آنکھیں گرماتے گرماتے اپنا جسم جھلسا لیا۔" (۷۴)

"اب میرا ان بیبیوں کی طرف دھیان جانے لگا جو اپنے ہونٹوں پر پیاس سجائے جسموں پر آگ بھڑکائے دوسروں کی پیاس بڑھاتی اور آگ لگاتی پھرتی تھیں۔ جونہی میرے پاس دولت آئی وہ دولت کی پجارنیں بھی منکر نکیر بن کر میرے دائیں بائیں آ کھڑی ہوئیں اور میری کمائی پر اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہوئے آبدار کو آرڈر بھی دے دیا اور بل بھی چکا دیا۔ اس سودے بازی میں جتنا انھیں میری دولت پر حق تھا اتنا ہی مجھے ان کے جسموں پر حق تھا۔۔۔ ہوٹل پہنچا تو زیبی بے خبر سو رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کے سوتے سوتے میں کتنا امیر ہو چکا ہوں۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ پوستن تکیے کو "جپھہ" ڈالے اسی طرح نیند میں بولی۔۔۔ پلیز گو ٹو یور اون روم۔۔۔ میں نے زیبی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "آپ آہستہ بولیں کیونکہ پڑوسیوں کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ زیبی نے سرگوشی کرتے ہوئے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اپنے دل کی بھڑاس نکال بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ کھلا اور شمائل نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں نشے سے بوجھل تھیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید وہ کچھ زیادہ چڑھا گئی ہوگی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ نشہ شراب کا نہیں دولت کا تھا۔ وہ جوئے میں لمبا ہی مال کما کر لائی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا غصہ کافور ہو چکا تھا اور باچھیں کھل کر کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ مجھ سے صلح کرتے ہوئے اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں بھی پکی صلح کے موڈ میں تھا۔ دیر تک صلح کرتا رہا۔" (۷۵)

"بندرگاہ کے قریب جن گلیوں میں جنس کے کاروبار ہوتے ہیں میں وہاں شام ڈھلے ہی سے منڈلانے لگا۔ جوں جوں رات کی سیاہی پھیلتی گئی توں توں ان گلیوں میں جنس کے سودے بجتے گئے۔ میں ملاحوں کی ٹولی میں مل کر ایک قہوہ خانے میں جا پہنچا۔ قہوہ خانے کی دھیمی دھیمی روشنی کے باوجود بار کے قریب کھڑی ایک بی بی مجھے بہت بھائی اور میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس دل ربا نے بھی میرا دل رکھنے کے لیے

ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا۔ مسکراہٹ کا حساب مسکراہٹوں سے چکانے کے بعد میں اس کے ساتھ سریش ہوگیا۔ جس پر اس ستم ظریف نے مجھے اپنا گلاس تھما دیا۔ اس وقت تو وہ زہر بھی پلاتی تو ہم تیار تھے۔ بھلا اس گلابی شے کی کیا بساط تھی۔ ہم غٹ غٹ چڑھا گئے۔ غٹ غٹ چڑھانے کے بعد جو چڑھی تو گویا چوبادم پر کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت میری محبوب کے پہلو میں کھڑے گھنی ڈاڑھی والے چونٹے ملاح نے اسے چھیڑ دیا۔ پھر کیا تھا میری آہنی گرفت اس کے گریبان تک جا پہنچی۔''(۷۶)

محمد اختر مموکا کا سفرنامہ ''پیرس ۲۰۵ کلومیٹر'' کا ۱۹۸۴ء کے ایڈیشن کا سرورق مختلف تھا جبکہ ۲۰۰۳ء کے ایڈیشن میں وہ سرورق بھی تبدیل کر کے ایک انتہائی معیوب تصویر لگا دی گئی ہے۔ جس میں ایک سرخ جوڑے میں ملبوس خاتون اپنے ساتھی مرد کے ساتھ ہم آغوش ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ نگار یا ناشر اولین ٹائٹل کو کتاب کے متن کا اصل یا صحیح عکاس تصور نہ کرتے تھے اس لیے کتاب میں موجود جنسی چٹخارے کو تصویر کے ساتھ گویا قارئین کے لیے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس سفرنامے میں مصنف نے اکثر مقامات پر مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کے ہتھیار سے کام لیا ہے۔ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ ان کے ہاں جنس کی اتنی پھسلن ہے کہ اس میں کہیں کہیں مزاح کا روڑا بھی آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر سفرنامہ نگار کا جنسی اشتہا اس قدر بڑھ گیا ہے کہ مصنف موصوف اپنی اس خواہش کے اظہار پر بھی قابو نہ رکھ سکے اور اپنی جنسی ناآسودگی کو قارئین تک بھی پہنچا دیا۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے جس میں سفرنامہ نگار کی کس بے قابو خواہش کا برملا اظہار ہو رہا ہے:

''اگرچہ رات کی رنگینیوں کے معاملے میں سوئٹزر لینڈ کو یورپ کا قبرستان سمجھا جاتا ہے مگر جینوا میں پھر بھی کاروباری خواتین مل جاتی ہیں۔ ان خواتین کے کاروبار پر قابو پانے کے لیے ایک قانون بنایا گیا تھا۔ جس کے تحت ''سٹریٹ واکنگ'' یعنی کاروبار کے لیے لڑکیوں کے رات کو سڑکوں پر گشت کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ مگر اس قانون کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لیے یہ خواتین سڑکوں پر پالتو کتے لے کر نکلتی ہیں۔ جب ان کو قانون کے پہرہ دار ملتے ہیں تو وہ کتوں کو گھمانے کا بہانہ بنا دیتی ہیں اور جب جسم کے خریدار ملتے ہیں تو کتوں کی سیر ختم ہو جاتی ہے اور جنس کے کاروبار شروع ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ جنس فروشوں پر تو سوئٹزر لینڈ میں خاص سختی کی جاتی ہے مگر سویڈن کی طرح یہاں بھی جنسی جرم یورپ کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑکیوں کو اغوا کر کے ان سے جنسی جبر تو ہر ملک میں ہوتا ہے۔ مگر اس امن پسند ملک میں دو لڑکیوں نے ایک لڑکے کو اغوا کر کے اس سے جنسی جبر کیا۔ اس لیے پٹے مجروح لڑکے کی خبر سن کر ہم نے تو ہر لڑکی کو اشتعال دلوانے کی پوری پوری کوشش کی تا کہ ہم پہ بھی کوئی اسی طرح کا لطیف جبر کرے۔''(۷۷)

اے حمید کا سفرنامہ ''امریکا تو'' ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی یادوں کو اس طرح مربوط انداز میں بیان کیا ہے کہ سفر اور سیاحت دونوں مدغم ہو گئے ہیں۔ اے حمید کے ہاں بھی جنس نگاری کے مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔ اپنے سفرنامے کے آغاز میں ہی انہوں نے نہ صرف اپنی تانک جھانک کا اعتراف کیا ہے بلکہ نظر بازی جو ہمارے معاشرے میں باقاعدہ ایک فن اختیار کر چکی ہے اس پر گہرا طنز بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''میں سرخ و سپید امریکی عورتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جو یہاں معیوب بات سمجھی جاتی ہے لیکن میں ایک ایسے معاشرے سے نکل کر آ رہا تھا جہاں نظر بازی باقاعدہ ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ عورت چاہے جتنی بھی خوبصورت کیوں نہ ہو مجھے اس کی طرف یوں ندیدوں کی طرح نہیں دیکھنا چاہیے چنانچہ اب میں نے خالص مشرقی منافقانہ انداز میں عورتوں کو دیکھنے کی مشق شروع کر دی۔ کبھی میں ان امریکی عورتوں کے گولڈن بال دیکھتا کبھی انار کی طرح دہکتے رخسار اور کبھی شفق کی طرح روشن چہرے۔۔۔۔''(۷۸)

اے حمید کے سفرنامے میں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ انہوں نے امریکی تہذیب کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ وہاں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے کاغذ پر اتارتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سارے واقعات وہ معروضی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے رومانی اسلوب کے ذریعے کڑوی حقیقتوں کو بھی مٹھاس کے ساتھ قاری کے دل میں اتارتے چلے جاتے ہیں ان کے خیال میں مشرقی عورتیں بڑی خوش قسمت ہیں کیونکہ یہاں بہن، بیوی اور ماں کو جو رتبہ حاصل ہے مغرب میں اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ مشرق میں عورت کو باعزت مقام حاصل ہے اور مغرب میں عورت کا احترام صرف اور صرف مصنوعی اور نمائشی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اے حمید کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں جس کے ذریعے انہوں نے مغرب اور امریکہ کی کھوکھلی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''امریکی عورتیں اور مرد لفافوں میں شرابیں، وائن اور شیمپن کی بوتلیں بھر کر کاروں میں رکھتے اور اپنی اپنی راہ لیتے۔۔۔ ٹونی کو ہلکی ہلکی بیئر پہلے سے ہی چڑھی

ہوتی۔ وہ سینڈی سے ہمارے ہاں کے حساب سے ناشائستہ مذاق کر رہا ہوتا تھا۔ سینڈی کی شادی نہیں ہوئی تھی مگر وہ ایک آدمی کے ساتھ ایک بیوی کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ اجمل مسکراتے ہوئے کہتا۔ ''خواجہ دیکھا یہاں کتنی آزادی ہے''؟

اور میں اس سے کہتا۔ ''خدا بچائے ایسی آزادی سے۔'' (۷۹)

> ''مجھے وہ یونانی عورت یاد آرہی ہے جو واشنگٹن میں ماڈلنگ کرتی تھی اور میری ہمسائی بھی تھی اس کا چھوٹا سا پوڈل سفید کتا میری ٹانگوں سے لپٹ جایا کرتا۔ یونانی عورت اسے پیار سے اپنی طرف کھینچتی اور میں کتے کو بظاہر پیار سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے پنجابی میں اسے گالیاں دیا کرتا تھا۔ یہ عورت یونان کی رہنے والی تھی۔ جوانی میں بھی ماڈل تھی اور اب جب کہ اس کی عمر ڈھل رہی تھی ماڈلنگ ہی کرتی تھی اور کافی اور صحت افزا مشروبات کے اشتہاروں میں آتی تھی۔ ایک روز ہم دونوں بٹن دبا کر لفٹ کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کا رنگ سبزی مائل زرد خوبانی جیسا تھا۔ اس کے ملبوس سے کاک ٹیل پرفیوم کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مجھ سے اس کی سلام دعا ہو جایا کرتی تھی کہنے لگی ''یہاں کی زندگی پتھر کے زمانے کی زندگی ہے آدمی کو پتھر بن کر کام کرنا پڑتا ہے۔۔۔ ایک بار میں نے اس یونانی عورت سے پوچھا تھا کہ اس کے بچے کہاں ہیں۔ وہ مسکرا کر بولی تھی میری دو لڑکیاں ہیں وہ شادی سے پہلے ہی مجھ سے الگ ہو گئی تھیں جیسا کہ لڑکیاں لڑکے ۱۸ سال کے بعد الگ ہو جاتے ہیں۔ اب وہ شکاگو میں رہتی ہیں کرسمس پر مجھے ان کے کارڈ آجاتے ہیں۔ میں بھی انہیں کارڈ بھیج دیتی ہوں۔ دو برس ہوئے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں بھی ان سے ملنے نہیں جا سکتی۔'' (۸۰)

امجد اسلام امجد نے دو سفر نامے تحریر کیے ''شہر در شہر'' اور ''ریشم ریشم۔'' ''شہر در شہر'' میں دو سفر نامے شامل ہیں۔ ایک تو پیرس، مانٹریال، واشنگٹن، ٹورنٹو، لاس اینجلس، شکاگو اور لندن وغیرہ کا سفر ہے اور دوسرا ہندوستان کے شہروں انبالہ، سہارنپور اور دہلی کا۔ ''ریشم ریشم'' میں انہوں نے اپنے چین کے سفر کا احوال درج کیا ہے۔ امجد کے سفر نامے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے سفر نامہ نگار بھی ہیں۔ امجد کے سفر ناموں کا ایک اہم جزو لطیفے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ لطیفہ گوئی بھی ان کا خاص میدان ہے۔ امجد یوں تو مشاعرے پڑھنے کے لیے بیرون ملک گئے تھے لیکن شاید ان کا اصل مقصد سفر نامہ لکھنا تھا۔ وہ سفر کے آغاز سے اختتام تک ڈائری لکھتے رہے تاکہ بعد میں ان یادداشتوں کو سفر نامے کی صورت دے دی جائے۔ لندن

میں جب مشتاق احمد یوسفی کو ان کے اس منصوبے کا علم ہوا تو انہوں نے امجد کو سفر نامہ نہ لکھنے کا مشورہ دیا کیونکہ ان کے خیال میں جو آجکل سفر نامے لکھے جا رہے ہیں وہ حقیقت نگاری کی آڑ میں فکشن نگاری ہے بلکہ وہ رومانی افسانے ہیں اور اس میں جنس کی بھرمار ہے۔ امجد نے اپنے سفر نامے ''شہر در شہر'' میں بارہ مصالحے کی چاٹ سے اجتناب کیا ہے۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''لندن میں مشتاق احمد یوسفی صاحب نے ملاقات کے دوران بڑے خلوص اور دلسوزی کے ساتھ مجھے سفر نامہ لکھنے سے منع کیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ ان جیسے باکمال آدمی کا مشورہ نہ ماننا کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ میں نے ان کے اس مشورے کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ سفر ناموں سے ان کی بیزاری کی اصل وجہ ان کی حالیہ بہتات اور حقیقت نگاری کے پردے میں کی جانے والی فکشن نگاری ہے جس نے سفر نامے کو ناول یا چھوٹے چھوٹے رومانی افسانوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے آپ میں جھانکنے کی کوشش کی اور جاننا چاہا کہ میں یہ سفر نامہ کیوں لکھنا چاہتا ہوں اور یہ کہ کہیں اس حکایت کو لذیذ اور دراز تر بنانے کے لیے میرا ارادہ بھی افسانہ طرازی کا تو نہیں؟۔۔۔ بہر حال میں یوسفی صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کے انتباہ کی وجہ سے روانی تحریر میں جہاں جہاں بھی افسانہ طرازی کے مقامات آئے یا گنجائش پیدا ہوئی اس سے میں صرف نظر کرتا چلا گیا۔ سو پیارے قارئین اگر آپ کو اس کتاب میں بارہ مصالحے کی چاٹ نہ ملے تو میرے علاوہ یوسفی صاحب کو بھی اس کا ذمہ دار گردانیے گا۔'' (۸۱)

امجد کے سفر ناموں میں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے اور اس طرح ان کے اسلوب میں مزید شوخی آجاتی ہے۔ امجد نے اپنے سفر ناموں کو تاریخی و جغرافیائی معلومات سے گراں بار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سفر نامہ نہیں پڑھ رہا بلکہ امجد کے ساتھ خود بھی سفر کر رہا ہے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے ''ریشم ریشم'' میں چین کی تہذیب و ثقافت کی بھی عکاسی کی ہے اور چینی خواتین پر تبصرہ کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ تبصرے کے ضمن میں وہ بعض اوقات حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں اور بے ساختہ، دل کی پوشیدہ خواہشات کو نوک قلم پر لے آتے ہیں۔

اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیے:

> ''عورتیں مرد اپنے عمر چور چہروں کے ساتھ ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے کہیں منڈیوں کی صورت میں اور کہیں جوڑوں کی شکل میں کھلی ہموار پختہ اور بہت وسیع

جگہ پر بیٹھے تھے۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنی میں کچھ بوڑھے مرد و زن تاش کھیلتے نظر آئے جن کے گرد کچھ لوگ کھیلنے والوں سے بھی زیادہ دلچسپی کے ساتھ کھیل کا جائزہ لے رہے تھے۔۔۔ پتہ چلا کہ چین میں جنس کے بارے میں خاصی آزادی کا ماحول ہے مگر پبلک مقامات پر اس کا اظہار پسند نہیں کیا جاتا شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کی ملاقات پر طرفین کے والدین غیر جانبدار رہتے ہیں اور شادی کے بعد نئے جوڑے کو علیحدہ رہائش فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔۔۔ لڑکیاں عام طور پر جدید تراش خراش کے خوبصورت رنگین کپڑے پہنتی ہیں لیکن جسم کی نمائش کا خصوصی اہتمام نہیں کرتیں یوں بھی ان کے جسموں کی قدرتی ساخت ایسی ہے کہ "سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا" والی کیفیت کم کم ہی پیدا ہوتی ہے۔۔۔ بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے کہ بات سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے کیونکہ بعض اوقات اپنی کہی ہوئی بات ہی آگے آ جاتی ہے ہم دوست مستنصر حسین تارڑ کے ابتدائی سفرناموں میں پائے جانے والی خواتین پر جملے بازی کیا کرتے تھے کہ ان میں کوئی بھی جسمانی طور پر صحیح و سالم نہیں ہوتی تھی اب دیکھیے ہمارے نصیب میں یہ بی بی آئی ہے جس کا ہر چیبر ہی اپنی جگہ سے کھسکا ہوا ہے۔"(۸۲)

یوں تو ہمارے بعض سفرنامہ نگار اپنے ملک میں جنس کے معاملے میں بڑے لیے دیئے رہتے ہیں اور صالح ادب کا پرچار کرتے ہیں لیکن دیارِ غیر میں جا کر ایسے کھلتے ہیں کہ ان کا خبث باطن ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں افتخار نسیم جو امریکہ میں مقیم ہے اور خود اپنی گے پوئٹری (Gay Poetry) کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس نے اپنے ایک مضمون "مسافرانِ کرام" جو فیصل آباد کے ایک ہفت روزہ "نصیب ملت" میں دو اقساط میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اس نے کچھ سفرنامہ نگار ادیبوں کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ وہ اس سے وہاں شراب اور شباب کا تقاضا کرتے تھے۔ جب ان سفرنامہ نگاروں کی افتی سے ناچاقی ہو گئی تو افتی نے ان کی پارسائی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس واقعے کا ذکر ڈاکٹر انور سدید نے بھی اپنے ایک کالم روزنامہ "جسارت" کراچی میں کیا ہے۔

شوکت علی شاہ نے "اجنبی اپنے دیس میں۔" "سلگتے ساحل" "جزیرے جمال کے" اور "سورج آدھی رات کا" کے نام سے سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ اجنبی اپنے دیس میں بلوچستان جیسے بنجر و چٹیل علاقے کا سفرنامہ ہے۔ "سلگتے ساحل" آسٹریلیا کا "جزیرے جمال کے" امریکہ کے پس منظر میں لکھا ہوا شوخ و شنگ سفرنامہ ہے۔ اور جب کہ "سورج آدھی رات کا" ہالینڈ، ناروے، سیکنڈے نیویا اور فرنچ رویرا کا سفرنامہ ہے۔ شوکت علی شاہ کے سفرناموں میں شوخی شرارت اور چلبلاہٹ کا عنصر نمایاں

ہے۔ وہ مناظر فطرت سے ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ نسوانی حسن کی خوشبو ان کے رگ و پے میں بس جاتی ہے اور وہ مدہوش ہو جاتے ہیں۔ اس عالم میں حسن کی تعریف میں ان کے قلم سے کمال کے نثر پارے وجود میں آتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حسن کا جادو کچھ زیادہ ہی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مثال کے طور پر جنس نگاری کا یہ نمونہ دیکھیے جس میں وہ جب چوکیدار کی بیٹی کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

"غالباً مست ہوا کا جھونکا تھا جو دروازے سے آ کر آیا تھا یا بادِ شمیم تھی جو شام کے دھندلکوں میں ہلکورے لے رہی تھی یا پھر انار کی کوئی ڈال تھی جو لپک کر دہلیز پر آ گئی تھی۔۔۔ یا پھر میری نظروں کے سامنے وہ نقطہ اتصال اُبھرا تھا' جہاں بنارس کی صبح' اودھ کی شام سے ہمکلام ہوئی تھی۔ رنگ اور نور کا ایک سیلاب تھا جو ہوش و حواس کو بہائے چلا جا رہا تھا۔۔۔ "کون ہو تم"؟ میں مجسم سوال تھا۔۔۔ "اپنے بابا کی بیٹی ہوں" وہ اپنے جوڑے میں انار کے پھول ٹانکتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولی۔ "کیا چوکیدار کی بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں۔" میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ رنگت ایسی صبیح کہ اگر رخ سے زلفیں ہٹا دے تو پہاڑوں کی برف پر بھی حرف آئے۔ آواز میں وہ سحر کہ محض اس کھنک ہی سے ہر ذرہ کائنات تڑپ اٹھے۔ آنکھوں میں وہ جاذبیت کہ اگر نظر بھر کر دیکھ لے تو کششِ ثقل بھی لرزے میں آ جائے۔

مٹی کا زرد چراغ کس نے جلایا تھا؟ پھولوں کا سرخ گلدستہ میز پر کس نے سجایا تھا؟ اس غریب کا بستر کس دستِ حنائی نے بچھایا تھا؟ مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ جیب تو انور شاہ اور اس کے بھائی بندوں نے پہلے ہی خالی کر دی تھی اب صرف ایک نقدِ دل رہ گیا تھا' سو وہ بھی لٹتا نظر آیا۔ رات کیسے کٹی' اس کا اندازہ ہجر میں شب گزیدہ شاعر کو بھی نہیں ہو سکتا۔ ہر کروٹ میں لاکھوں کرب تھے۔ ہر دھڑکن میں سینکڑوں درد تھے۔۔۔ ان گنت راتیں پہلے بھی جاگ کر گزاری تھیں۔۔۔ لیکن خواب اور بے خوابی کی یہ کشاکش پہلے تو کبھی نہ دیکھی تھی۔۔۔ بستر پر سونے کا تو محض ایک بہانہ تھا' ورنہ طائرِ جاں کا کہیں اور ہی ٹھکانہ تھا۔"(۸۳)

سفرناموں میں بے رنگ معلومات قدیم روایت ہے بعض اوقات یہی معلومات سفرنامے کو بوجھل بنا دیتی ہیں لیکن شوکت علی شاہ نے اس روایت کو بھی بہت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ انہوں نے معلومات کو بھی ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ انہیں بھی جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی پہلو بھی ملتے ہیں۔ جیسے وہ شہر بنکاک کے متعلق لکھتے ہیں:

''بنکاک ایک ایسا شہر ہے۔ جس کا نام سنتے ہی انسان دو قسم کی کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ زاہدانِ خشک ''لاحول'' کا ورد شروع کر دیتے ہیں اور وہ جو اتنے خشک نہیں ہوتے انہیں اپنے جسم میں گدگدیاں سی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اقوام عالم میں اس شہر کی وہی شہرت ہے جو کسی شہر میں ''اس بازار'' کو حاصل ہوتی ہے۔ احباب اس کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اس طرح جھینپتے ہیں جیسے ان کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ راما اول کے اس شہر نے فحاشی اور عیاشی کے ضمن میں ایک عجیب شہرت حاصل کر لی ہے۔ بنکاک ایک ایسا شہر ہے جس کا ہر تیور طوائفانہ اور ہر قریہ ایک قحبہ خانہ لگتا۔ ہم اس شہر سے گزرے ہی نہیں بلکہ ایک عرصے تک تعلیم کی غرض سے رہے بھی ہیں۔ نائٹ کلبوں' مساج پارلرز اور قحبہ خانوں کے علاوہ بھی یہاں بہت کچھ ہے۔'' (۸۴)

شوکت علی شاہ نے اپنے سفرناموں میں بلوچستان' آسٹریلیا' بنکاک' سنگاپور' ناروے اور امریکہ کے لوگوں کے انداز رہن سہن کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ زیادہ تفاصیل تو فراہم نہیں کرتے لیکن ہر چیز کا مختصر ذکر ضرور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ شوکت علی شاہ جہاں بھی دو معاشرتوں کا موازنہ کیا ہے اسی اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے کہیں بھی وطن عزیز کو ہدف ملامت نہیں بنایا بلکہ مغرب اور امریکہ کے رسم و رواج پر گہرا طنز کیا ہے انہوں نے مغرب کی معاشرتی برائیوں کا ذکر بڑی بے باکی سے کیا ہے اور ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے ہیں جیسے انہوں نے امریکہ کے لوگوں کی آزاد خیالی کا ذکر کیا ہے کہ وہاں لڑکا لڑکی بغیر شادی کے ہی اکٹھے زندگی بسر کرتے ہیں اور وہاں شادی کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح شوکت علی شاہ نے تلخ حقائق کو بھی بڑی رنگینی اور دلکشی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مثال کے طور پر جنس نگاری کے یہ حقیقی اور تہذیبی نمونے دیکھیے:

''گویا اس تعمیر میں بھی خرابی کی ایک صورت مضمر ہے۔ جس عمارت کی بنیاد ہی شک کی خشت اول سے رکھی گئی ہو وہ کتنی دیر قائم رہے گی؟ یہاں کی عورت بڑی خود دار اور خود سر ہے۔ وہ مشرقی عورت کی طرح خاوند کی ذرا سی بھی ڈانٹ ڈپٹ یا ناجوازی برداشت نہیں کرتی اور بعض اوقات معمولی اختلاف بھی طلاق پر منتج ہوتا ہے شاید اسی وجہ سے اب شادیوں کا رواج ہی ختم ہوتا جا رہا ہے اور جوڑے بغیر شادی کے زندگی گزار دیتے ہیں۔'' (۸۵)

''ہم باہر صحن میں آہنی جنگلے کے پاس کھڑے ہیں۔ ہمارے اردگرد بے

شمار سیاح اور آسٹریلوی گھوم پھر رہے ہیں۔ دائیں جانب ایک ہسپانوی جوڑا بنچ پر بیٹھا ہے۔ لڑکی مرد کی نسبت خاصی نو عمر ہے۔ اس کے لمبے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ مرد کچھ ایسی نظروں سے اسے گھور رہا ہے جن نظروں سے حضرت آدم نے پہلی بار حوا کو دیکھا تھا۔ ان کے قریب ہی دوسرے بنچ پر آسٹریلوی Couple براجمان ہے۔ لڑکے نے اس مضبوطی سے اپنی بانہیں لڑکی کی کمر کے گرد ڈالی ہوئی ہیں کہ جیسے خدشہ ہو کہ اگر ذرا بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو اس کی محبوبہ اسے چھوڑ کر بھاگ جائے گی یا آہنی جنگلہ پھلانگ کر سمندر میں کود پڑے گی۔ ان سے ذرا ہٹ کر سکول کے دو ہونہار طالب علم ایک دوسرے کی سانسیں گن رہے ہیں۔ لڑکی ابھی بلوغت کی سرحدوں میں قدم رکھ رہی ہے اور بوسے کی لذت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے اسے ایڑیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔'' (۸۶)

''ہر لڑکا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ آیا ہے۔ اسٹیو کی دوست Marry آج خاص طور پر سج دھج کر آئی ہے۔۔۔ پھر رس بھرے ہونٹ کچھ ایسے لگ رہے ہیں جیسے تازہ انار کا جوس پی کر آئی ہو۔۔۔ ہونٹ دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے پیاس نے مجسم شکل اختیار کر لی ہو۔ رنگت اس قدر جاذب ہے جیسے مشرق اور مغرب کسی صحت افزا مقام پر بغل گیر ہو رہے ہوں۔ نریندر اپنی سویٹی نینسی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے آیا ہے۔ نینسی نے کچھ اس قدر مضبوطی سے اسے جکڑ رکھا ہے جیسے اسے ڈر ہو کہ ذرا سی ڈھیل دینے پر یہ خالصہ اپنی داڑھی اور پگڑی سمیت غائب ہو جائے گا۔۔۔ نوجوان لڑکے ایک ہاتھ میں جام اٹھائے اور دوسرا اپنی محبوباؤں کی بغل میں دابے ڈانسنگ فلور پر تھرک رہے ہیں۔ ہر گھونٹ کے بعد دختر زر کی تلخی دور کرنے کے لیے اپنے ہونٹ محبوباؤں کے ہونٹوں میں پیوست کر دیتے ہیں اور وہ سپردگی کے عالم میں مزید سمٹ جاتی ہیں۔'' (۸۷)

''ہیلی کاپٹر اڑا تو میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ آٹھ سیٹوں والا ہیلی کاپٹر فل تھا۔ ہمیں پائلٹ کے بالکل پیچھے پہلی سیٹ ملی۔ ہمارے بائیں طرف ایک امریکن جوڑا بیٹھا تھا۔ میاں بیوی ستر کے پیٹے میں ہوں گے بیوی نے بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے بوڑھے خاوند کی بانہیں تھام رکھی تھیں۔۔۔ ان کے پیچھے ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر پرندوں کی طرح چونچیں لڑاتا ہوا اپنے آپ میں گم۔ لڑکا وقفے وقفے سے لڑکی کے کان میں سرگوشی کرتا جس سے اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو

جائیں۔"(۸۸)

"کوکا کولا اور پیپسی پینے کی ایسی لت پڑی ہے کہ لوگ لسی اور شکنجبین کو بھول گئے ہیں۔ میڈیا نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جب ایشوریا رائے اپنے خوبصورت جسم کو پیچ و خم دیتی ہوئی ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ ناظرین کو کوک پینے کی دعوت دیتی ہے تو جسم کے روئیں روئیں سے ایک کوک سی اٹھتی ہے اور لوگ مضطرب ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بظاہر بوتل پر منہ رکھ دیتے ہیں۔۔۔ ان کا حُسن ناف تک لٹک جائے گا پھر کون احمق ان سے اپنی مصنوعات کی تشہیر کرائے گا۔ ان کی اصل خوراک تو سلاد کا ایک باؤل، چھوٹا سا کھٹ مٹھا سیب اور سنگترے کی چند قاشیں ہوتی ہیں۔ جوان کی ممی یا نانیکہ بڑے پیار سے انھیں اپنے کھردرے ہاتھوں سے کھلاتی اور ان کی نگرانی اسی طرح کرتی ہیں جس طرح مرغی بازوں کے ڈر سے چوزوں کو اپنے پروں تلے سمیٹ لیتی ہے۔ پھر بھی کسی نہ کسی چوزے کو باز دبوچ ہی لیتا ہے۔

بہ تقاضائے بشریت! آخر یہ بھی انسان ہیں۔ کبھی کبھی بغاوت پر اتر آتی ہیں اور تمام حفاظتی حصار توڑ کر رفو چکر ہو جاتی ہیں اور ممی کے پاس سوائے پریس کانفرنس کرنے یا دلالوں کو کوسنے کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ گویا ہر کہانی کسی نہ کسی المیہ پر ختم ہوتی ہے۔۔۔ اس قسم کے رومانس زیادہ دیر نہیں چل پاتے اور لاہوری گائے کی طرح ایک نہ ایک دن یہ پرانے کلّے پر واپس آ جاتی ہیں۔۔۔ بالکل! معروضی حقائق کو سمجھنے کے لیے انھیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ بس ماضی کا ایک آدھ دریچہ کھولنا پڑتا ہے۔ آخر جوانی میں ممی کو بھی ان کی اماں حضور نے اسی طرح معاف کیا تھا۔ گویا یہ ایک تاریخی عمل ہے جو ہر نوجوان نسل دہراتی ہے۔

جنسی عمل، ماحول کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ جہاں چاروں طرف محفلِ رقص و سرود ہو، مینا و جام ہوں، بوس و کنار اور لپٹا لپٹی ہو۔ جزوی طور پر ہی سہی شوٹنگ سے قبل لباس دس بار پہنا اور بیس بار اتارا جائے وہاں جذبات برانگیختہ نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا۔"(۸۹)

شوکت علی شاہ کے سفرناموں میں کئی مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں ان کے اندر کا افسانہ نگار بھی نمودار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات میں لفظوں کے رنگوں سے دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے تمام مقامات پر قاری کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اسلوب

بھی دلآویز ہے۔ وہ ایک بات کو مختلف انداز سے کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ وہ ہر بار نئے انداز سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے بیان کی دلنشینی بھی قاری کو اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے۔ ڈرامائیت بھی ان کے سفرناموں کا اہم جزو ہے۔ اگرچہ وہ غیر ضروری جزئیات نگاری سے کام نہیں لیتے بلکہ دلچسپی کا پہلو برقرار رکھتے ہیں اور نہ ہی عبارت کو طویل کر کے سفرنامے کو بوجھل بناتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں افسانوی انداز میں جنس نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"تم حسین ہو، جوان ہو، میرا اندازہ ہے کہ تم یورپ کی لڑکیوں میں سے اکثر سے زیادہ خوبصورت ہو۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو۔ پھر یہ مکروہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں"It ia a good question اب کے اس کی مسکراہٹ قدرے زہرخند تھی۔ پہلے تو جس چیز کو تم ناپاک سمجھ رہے ہو، میں ایسا نہیں سمجھتی۔ وہ محاورہ تو تم نے ضرور سن رکھا ہوگا کہ Morality is the way to be have as you have been tought to behave. جب میں جوان ہوں، حسین ہوں مجھے اپنے وجود میں چنگاریاں سلگتی محسوس ہوتی ہیں تو اس کا کچھ نہ کچھ مصرف تو ہونا چاہیے۔ کسی نہ کسی کو تو فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"تمھاری منطق صرف محدود ہی نہیں بلکہ مدقوق بھی ہے۔ دنیا کا ہر مذہب اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔ اس قسم کی بیساکھیوں کے سہارے سچ اور حقیقت کو نہیں چھپایا جا سکتا۔"

"اخلاقیات کا درس ہی دیتے رہو گے یا مجھے کچھ آفر بھی کرو گے" وہ زچ ہو کر بولی۔

"تم کیا پینا پسند کرو گی؟ ایک کپ کافی چلے گی؟"

"ایک پیگ وسکی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے"؟

"وسکی! عورت ہو کر؟ یہاں تو میں نے سارے ہالینڈ کو بیئر پیتے دیکھا ہے۔"

"سچ بات بتاؤں؟"

"کبھی کبھی سچ بولنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"اس میں کمیشن زیادہ ملتی ہے۔ یہ وسکی نہیں دراصل کوک ہوتا ہے۔ پھر جب تم بل دو گے تو تمھیں سب سمجھ آ جائے گی۔"

''وہ کیسے۔''

بولی ''اس کو ڈی لکس وسکی کہتے ہیں۔ شراب کے ساتھ ساتھ شباب کا ٹیکس بھی وصول کیا جاتا ہے۔''

''میرے خیال میں تم نے غلط شخص کا انتخاب کیا ہے۔''

میں نے گھبرا کر شکور صاحب کے گلڈروں کو ایک بار پھر تھپتھپایا۔

''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ گڈ بائی۔ سویٹ ڈریمز اور وہ اٹھ کر دوسرے میز پر چلی گئی جہاں ایک بوڑھا یونانی اسے عقابی نظروں سے گھور رہا تھا۔

اس کا جانا تھا کہ شکور صاحب آ گئے۔ انہوں نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا راز و نیاز ہو رہے تھے۔''

''راز ادھر چھوڑ گئی ہے۔ نیاز کے مزے گنجا یونانی لوٹ رہا ہے۔''

کہنے لگے ''یہ یونانی بڑے ٹھرکی ہوتے ہیں اور سناٹل اوناسس کا نام تو سنا ہوگا۔ اس نے آنجہانی کینیڈی کی اپنی بیٹی کی عمر کی بیوہ جیکی سے شادی کر لی تھی۔۔۔''

عرض کیا ''آدمی بڑا چالاک جانور ہے۔ اس نے عورت کو صرف حقوق نسواں کا چکمہ دیا ہے۔ ایک سنہری جال میں جب چاہے اسے پھانس لیتا ہے۔ اب آپ اپنی ہی مثال لیں۔ آپ یہاں کیسینو میں داد عیش دے رہے ہیں اور آپ کی بیگمات کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔''۔۔۔ ہم نے کافی پی کر بل دیا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ کیسینو کی رونق بتدریج کم ہو رہی تھی۔ بوڑھا یونانی نشے میں دُھت ہو کر اس لڑکی کو بازوؤں میں تھامے اپنے ہوٹل کی طرف لے جا رہا تھا۔''[90]

''کافی دیر تک انہوں نے بانہوں میں بانہیں ڈالے رکھیں۔ جسم تھرکتے رہے۔ جسم مسکراتے رہے۔ جسم بولتے رہے۔ نظریں بھٹکتی رہیں۔۔۔ بڑی حسین غلطی تھی۔'' سارا نے قہقہہ لگایا۔ ''میرے خیال میں تم بھی کر ہی ڈالو۔''

''کیتھی کہنے لگی'' لگتا ہے کھانے کے ساتھ ساتھ تمہارا سونے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔''

''رات حسین ہے۔ رات جوان ہے۔ رات شکبار ہے' سارا کی زلفوں کی طرح۔ چاند جوبن پر ہے۔ اس کی جوانی کی طرح۔ ان لمحات میں آرام کرنا حرام ہے۔'' پیٹر نے سارا کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''اس خانہ خراب کی سب سے بڑی برائی یہی ہے کہ انسان کا ذہن ماؤف کر دیتی ہے۔'' میں نے تاسف بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اس کی خوبیاں کیوں نہیں گنواتے'' پیٹر کہنے لگا ''اسے پی کر حق بات زبان پر آ جاتی ہے۔''

''تم جاؤ جہنم میں!'' مون کے لہجے میں پہلی بار غصے کا عنصر شامل تھا۔۔۔ انسان کتنا ہی ترقی کر لے اور تہذیب یافتہ ہو جائے اس کی وحشی جبلت کہیں نہ کہیں آشکار ہو جاتی ہے۔۔۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ انسان کو کچا گوشت نہیں کھانا چاہیے تو وہ طنز بھرے لہجے میں کہنے لگا کہ ''یہ عمل بذاتِ خود وحشی پن کی علامت ہے۔''[91]

''میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سیب کے درخت کے بالکل نیچے آخری کیمپ پوسٹ سے ذرا ہٹ کر سارا اور پیٹر بیٹھے تھے۔ سارا پیٹر کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ بھی ان کے انہماک کو نہ توڑ سکی۔ جب دل میں چور ہو تو انسان ہوا سے بھی بدکتا ہے۔ یہاں قاضی دیکھ بھی لیتا تو کیا کر سکتا تھا۔ میں نے ان کے ''آرام'' میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور دبے قدموں واپس لوٹ آیا۔''[92]

شوکت علی شاہ کے سفرنامے جب ہاتھ میں آتے ہیں تو یورپی مورخوں کے چہرے تصور کے کینوس پر رنگین تصویریں بنانے لگتے ہیں اور قاری بے اختیار ان کے سفرنامے پڑھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس طرح حرف آغاز سے لے کر آخری جملے تک وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

شوکت کے ہاں جنس نگاری کے متعدد نمونے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے بھی ملتے ہیں اس کے علاوہ کہیں کہیں افسانوی انداز کے مبالغہ آمیز نمونے بھی نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں وہ اپنی ذات کی نمائش کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ یہ رویہ ہمارے اکثر سفرنامہ نگاروں کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ وہ جنس نگاری کا سہارا شاید کمرشل ازم کے لیے بھی لیتے ہیں۔ سفرنامہ نگاروں کی یہ ایک خامی بھی ہے کہ سفرنامہ لکھتے وقت ''صنف نازک'' کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور اگر سفرنامہ یورپ سے متعلق ہو تو پھر تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سفرنامہ نگاروں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اس رویے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''ہمارے سفرناموں میں میمیں ڈالنے کے عمل نے اب لطیفہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ نیز ھی بوتھی بونگا بندہ لیکن جس ملک سے گزرے گا وہاں درجن بھر روتی بلکتی بلکہ گرلاتی دوشیزائیں (استعارتاً) اپنے پیچھے چھوڑ آئے گا۔ یوں نہ کرو تو دوستوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔'' (۹۳)

سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ ''میرا گلگت و ہنزہ'' ہے۔ سلمیٰ اعوان نے اپنے اس سفرنامے میں اپنے ملک کے پُرشکوہ مناظر، مقامات، دریا اور پہاڑوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے وہاں دشوار گزار وادیوں میں سفر کیا۔ ان روایات کو جاننے کے لئے اس حسن کے دیدار کے لیے انہوں نے اس سفرنامے میں بے حد معلومات فراہم کی ہیں۔ روایتی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ رسم و رواج کو بھی قلمبند کیا ہے۔ وہ جس گھر میں گئیں ان خواتین کا رہن سہن ان کی مہمان نوازی کا تذکرہ اس سفرنامے کی زینت ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ اس سفرنامے میں تمام کردار اپنی اصلی حالت میں دکھائی دیتے ہیں اور سلمیٰ کا اندازِ تحریر بھی دلچسپ ہے۔ انہوں نے منظر نگاری بھی عمدگی سے کی ہے۔ وہ وہاں کی ایک خاتون کے حسن کے بارے میں لکھتی ہیں:

''گھائل کر دینے والی مسکراہٹ ان ارغوانی ہونٹوں پر پیدا ہوئی تھی۔ ملکہ اپنی جوانی میں کس قدر حسین عورت ہوگی۔ اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔ تصویریں بولی تھیں مگر اس شدومد سے نہیں جس کی ضرورت تھی۔ سرخی مائل خزئی رنگت کی آنکھوں میں زیادہ دیر تک دیکھنا مشکل تھا۔ اپنا آپ اپنے آپ سے چھنتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سنہری دراز بالوں کا روکھا پن یہ بتاتا تھا کہ کبھی ان کی چمک اور رعنائی آنکھوں کو سحرزدہ کرتی ہوگی۔ رنگ و روپ تو ابھی بھی دیے کی لاٹ جیسا تھا۔ جوانی میں تو آسمان پر اڑتے پرندے پھڑ پھڑا کر گرتے ہوں گے۔'' (۹۴)

کشور ناہید کا ''آجاؤ افریقہ'' اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ ہے وہ افریقہ کے قیام کے سولہ دنوں میں صبح سے رات تک مختلف ملکوں کی ہر طبقے کی خواتین سے نہ صرف ملیں بلکہ بات کرنے کا بھی موقع ملا حالانکہ وہاں بے شمار لیڈر خواتین دوسرے ممالک سے بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کانفرنس میں شامل تمام خواتین کا تعارف اور ان کی کارکردگی کا جائزہ بہت عمدگی سے کیا ہے۔ انہوں نے دوسرے ملکوں کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا اور جیسا محسوس کیا اسے سادگی سے بیان کیا ہے۔ ان کے سفرنامے میں جنس نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ ان کے خیال میں مرد نے عورت کو کھلونا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ عورتوں پر مظالم ڈھاتا ہے۔ عورت کو میڈیا پہ اشتہار بنا دیا گیا ہے۔ ہر سودے میں عورت کا

چہرہ اور عورت کا بدن استعمال کیا جاتا ہے۔ مرد عورت کو صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس سفرنامے میں کشور کے دوسری غیر ملکی خواتین کے ساتھ مباحثے بھی نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر مرد کے حوالے سے جنس نگاری کا یہ نمونہ دیکھیے:

''اس نے پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میرے بال اوپر کیے۔ میرے گال پہ خوبصورت اور ہلکا سا بوسہ دیا۔ مجھے گنگھرو کا ''عصمت دری ہاؤس'' یاد آ گیا۔ ہمارے اور تمھارے معاشرے میں ۱۳ سال کا لڑکا اپنی مردانگی آزمانے لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے تمھارے معاشرے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

نہیں۔۔۔ ہمارے معاشرے میں مردانگی آزمانے کا ہنر چھپ کر کیا جاتا ہے۔۔۔ شادی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مرد عورت کے رشتے کی سنسنی خیزی ختم ہو جاتی ہے۔ اب مرد کو عورت سے لذت کشید کرنے کے لیے کچھ اور لوازمات تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ عورت کو چابک مار کر شہوت دلا کر، عورت کا جسم داغ کر اس کی چیخوں سے لذت کشید کرنا، عورت کے بالوں کو کھینچ اور اس کے بدن پر طرح طرح کے نیل ڈال کر سکون محسوس کرنا اور عورت کے ساتھ جنسیت کرنے کے لیے ہر طرح کے قدرتی طریقوں کو چھوڑ کر غیر قدرتی رویوں کو آزما کر لذت حاصل کرنا اور مردانگی کا علم بلند کرنا۔'' (۹۵)

یہ جنسی انحراف کی وہ قسم ہے جسے ایذا کوشی قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں کشور ناہید نے مرد اور عورت کے تعلق کو محض تکلیف دہ عمل ہی قرار دیا ہے اور مرد کو سادِسٹ رویے کا حامل یعنی ایذا کوش ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو عورت کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچا کر جنسی حظ اٹھاتا ہے۔

وہاں افریقہ میں کشور ناہید کا پالا ایک ہم جنس پرست یعنی لیزبین سے بھی پڑا۔ اس کو بھی انہوں نے بڑی بیباکی سے بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباسات دیکھیے:

''میں نے مزید بے تکلفی برتتے ہوئے پلنگ پر دراز ہونے کا فیصلہ کیا۔ کرسٹینا میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں ڈر گئی۔ وہ میرے ڈر کو بھانپ گئی۔ ذور سے ہنسی لزبین عورتیں، بھوکے مردوں کی طرح دست درازی نہیں کرتی ہیں۔ تم اتنی Tense کیوں ہو۔ اس نے میرے بازو پکڑ کر سیدھے کیے۔ میری زبان سوکھ گئی مگر ڈر چھپا کر میں نے چوڑی سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر جمائی۔ اس نے میرے ماتھے پہ سے بال ہٹائے بھنویں صاف کیں۔ منہ پہ اس طرح ہاتھ پھیرا کہ میرا جی چاہا کہ پھر ذرا میری تنی رگوں پر ہاتھ رکھے اور میرے تھکے اعصاب کو سکون پہنچائے کانوں کی لوؤں کو

آہستہ آہستہ مساج کرتے ہوئے اس نے آہستگی سے پوچھا "کبھی کسی مرد نے تمہارے چہرے پہ سیکس کے علاوہ کچھ تلاش کیا۔" میں دبک سی گئی۔ جھوٹ بولنے میں مہارت کے باوجود میرے پاس جواب میں گردن ہلانے اور وہ بھی انکار میں گردن ہلانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے پلٹ کر میرے پیروں کے تلووں پہ انگلیاں پھیریں اور ایک ایک انگلی میں چھپے درد کی گہرائیوں کو بغیر کسی لفظ کے ادا کیے محسوس کیا۔ میرے وجود میں بوجھ اور بڑھ گیا۔ میں نے جھلا کر کہا "تم مجھے امپریس کرنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے جذباتی مت کرو۔ میرے اندر ٹھہری پیاس مت جگاؤ۔ کرسٹینا نے چیتے کی سی تیزی کے ساتھ میرے اوپر لیٹتے ہوئے مجھے چوم کر فوراً پیچھے ہٹتے ہوئے کھڑے ہو کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ گھورتے ہوئے بولی "بس ذرا سے لمس سے گھبرا گئیں۔ مرد کو کبھی تو فرصت نہیں ہوتی کہ وہ ان نزاکتوں میں پڑے وہ دیکھے اس عورت کے روئیں روئیں میں کونسی چاہتیں نچھاور ہونے کو اور کونسی چاہتیں جذب ہونے کو بیتاب ہیں اسے تو بس اتنی فکر ہوتی ہے کہ وہ اپنے جنون اور جوش سے رہائی حاصل کرے۔ اگر کر سکے تو ورنہ لاکھوں کمزور مرد عورت پہ ایسے حملہ آور ہوتے ہیں کہ جیسے بڑے "زانی خان" ہوں۔ (۹۶)

"میں اس معاشرے کی پروردہ تھی جہاں میں نے سکول کی استانیوں کو اور لڑکیوں کو استانیوں کے پیچھے جنسیانہ مسکراہٹوں سے پیچھا کرتے اور ایک دوسرے کے لباس کی تعریف کے بہانے ایک دوسرے کے جسم پہ ہاتھ پھیر کر بے تحاشہ ہنستے دیکھا تھا۔

میں نے اپنے گھروں میں غراروں میں ملبوس، بالوں میں چاندی اترتی اور دولہا کے انتظار میں سرہانوں پہ Good Night کاڑھتی عورتوں کو گاہے بگاہے، غرارے کے پائنچے سے اپنی انگلیوں سے زندگی کاڑھنے کا عمل کرتے دیکھا تھا۔ یہ ساری باتیں بچپن اور جوانی کی یادوں میں اس لیے دب گئیں کہ پھر زندگی نے مد مقابل مرد کو پایا اور سارے حوصلے، سارے مسئلے اور لذتیں اس ایک مرکز سے کشید کرنے کی کوشش نے اتنے بھنور اور تھپیڑے دیے کہ اپنے وجود کی یکتائی فراموش ہو گئی۔۔۔ کیا مرد کے وحشیانہ جنسی رویئے نے عورت کو اکتاہٹ کی منزل پہ لا کھڑا کیا ہے؟۔۔۔ زندگی نے جنس کو اکتاہٹ زدہ چیزوں کی طرح ایک دوسرے سے چپٹتے ہوئے دیکھا اور خاموش رہی۔ زندگی نے بدنوں سے کپڑے ایسے اترتے دیکھے جیسے دھوبی کو دھلنے کے لیے دیے جائیں۔ زندگی نے میکانکی سطح پر بولے جانے والے مکالموں کو مفقود کر کے

صرف اور صرف جسمانی ضرورت کو سوکھے لقمے کی طرح نگلتے دیکھا اور خاموش رہی مگر وہی زندگی اس نرم ہاتھ کی گرمی کو بدن میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔ مجھے لگا یہ عورت اپنے ہاتھوں کو اتنا محبت سے لبریز رکھنے کے لیے بڑے لوشن لگاتی ہوگی۔ بڑی کریمیں استعمال کرتی ہوگی۔ ہاتھوں کو بڑا لپیٹ کر چھپا کر رکھتی ہوگی یا پھر۔۔۔۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی قسم کے کام کو ہاتھ نہ لگاتی ہو۔" (۹۷)

یہ امر بہت توجہ طلب ہے کہ کشور ناہید کے ہاں جب بھی مرد کا ذکر آتا ہے تو وہ اسے جفاجو، ظالم اور عورت کا استحصال کرنے والا ہی سمجھتی ہیں حتیٰ کہ جنسی اعتبار سے مرد عورت کا رکھوالا بھی ہوتا ہے اور عورت سے شہوانی جذبات کا فطری طور پہ کتھارسس کرنے کا ذریعہ بھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کشور ناہید لزبین خاتون کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہیں۔ یہاں پہ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ جب لزبین نے کشور کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا تو ان کے دل میں یہ تمنا جاگی کہ وہ اسی طرح ہاتھ پھیرتی رہے اور یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ سفرنامہ نگار نے لزبین کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ مرد ان کے چہرے پہ سیکس کے علاوہ کچھ تلاش نہیں کرتے۔

شہوانی تعلقات کے حوالے سے دنیا بھر کی تہذیبوں میں ایک وقت میں صرف ایک مرد اور ایک عورت کے جنسی تعلق کو مسلمہ قدر کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہم جنسیت اس سے انحراف کی ایک ایسی شکل ہے جس میں ایک مرد کے اپنے ہم جنس مرد سے اور ایک عورت کے اپنی ہم جنس عورت کے ساتھ جنسی تعلقات ہوتے ہیں۔ ہم جنس محبت یا تعلق کو نفسیاتی عارضہ سمجھا جاتا ہے یا پھر جنسی تشنج سے نجات کا ایک غیر تخلیقی ذریعہ سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہم جنسیت دراصل ایک بیماری ہے۔ یہ کوئی صحت مند رجحان نہیں ہے۔ چونکہ یہ جنس کے بارے میں مسلمہ رجحانات اور رویوں سے انحراف ہی کی ایک شکل ہے۔ ہم جنسیت کو ایک نفسیاتی عارضہ سمجھا جاتا ہے اور مہذب معاشروں میں جہاں مذہب اور اخلاقیات کے تھوڑے سے بھی اثرات موجود ہوں وہاں اس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے۔

افریقہ میں جنسی بے راہ روی کی کیا حالت ہے۔ کشور ناہید نے اپنے سفرنامے "آجاؤ افریقہ" میں افریقی عورت کی تذلیل کے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے افریقہ کے لوگوں کے عجیب و غریب قسم کے عقائد اور رسومات کو بھی بیان کیا ہے۔

اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں:

"لڑکیوں کے بھی ختنے (Clitoridectomy) بلوغت کے ساتھ ہی

ہوتا پورے افریقہ اور اس علاقے میں واقع مسلم ممالک میں بہت عام ہے۔ ختنے کی تقریب خاندان میں ایک بہت اہم اور بھرپور تقریب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تقریب علی الاعلان منعقد کی جاتی ہے۔ پہلے خاندان بھر کی بڑی عورت یہ تحقیق کرتی ہے کہ خون باقاعدہ ماہواری ہی کا ہے کسی اور وقتی تکلیف یا مرض کے باعث تو نہیں آیا۔ یہ تحقیق تین مہینوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد سارے علاقے کے لوگ دودھ اور مویشیوں کی شکل میں تحفے لاتے ہیں اور زبردست دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔ لڑکی کو نیچے کپڑے پہنا کر اور اوپر کا بدن ننگا رکھ کر ہر گھر پر دعا لینے اور مبارک باد وصول کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اگر کسی لڑکی کی چھاتیاں بہت اچھی طرح نمودار نہ ہوئی ہوں تو باقاعدہ پہلے جڑی بوٹیوں کی مدد سے ان کی مالش کی جاتی ہے اور یوں نئی عورت کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ پھر علاقے کی سینئر عورتیں ایک چوکی پر لڑکی کو بٹھا کر اس کا آپریشن کرتی ہیں، پھر اس کے سر پر ایک خاص قسم کی موتیوں والی ٹوپی پہنا دی جاتی ہے جس سے سب سمجھ جاتے ہیں کہ اس کے زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ جب زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں تو پھر اس کا سر مونڈ دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب عورت پن کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس رسم کے بعد جلد ہی لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے۔ شادی کے بعد عورت اپنے شوہر کے علاوہ اپنے دوستوں، شوہر کے ہم عمروں اور ساتھیوں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھ سکتی ہے۔"(۹۸)

اس اقتباس میں کشور ناہید نے جنس نگاری میں جس طرح جزئیات کا خیال رکھا ہے اور غیر ضروری تفاصیل کو بڑے انہماک سے بیان کیا ہے سفرنامے کی ہیرت میں اس کی گنجائش شاید کم نظر آتی ہے۔ کشور ناہید کے ہاں جنس نگاری کی بہتات اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کے سفرنامے کا اس تناظر میں جداگانہ تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ ممکن ہے اس طرح نقاد اُن کی شخصیت کے چند مختلف گوشوں سے متعارف ہو سکیں۔

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا سفرنامہ ''ہوائیاں'' ہے یہ سفرنامہ ازبکستان، قزاقستان اور کرغزستان کے سفر پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں لطائف کی بھرمار کی ہے۔ اس سفرنامے میں کوئی تسلسل نہیں ملتا اور نہ ہی فنی طور پر سفرنامے کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ سفرنامہ نگار نے وہاں جا کر شاید صرف لطائف ہی جمع کیے ہیں۔ انہوں نے جنس کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے گویا جنس کو مزاح پیدا کرنے والے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سفرنامہ نگار ہر فقرے میں قاری کو سیر کروانے کے بجائے صرف ہنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

''کرغیزوں میں دو قسم کے خاوند ہوتے ہیں، ایک وہ جو پی کر آتے ہیں اور دوسرے وہ جو آ کر پیتے ہیں۔ رات کو خاوندوں کے دیر سے آنے پر روسی بیویاں بھی یوں لڑتی ہیں کہ پکی مچھی کی بیویاں لگتی ہیں لیکن اگر خاوند نے زیادہ پی ہو تو انہیں صبح تک یاد ہی نہیں رہتا کہ کسی نے پیا بھی تھا۔ رات کو لیٹ آنے والے خاوند کو بیویاں کہتی ہیں پہلے چابی کے سوراخ سے اندر پھونک مارو۔ پھونک سونگھ کر اندازہ لگاتی ہیں کہ پی کر آیا ہے یا نہیں تاکہ فیصلہ کر سکیں کہ دروازہ کھولنا ہے یا نہیں۔"(۹۹)

''جھیل کے کنارے نرم ریت پر لڑکیاں لیٹی سن باتھ لیتے ہوئے پڑھ رہی تھیں۔ بیشتر نے صرف کتاب ہی پہن رکھی تھی۔ کسی کی علم دوستی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اسحاق قول جھیل کے کنارے لیٹی حسینوں کے پاس سے گزرے اور اس کتاب کا نام پڑھ لے جس کا وہ مطالعہ کر رہی ہوں۔ ہمارے ایک ساتھی تین چار بار حسینہ کے پاس سے گزرے ہم نے پوچھا ''وہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہے؟'' حیرانی سے بولے ''وہ کتاب پڑھ رہی ہے۔"(۱۰۰)

''بوسہ پرانے زمانے میں ایک چالاک عورت نے شروع کیا جو خاوند کو گھر آنے پر بوسہ دیتی صرف اس لیے کہ اسے پتہ چل سکے کہ خاوند نے پی ہوئی تو نہیں یا اس کے منہ سے عورتوں کے پرفیوم کی خوشبو تو نہیں آ رہی۔ آؤ بیویوں اور محبوباؤں کے نام پر پئیں اس دعا کے ساتھ کہ ان کی آپس میں کبھی ملاقات نہ ہو۔۔۔ بوسے کے نام پر پیتے ہیں جسے اس مرد نے ایجاد کیا جسے عورت کا منہ بند کرنے کا دوسرا طریقہ نہ آتا تھا۔"(۱۰۱)

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو سفرنامے کا مذکورہ بالا سفر ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں سفرنامہ نگاروں نے محض تاریخ اور جغرافیے کے خشک اور بے رنگ بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے سفر کو اپنی باطنی کیفیات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ سفرنامے میں اسلوب اور طریقِ اظہار کی بڑی اہمیت ہے اگر کوئی صاحب طرز مصنف سفرنامہ لکھتا ہے تو اپنے طرزِ بیان کے باعث سفرنامے میں چار چاند اور ادبی شان پیدا کر دیتا ہے۔ اردو سفرنامے میں جنس نگاری کا جو رجحان پایا جاتا ہے۔ اس سے اردو سفرناموں نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس سے سفرنامے کی نوعیت اور خاصیت میں بھی بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اب زیادہ تر سفرنامے داخلی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان سفرناموں میں سیاحت کے دوران حاصل ہونے والے تجربات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذاتی تاثرات

کو زیادہ اہمیت حاصل ہے سفر نامہ نگاروں نے جنس نگاری کا سہارا محض تلذذ حاصل کے لیے نہیں لیا بلکہ انہوں نے اس کے پردے میں حقیقت نگاری اور اعلیٰ علمی وادبی سطح پر اعلیٰ حقائق بیان کیے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی رعنائیوں اور رنگینیوں کا ذکر بھی بلا تامل کیا ہے۔

جدید سفر نامے میں اسلوب اور طرز بیان کو بہت اہمیت حاصل ہے اور وہ سفر نامے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جو خوبصورت زبان اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہوں لیکن اس طرح کے سفر ناموں میں ایک عیب یہ ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار بعض اوقات سفر نامے کو افسانہ بنا دیتا ہے اور اس میں رومانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا سفر نامہ بعض مقامات پر افسانے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سفر نامہ نگار اس افسانے کا ہیرو خود ہوتا ہے اور ہر غیر ملکی خوبصورت ملنے والی لڑکی اس کی معشوق ہوتی ہے۔ ایسے سفر ناموں میں رومانوی عنصر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اسے محض افسانہ ہی تصور کرتے ہیں۔ آجکل اگر چہ ایسے سفر نامہ نگاری زیادہ مقبول ہیں جن کے سفر ناموں میں افسانے کی چاشنی ہوتی ہے کیونکہ قارئین بھی بنیادی طور پر تفریح کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ سفر نامے کو محض تفریح کی سطح تک لے جانا مناسب نہیں ہے۔ سفر ناموں میں سچائی کا عنصر نہایت ضروری ہے خصوصاً واقعات اور مشاہدات کے سلسلے میں سفر نامہ نگار کا طرز بیان افسانوی تو ہو سکتا ہے لیکن حقائق کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا یا اسے محض افسانوی رنگ دینا درست نہیں کیونکہ اس سے صداقت مجروح ہوتی ہے۔

جدید سفر نامے میں سفر نامہ نگار نہ صرف اپنی داخلی کیفیات کو بلکہ کسی منظر کو دیکھ کر کسی شخصیت سے متاثر ہو کر یا کسی تہذیب کا نظارہ کر کے اپنے اندر اٹھنے والے خیالات کو بلا خوف بیان کر دیتا ہے اور یوں قاری کو بھی محظوظ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سفر نامہ اب ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ ان کی اشاعت سے بخوبی ہوتا ہے۔ جدید سفر نامہ معلومات، مزاح، مسرت اور مذہبی جذبات کا بھی آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ نہایت باثروت، ممتاز اور باوقار صنف نثر ہے۔ اس صنف نے اپنے تخلیقی پن کی وجہ سے بہت سے قارئین کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اس صنف کا مستقبل بھی تابندہ اور درخشندہ نظر آ رہا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ محمود نظامی، نظر نامہ، لاہور: گوشۂ ادب، ۱۹۵۸ء، ص ۲۳۶۔۲۳۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۷۔ ۲۳۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔۱۷۱۔۱۷۲

۴۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۸۷ء، ص ۳۱۶

۵۔ سلطانہ آصف فیضی، عروس نیل، دہلی: مکتبہ جامعہ ۱۹۵۳ء، ص ۳۳

۶۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۳۱۹۔۳۲۰

۷۔ ثریا حسین، ڈاکٹر، پیرس و پارس، علی گڑھ: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۴ء، ص ۳۴۔۳۵۔۱۲۷۔۱۳۱

۸۔ جمیل الدین عالی، تماشا مرے آگے، لاہور: غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۳

۹۔ جمیل الدین عالی، دنیا مرے آگے، لاہور: غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۵ء، ص ۳۱

۱۰۔ بشریٰ رحمٰن، براہ راست، لاہور: ادارہ وطن دوست ۱۹۸۳ء، ص ۸۴

۱۱۔ بحوالہ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۳۸۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۸۹

۱۳۔ رام لعل، خواب خواب سفر، لکھنؤ: شانتی نکیتن پرکاش ۱۹۸۳ء، ص ۱۹۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۱۵۔ بحوالہ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۴۰۲۔۴۰۳

۱۶۔ اسلم کمال، اسلم کمال اوسلو میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۱ء، ص ۴۴۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۴۳۔۴۴۴۔۴۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰۱۔۲۰۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔۲۱۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۴۲۔۳۴۳

۲۱۔ اختر ریاض الدین، سات سمندر پار، لاہور: پاکستان رائیٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۲۔۱۸۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۲۳۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، لاہور: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۳۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۲۵۔ اختر ریاض الدین، سات سمندر پار، ص ۱۸۔۱۹

۲۶۔ ایضاً،ص ۱۴۔۱۵
۲۷۔ بحوالہ انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۴۱۴۔۴۱۵
۲۸۔ پروین عاطف،کرن۔تتلی۔بگولے،لاہور:جنگ پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء،ص ۱۶۰
۲۹۔ بحوالہ انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۴۳۷۔۴۳۸
۳۰۔ ممتاز مفتی، ہند یاترا، لاہور:اظہار سنز،۱۹۸۲ء،ص ۶۸
۳۱ ایضاً،ص ۷۳۔۷۴
۳۲ ایضاً،ص ۷۴۔۷۵
۳۳۔ صدیق سالک،تا دمِ تحریر،راولپنڈی: مکتبہ سرمد،۱۹۸۷ء،ص ۵۱۔۵۲
۳۴۔ ایضاً،ص ۱۱۴
۳۵۔ ایضاً،ص ۱۱۸۔۱۱۹
۳۶۔ ایضاً،ص ۷۱
۳۷۔ محمد اجمل نیازی،مندر میں محراب، لاہور:پولیمر پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء۔۔۔۔ص ۲۹۔۳۰
۳۸۔ ابنِ انشاء،چلتے ہو تو چین کو چلیے، لاہور:لاہور اکیڈمی،۲۰۰۵ء،ص ۳۶
۳۹۔ ایضاً،ص ۵۶
۴۰۔ ابنِ انشاء،آوارہ گرد کی ڈائری، لاہور:لاہور اکیڈمی،۲۰۰۴ء،ص ۲۷
۴۱۔ ایضاً،ص ۶۹۔۷۰۔۷۱
۴۲۔ ابنِ انشاء،دنیا گول ہے، لاہور:لاہور اکیڈمی،۲۰۰۳ء،ص ۲۵۱۔۲۵۲
۴۳۔ ایضاً،ص ۱۹۹۔۲۰۰
۴۴۔ ابنِ انشاء،ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں، لاہور:لاہور اکیڈمی،۲۰۰۴ء،ص ۱۹
۴۵۔ ایضاً،ص ۷۵۔۷۶
۴۶۔ محمد خاں،کرنل،بسلامت روی،راولپنڈی:سٹوڈنٹس بک ایجنسی،۱۹۸۲ء،ص ۳۳۔۳۴۔۳۵
۴۷۔ محمد خاں،کرنل،بجنگ آمد، لاہور:مکتبہ جدید،۱۹۶۸ء،ص ۷۴۔۷۵
۴۸۔ شفیق الرحمن،دجلہ، لاہور:ماورا پبلشرز،۱۹۹۱ء،ص ۳۶۔۳۷
۴۹۔ ایضاً،ص ۸۴۔۸۵
۵۰۔ ایضاً،ص ۸۔۹
۵۱۔ عطاء الحق قاسمی،دلی دور است،لاہور:جہانگیر بک ڈپو،۱۹۹۵ء،ص ۳۶
۵۲۔ ایضاً،ص ۵۶۔۵۷۔۶۰
۵۳۔ عطاء الحق قاسمی،شوقِ آوارگی،لاہور:دعا پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص ۱۱۔۱۲

۵۴۔ عطاء الحق قاسمی،گوروں کے دیس میں، لاہور:گورا پبلشرز،۱۹۹۶ء،ص ۵۶۔۵۷
۵۵۔ عطاء الحق قاسمی،دنیا خوبصورت ہے، لاہور:دعا پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص ۲۹
۵۶۔ ایضاً،ص ۱۳۳
۵۷۔ عطاء الحق قاسمی،شوقِ آوارگی، ص ۲۸۲
۵۸۔ عطاء الحق قاسمی،گوروں کے دیس میں، ص ۳۸
۵۹۔ عطاء الحق قاسمی،دنیا خوبصورت ہے،ص ۶۵
۶۰۔ عطاء الحق قاسمی،شوقِ آوارگی،ص ۳۳
۶۱۔ عطاء الحق قاسمی،دنیا خوبصورت ہے،ص ۷۹۔۸۰۔۸۱۔۸۲
۶۲۔ مستنصر حسین تارڑ،اندلس میں اجنبی،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء،ص ۱۲۔۱۳
۶۳۔ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص ۱۸۵۔۱۸۶
۶۴۔ مستنصر حسین تارڑ، پچھی پیکنگ کی،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص ۳۱۲۔۳۱۳
۶۵۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء،ص ۲۹۲۔۲۹۳
۶۶۔ مستنصر حسین تارڑ، کے ٹو کہانی،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء،ص ۴۹۔۵۰۔۵۱۔۵۲۔۵۳۔۵۴۔۵۵
۶۷۔ مستنصر حسین تارڑ،خانہ بدوش،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص ۱۷۱
۶۸۔ مختار مسعود،سفر نصیب،لاہور:فیروز سنز،۱۹۸۱ء،ص ۳۳۸۔۳۳۹
۶۹۔ محمد اختر ممونکا، پیرس ۲۰۵ کلومیٹر،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۴ء،ص ۵
۷۰۔ بحوالہ انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۳۷۱
۷۱۔ محمد اختر ممونکا،پیرس ۲۰۵ کلومیٹر،ص ۳۳۔۳۴
۷۲۔ ایضاً،ص ۳۷
۷۳۔ ایضاً،ص ۳۵۔۳۶
۷۴۔ ایضاً،ص ۳۹۹۔۴۰۰
۷۵۔ ایضاً،ص ۴۲۶۔۴۲۷۔۴۲۸
۷۶۔ ایضاً،ص ۴۷۹۔۴۸۰
۷۷۔ محمد اختر ممونکا،پیرس ۲۰۵ کلومیٹر،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص ۳۶۸۔۳۶۹
۷۸۔ اے حمید، امریکانو، لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص ۵۔۶
۷۹۔ ایضاً،ص ۲۰
۸۰۔ ایضاً،ص ۴۱۷
۸۱۔ امجد اسلام امجد،شہر در شہر، لاہور:قوسین،۱۹۸۸ء،ص ۹

۸۲۔ امجد اسلام امجد، ریشم ریشم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء، ص ۴۸۔۴۹
۸۳۔ شوکت علی شاہ، اجنبی اپنے دیس میں، لاہور: گورا پبلشرز ۱۹۹۶ء، ص ۷۱
۸۴۔ شوکت علی شاہ، سلگتے ساحل، لاہور: جنگ پبلشرز ۱۹۹۴ء، ص ۱۱
۸۵۔ شوکت علی شاہ، جزیرے جمال کے، لاہور: خزینہ علم و ادب، سن ندارد، ص ۲۹
۸۶۔ شوکت علی شاہ، سلگتے ساحل، ص ۱۹۸
۸۷۔ ایضاً، ص ۱۹۱
۸۸۔ شوکت علی شاہ، جزیرے جمال کے، ص ۶۶
۸۹۔ شوکت علی شاہ، سورج آدھی رات کا، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۵ء، ص ۵۱۔۵۲۔۵۳
۹۰ شوکت علی شاہ، سورج آدھی رات کا، ص ۷۰۔۷۱۔۷۲۔۷۳
۹۱۔ شوکت علی شاہ، جزیرے جمال کے، ص ۳۳۰۔۳۳۱
۹۲۔ ایضاً، ص ۳۳۲
۹۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، "دیباچہ" مشمولہ: جزیرے جمال کے (از شوکت علی شاہ)، لاہور: خزینہ علم و ادب، سن ندارد، ص ۷
۹۴۔ سلمٰی اعوان، میرا گلگت و ہنزہ، لاہور: مقبول اکیڈمی ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۱
۹۵۔ کشور ناہید، آجاؤ افریقہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۹۔۱۶۰
۹۶۔ ایضاً، ص ۱۶۴
۹۷۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔۱۵۷۔۱۵۸
۹۸۔ ایضاً، ص ۱۱۸
۹۹۔ محمد یونس بٹ، ڈاکٹر، ہوائیاں، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۵
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۹۵
۱۰۱۔ ایضاً، ص ۷۲

☆☆☆

باب چہارم

چند منتخب سفرنامہ نگاروں کے سفرنامے

جنس نگاری کے آئینے میں

کرنل محمد خاں

کرنل محمد خاں ۱۹۲۰ء میں چکوال میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ فوج سے کرنل کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔[۱] ۱۹۹۹ء میں وفات پائی۔[۲]

کرنل محمد خاں نے طنز و مزاح پر مشتمل کتابیں تحریر کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل دو سفرنامے شامل ہیں:

۱۔ بجنگ آمد ۲۔ بسلامت روی

کرنل محمد خاں نے دو سفرنامے ''بجنگ آمد'' اور ''بسلامت روی'' تحریر کیے۔ پہلا ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران میں کیے گئے عراق، فلسطین، مصر، لیبیا اور برما کے سفر سے متعلق ہے جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا اور دوسرا سفرنامہ ۱۹۶۸ء کے یورپ، ترکی، لبنان اور ایران کے سفر کے بارے میں ہے جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ دونوں سفرناموں کی اشاعت میں دس برس کی مدت کا فرق ہے اور ان دس برسوں میں کرنل صاحب کی تحریر میں زیادہ دلکشی و پختگی آئی ہے۔ کرنل محمد خاں کی کتابوں ''بجنگ آمد'' اور ''بسلامت روی'' میں مزاح کے وافر نمونے ملتے ہیں مگر کہیں کہیں اس واقعاتی مزاح میں سفرنامے کے خصائص دب کر رہ جاتے ہیں بلکہ خصوصاً ''بجنگ آمد'' کا بیشتر حصہ تو ''نیم لفٹین'' کی جنگ بیتی پر مشتمل ہے اور اس میں بصرہ، بغداد، موصل، قاہرہ وغیرہ کے صرف ہلکے ہلکے نقش دیکھے جا سکتے ہیں یا پھر کہیں کہیں عربوں پر لطیف طنز بھی ان کے ہاں ملتا ہے۔ دورانِ مطالعہ کبھی کبھی یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا ''بجنگ آمد'' سفرنامے کی تکنیک پر پورا بھی اترتا ہے؟ ''بسلامت روی'' بیروت سے

تہران تک کے سفر پر مبنی ہے۔ اس سفرنامے میں بھی ان کا شوخ و شنگ قلم مزاح کی جوت جگاتا ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ ''بسلامت روی'' میں خارجی مقامات سے اپنے داخل تک بھی ایک سفر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور یوں وہ سفرنامے کے اکثر لوازم یقیناً پورا کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ آئے انہوں نے لکھا اور تسلیم کر لیے گئے تو بے جا نہ ہوگا۔ بے ساختگی ان کے سفرناموں کا زیور ہے۔ ان کے ہاں کلاسیکی ادب کی روایت کا ذائقہ بھی موجود ہے۔ ''بسلامت روی'' خاص طور سے ان کے طلسمی اسلوب کا حامل ہے۔

''بجنگ آمد'' کتاب کرنل محمد خاں کی جنگ بیتی ہے۔ اس میں جنس نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی کسی منظر سے خود حظ اٹھاتے ہیں اس میں قاری کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ ''بجنگ آمد'' خودنوشت کی حیثیت رکھتی ہے اس میں جوان سیکنڈ لفٹیننٹ کی سوچ کے ایسے زاویے نظر آتے ہیں جو اکثر بزرگوں کو ناگوار ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں جنگ کے حالات کے ساتھ ساتھ کرنل محمد خاں نے عیش و سرور کے واقعات بھی قلمبند کیے ہیں یوں انہوں نے جلال اور جمال کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے وہ خود ہی لکھتے ہیں:

''یہ کتاب ایک لفٹین کی جنگ بیتی ہے۔ اس میں تصوف، فقہ یا علم الکلام پر دیدہ دانستہ کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اس میں صرف ان باتوں کا ذکر ہے جو سیکنڈ لفٹینوں کو اپنی زندگی، خصوصاً جنگی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ سیکنڈ لفٹیننٹ اکثر نوجوان ہوتے ہیں اور جوانوں کے پہلو میں دل ہوتا ہے۔ وہی دل جو کئی بزرگوں کے پہلو میں پہنچ کر سنگ و خشت بن جاتا ہے نتیجہ یہ کہ نوجوانوں کی زندگی کے کئی زاویے بزرگوں کو چبھتے ہیں حالانکہ خود ان بزرگوں نے بھی جوانی میں بارہا انہی زاویوں پر خم کھایا ہوتا ہے۔ بہر حال ان محترمین کی خدمت میں پیشگی گزارش ہے کہ اس کتاب میں جہاں جنگ و جدل کا قصہ ہے وہاں عیش و سرور کی باتیں زہد و تقویٰ کا ذکر ہے وہاں ناؤ نوش کے قصے بھی ہیں۔ جہاں رکوع و سجود کا بیان ہے وہاں رقص و سرود کی داستان بھی ہے اور جہاں مردانِ اصیل کے کارنامے ہیں وہاں زنانِ جمیل کے سرنامے بھی ہیں۔''(۳)

کرنل محمد خاں کے ہاں آپ بیتی کا رنگ غالب ہے۔ ان کی کتابوں میں غالب رجحان تفریح کا نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ ''بجنگ آمد'' میں ضمنی طور پر انگریز کی اخلاقی پستی اور ''بسلامت روی'' میں لبنان، انگلستان اور سوئٹزرلینڈ کی تمدنی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں لیکن ان کا مقصد بالواسطہ طور پر اپنے معاشرے کی اصلاح کرنا نہیں ہے بلکہ وہ تہذیبی موازنے کی اس روایت سے خالصتاً تفریح کا پہلو

تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یوں وہ خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور قاری کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں جنس کا عنصر بھی غالب آ جاتا ہے اور مسرت کی تلاش میں ان کا قلم اور بھی رواں ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنس نگاری کے یہ نمونے دیکھیے جن میں تمدنی موازنے کی روایت سے تفریح کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

''رقص کے معاملہ میں ہر ملک کا اپنا مذاق ہے۔ ہندو پاکستان میں رقص کے عناصر چشم و ابرو کے اشارے اور دست و پا کی حرکات ہیں اور جس قدر نزاکت ان چہار عناصر میں ہو، رقص اتنا ہی دلفریب ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے عربی رقص کا پہلا لازمہ عریانی ہے اور دوسرا کولھوں اور چھاتیوں کی جنبش، عریانی جس قدر رو و رس اور جنبش جتنی طوفانی ہو رقص اتنا ہی لاثانی تصور ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے جب پہلی مرتبہ ایک عراقی رقاصہ کو تقریباً کپڑوں کے بغیر دیکھا تو بدک سے گئے اور جب معاملہ جنبا جنبی تک پہنچا تو باور نہ آتا تھا کہ بھری محفل میں یوں بھی ہو سکتا ہے لیکن ہوتا رہا اور ہم دیکھا کیے۔ پہلے ذرا کانی آنکھ سے، پھر جیسے کتاب پڑھی جاتی ہے اور وہ جسے ذوق سلیم کہتے ہیں۔ اس مد و جزر کی نذر ہو گیا جو ان رقاصاؤں کی سینہ زوری سے پیدا ہو کر تماشائیوں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ہمیں کٹ کیٹ اور ملحی الف لیلہ میں وہ بات نہ ملی جو ہندوستان کے مہ سیماؤں میں تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے رقص اور عربی رقص میں وہی فرق محسوس ہوا جو ستار نوازی اور ڈھول بجانے میں ہے یا گلاب اور گوبھی کے پھول میں۔ لیکن یہ ہمارا نقطۂ نگاہ ہے ممکن ہے عرب حضرات ہمارے لطیف اور مزید رقص کو دیکھیں تو کہیں ''کیا واہیات چیز ہے، نہ کولھا ہلتا ہے نہ چھاتی پھڑکتی ہے۔ یہ تو مساکین اور یتامیٰ کا رقص ہے۔''(۴)

''اس ایک رات کی مختصر سی فرصت میں زندگی کی تمام تر آسودگیاں سمیٹ لینا چاہتے تھے اور انہی کی خاطر قاہرہ نے قارون کی طرح گویا راستے میں خزانہ لٹا رکھا تھا۔ جدھر دیکھو مہ رخوں اور زہرہ وشوں کے پرے جو نہ صرف تعداد بلکہ شوق میں بھی مسافر فوجیوں سے ایک قدم آگے۔ اول تو سرِ راہ ہی نظریں لڑ جاتیں۔ ورنہ کسی رقص گاہ کا ٹکٹ لے کر فقط داخل ہونے کی ضرورت تھی اور پھر بقول اکبر یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش ــــــ ہمیں اپنے ملک میں یہ کیفیت ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ان ملکوں سے پوچھیں جو جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اخلاق اور

عصمت جنگ کے اولین شکار ہوتے ہیں اور کسی کو برائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔
ہمارے ساتھی کہ راہ و رسم منزل سے بے خبر نہ تھے، گراپی میں داخل ہوئے۔ گراپی شارع سلیمان پاشا کی مشہور رقص گاہ تھی۔ اندر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا کہ گویا بُت کدے کا در کھلا۔ گراپی کے کشادہ در و دالان میں سینکڑوں مرد اور عورتیں مصروف اختلاط تھے۔ دفعتہً بینڈ پر ایک نئی دُھن کی ابتدا ہوئی اور مرد التجائے رقص لے کر اپنی پسند کی خواتین کے آگے جا جھکے۔ ہم نے یہ التجائیں رد ہوتی بھی دیکھیں لیکن اکثر نے شرف قبولیت حاصل کیا بلکہ کئی خواتین تو اس بیتابی سے طالبانِ رقص کو تاڑ رہی تھیں کہ التجا ابھی ان کے لبوں تک پہنچی ہی ہیں اور اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید!——
یہ لازم نہ تھا کہ پسند کی خاتون سے پیشگی تعارف بھی ہو۔ مغربی رقص کے آداب نے اجنبی کو بہت کچھ حقوق دے رکھے ہیں چنانچہ تعارف اکثر رقص کے دوران ہی ہوتا تھا اور بار ہا ایسا ہوا کہ رقص کرنے کو اُٹھے تو اجنبی اور کر کے بیٹھے تو رفیق۔ بلکہ رفیق زندگی!''(۵)

کرنل محمد خاں کے ہاں زندہ دلی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ میدانِ جنگ کی ہولناک صورتحال سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان اس وقت اپنے آپ کو موت کے بہت قریب محسوس کرتا ہے اور جنگ سے فرار بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے انسان اس قسم کے لمحاتی کتھارسس کا سہارا لیتا ہے اور اس سنجیدہ اور خوفناک صورتحال کو رنگینی اور مزاح کی چلبلاہٹوں میں اڑانا چاہتا ہے۔ جنگ میں ظرافت اور زندہ دلی سے کام لینا بھی عام آدمی کا کام نہیں ہے۔ میدانِ جنگ میں جو انگریز لڑکیاں، مثلاً نرسیں اور ڈاکٹرز وغیرہ تھیں ان کا ذکر کرنل محمد خاں نے حظ اٹھاتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ بعض مقامات پر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ کی خوفناک صورتحال کا نقشہ نہیں کھینچ رہے بلکہ اُن مہ رخوں کی مدح سرائی کر رہے ہیں جن کا دیدار میدانِ جنگ میں ان کے لیے دوائے دل سے کم نہیں۔ اس سلسلے میں ان کا اسلوب خوبصورت آہنگ شگفتگی اور لذت کا حامل ہے یہ عناصر دوسرے لکھنے والوں کے ہاں کم کم ہی ملتے ہیں۔ ان کا اسلوب رنگینی اور سادگی کا حسین امتزاج ہے۔ بعض اوقات وہ واقعہ بیان کرنے کے لیے شعر لاتے ہیں۔ وہ شعر کا استعمال واقعہ کے تناظر میں خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں کلاسیکی ادب سے ماخوذ کوئی شعر جملہ یا پیراگراف ایک نئے تناظر میں اپنے اصل مفہوم سے ہٹ کر ایک نئی مزاحیہ جہت کا نمائندہ بن جاتا ہے جو بعض اوقات شعر کے کلاسیکی مفہوم سے الگ بلکہ بالکل متضاد ہوتا ہے

اور یوں ان کی تحریر لطف و انبساط کا باعث بنتی ہے۔ بعض اوقات وہ خوبصورت خواتین کی مدح سرائی، خصوصاً غالب کی زبان میں، اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی نثر پر شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے اور یوں کبھی کبھی ان کے ہاں رومانویت کا عنصر بھی در آتا ہے۔ کرنل محمد خاں جب بھی کسی خوبرو دوشیزہ کو دیکھتے ہیں تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے قلم سے اس دوشیزہ کی ایسی مدح سرائی ہوتی ہے کہ قاری بھی اپنے دل میں دورانِ مطالعہ کرنل محمد خاں سے رقابت کا جذبہ پیدا کر لیتا ہے۔ وہ جنس نگاری کا سہارا مزاح کے تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے بھی لیتے ہیں اور یوں وہ خود بھی حظ اٹھاتے ہیں اور قاری کو بھی اس مسرت میں شریک کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے ان میں اُن کی قلم کی روانی کا آپ کو خود بخود اندازہ ہو جائے گا:

''پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا۔ پُل سے پار ہوئے تو ایک نئی دُنیا میں داخل ہو گئے۔ حدِ نگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نگاہ ایک پک نِک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ انہوں نے ہمارا کانوائے دیکھا تو ہماری طرف لپکیں۔ ایک نہیں دو نہیں پوری سات دوشیزائیں خدا جانے ان بنات النعش کے جی میں کیا آئی کہ دن دہاڑے عُریاں ہو گئیں یعنی تقریباً عریاں، پیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھیں اور ابھی بھیگی بھیگی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ہمیں دیکھ کر تو خیر انہیں کیا حاصل ہونا تھا لیکن ہم سکتے میں آ گئے۔ ہمارا کارواں تو کیا، گردشِ شام و سحر رُک گئی۔ ساتوں کی سات سرو قد آہو چشم اور مرمریں بدن۔ اس قدر دلربا جیسے غالب کی غزل! اے دیکھو تو زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے، اُسے دیکھو تو سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے اور وہ جو ذرا ہٹ کر مسکرا رہی تھی، چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے اور ہم، کہ مدت ہوئی تھی یار کو مہماں کئے ہوئے، جگر لخت لخت سے دعوتِ مژگاں کرتے آگے بڑھے۔ بعد میں سُنا کہ ہمارے سالارِ کارواں بھی اس حُسن کی یلغار کے آگے تھوڑی دیر کے لیے سالار سے انسان بن گئے اور جیپ روک کر انہیں ہیلو کہا اور چلے تو ایک مدت تک پیچھے تاکا کئے۔ جب مقامی لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایک سے بڑھ کر ایک نو بہارِ ناز کون ہے تو معلوم ہوا کہ دخترانِ یہود ہیں اور یہ کہ ہم دریائے اُردن عبور کر کے فلسطین میں داخل ہو چکے ہیں۔ فلسطین کی اُٹھان کشمیر یا سوات سے مشابہ ہے انگریز اسے دیکھتے ہی ہوم یاد کرنے لگے اور ہمیں تو صحرائے عراق کی ریت اور لاوے کی درشتی کے بعد فلسطین کا

سبزہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زیرِ پا جوں پرنیاں آ رہا ہے! چھوٹی چھوٹی یہودی بستیوں سے گزرتے تو معلوم ہوتا کہ ٹیکنی کلر میں خواب دیکھ رہے ہیں، وہ رنگا رنگ کالج، وہ مدرسے کی سرخ و سپید عمارت، وہ دلکش سینما ہال اور وہ خوبصورت سینا گاگ اور مکانوں سے کہیں زیادہ حسین ان کے مکین جنہیں سات دن کی مسلسل دشت پیمائی کے بعد دیکھنے کو اگر ٹکٹ بھی لگتا تو ہم فوجی رعایت نہ مانگتے اور اب کہ یہ لوگ برضا و رغبت ہمارے کارواں کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے تھے، ہم اپنی خوبیِ قسمت پر ناز کرتے آگے بڑھتے گئے۔"(۶)

"ہمارے ہم سفروں میں خاص تعداد خاکی پوش انگریز لڑکیوں کی بھی تھی جو ہندوستان اور برما میں مختلف جنگی خدمات کے لیے جا رہی تھیں یعنی کچھ نرسیں، کچھ ڈاکٹر، کچھ سیکرٹری وغیرہ، اگرچہ ان میں سے کئی ایک خاکی وردی میں بھی خورشید و ماہ لگتی تھیں لیکن وہ جن کے دم سے یہ دہ روزہ سمندری سفر ایک گلگشت میں بدل گیا، یہ باوردی اجرامِ فلکی نہ تھیں بلکہ انسا ENSA کمپنی کے باکمال ایکٹر اور باجمال ایکٹرسیں جو برما کے محاذ پر اپنے برٹش نامیوں کو تفریحِ بہم پہنچانے جا رہی تھیں۔ جنگی خدمت کے سلسلے میں یہ برطانوی تھیٹر کی پیش کش تھی۔ مسلسل جنگ اور مورچہ گیری سے سپاہی ایک رومانی فاقے کا شکار ہو جاتا ہے جو دشمن کی گولی سے بھی مہلک تر ہوتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بیچارے کو جس دل پہ ناز ہوتا ہے، وہ دل نہیں رہتا۔ یہ انسا کمپنیوں کے تماشے اسی بے دلی کا درماں تھے۔ جنگ میں سپاہی کے لیے عورت کی دید سے بڑھ کر کوئی دوائے دل نہیں اور انسا کی ایکٹرسیں اس نکتے سے آشنا تھیں یا آشنا کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب بھی اپنی دید سے مستفید کرتیں تو کچھ چھپا کر نہ رکھتیں۔ اُن دنوں ابھی ٹاپ لیس سوٹ کا رواج نہ تھا تا ہم کسی سپاہی نے انسا کی ایکٹرسیوں سے یہ شکایت نہ کی کہ، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے۔"(۷)

کرنل محمد خاں نے "بجنگ آمد" میں زندگی کا چہرہ بگاڑنے یا مسخ کرنے کے بجائے زندگی کی شگفتگی اور لطافت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مزاح ایک الگ ذائقہ رکھتا ہے اور اس سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی اور نہ ہی کسی کو کوئی شکایت ہوتی ہے۔ انہوں نے بعض دلچسپ واقعات بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے خود ان واقعات کو دلچسپ بنا دیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے ہاں ایسے واقعات کے بیان میں جنس کا عنصر غالب آ جاتا ہے اور وہ مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس ہتھیار سے بخوبی کام لیتے ہیں۔ کرنل محمد خاں بھی ہر سفرنامہ نگار کی طرح ایسے تحریک انگیز واقعات کو بیان کرنے کے بعد ساتھ ہی اس امر کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں کہ ان کے دامن پر کوئی چھینٹ اور خنجر پر کوئی داغ نہیں ہے۔ ان کی تمہید بہت خوبصورت ہوتی ہے لیکن بات جب اپنی ذات کی ہوتی ہے تو یہ اس کا ذکر بالکل گول مول انداز میں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"حبانیہ تفریحات و آسائش کے اعتبار سے برطانیہ کا لختِ بلکہ لختِ جگر نظر آتا تھا۔ حبانیہ کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں اس بیباکی سے پھر رہی تھیں گویا پکاڈلی میں گھوم رہی ہوں۔ اگر فرق تھا تو یہ کہ چونکہ حبانیہ برطانیہ کی نسبت زیادہ گرم تھا، نتیجتاً ان دخترانِ فرنگ کا حسن لباس کی آلائش سے انتہائی زیادہ پاک تھا بقول شخصے اس اشتعال کو برداشت کرنے کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت تھی۔ ہماری پیغمبری کے متعلق کوئی Casualty وغیرہ تو نہ چھپی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ اشتعال ہم نے بڑی خوش اسلوبی سے برداشت کیا۔"(۸)

"کلونت کور ایک دراز قد، جوان سال اور دلآویز سکھ لڑکی تھی اس کے نیم وا رسیلے ہونٹ ہر لحظہ مسکراہٹ پر تلے رہتے تھے۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی لاڈلی تھی لیکن اب فوجی ضبط کا معاملہ تھا۔ کلونت کور کو بلایا اور وہ ہمارے دفتر میں اس بے تکلفی سے داخل ہوئی جیسے چائے پر مدعو تھی۔ اگرچہ ہماری کرسی سے ابھی ایک فاصلے پر تھی، لیکن ہم اُس کی خوشبو کے نصف قطر میں آ چکے تھے۔"(۹)

"بسلامت روی" میں کرنل محمد خاں کے ہاں نسبتاً زیادہ بالغ نظری پائی جاتی ہے۔ اس میں بے ساختگی کی بجائے فکری عنصر نسبتاً غالب ہے۔ اس سفرنامے میں انہوں نے سوئٹزرلینڈ، انگلستان، فرانس، جرمنی اور ترکی کے حاصلِ سفر کو بیان کیا ہے۔ اس سفرنامے کی انفرادیت یہ ہے کہ سفرنامہ نگار نے چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور چونکا دینے والی سرخیاں لگا کر قاری کے تجسس کو ہوا دی ہے مثلاً "کیا ایئر ہوسٹس تولیدِ خون کا باعث ہوتی ہے؟"؛ "بیروت میں بیوی ضائع ہونے کا خطرہ ہے"؛ "موٹی محبوبہ ایک طرح کا بونس ہے"۔ "بعض بوڑھیاں دلچسپ ہوتی ہیں"؛ "عورت کا آخری داؤ" اور "جوڈی کی بلاغت اس کے گریبان میں تھی" وغیرہ وغیرہ۔

اس سفرنامے میں بھی کرنل محمد خاں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے جنس کا سہارا لیا ہے۔ سفرنامے میں واقعاتی، کرداری اور لفظی مزاح کو حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لفظوں کے

استعمال اور جملوں کی بناوٹ میں شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ انہوں نے واقعات کو اتنی دلچسپی اور رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قاری بھی خود بخود اس مسرت میں شریک ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے۔ جن میں جنس کے ساتھ رومانویت کا عنصر بھی در آیا ہے:

''کیا پیارا ہوٹل تھا ہر طرف خاموشی، ویرانے کا سا سکوت بالکل ہنی مون کے قابل اور شاید صرف ہنی مون ہی کے قابل کہ دیگر دینوی کاروبار کے لیے یہ فضا بہت زیادہ رومان انگیز معلوم ہوتی تھی۔ ریسپشن کاؤنٹر پر بوڑھی کلرک اپنا سفید سر رکھ کر گھوک سو رہی تھی گویا آج سے چالیس برس پیشتر کے ہنی مون کو خواب میں دہرا رہی ہو۔ ہم نے انگلیوں سے کاؤنٹر پر تین تال میں دادرا بجایا۔ آخری گونج پر محترمہ نے آنکھ کھولی تو ہم نے اپنا کارڈ پیش کیا۔ آپ نے ایک عالمگیر جمائی لینے کے بعد ہمارا کارڈ دیکھا۔ معاً آپ ذرا ذہنی طور پر اچھلیں اور فرمایا:

''اوہ، مسٹر خاں —— آپ ہی کا انتظار تھا۔'' ہم نے کہا: ''میڈم، آپ سو کر ہی انتظار کیا کرتی ہیں یا ہمارا انتظار خواب آور تھا'' —— دوسری بوڑھی ہمیں کمرے تک لے گئی۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ جس میں وکٹوریہ کے زمانے کا ایک پلنگ رکھا تھا اور بس لیکن پلنگ کا طول و عرض اتنا شاہانہ تھا کہ کمرے کے اندر کمرہ لگتا تھا اور اس کے رقبے کا یہ عالم تھا کہ ہوٹل کے جملہ ہنی مونز اس کی وسعت میں ہنی مون منا سکتے تھے بہر حال یہ سہولت ہمارے لیے بے معنی تھی —— فقط بٹن دبانے کی دیر ہوتی اور بڑھیا غزالوں کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی نعمتوں کا خوان اُٹھائے سامنے آ رکھتی اور جو مزا چائے کے ساتھ گرما گرم اور رنگا رنگ ماکولات میں ہے وہ ریڈیو کے پاپ گانے کی ہزلیات میں نہیں۔ پھر بوڑھی صرف چائے ہی نہ لاتی بلکہ ڈھیر ساری ہمدردی بھی: بعض بوڑھیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔''(۱۰)

''مسٹر خان۔''

''جی، بولی'' ہم نے جواب دیا۔

''ایک زحمت دے سکتی ہوں؟''

''ارشاد''

''دو راتوں کے لیے ہمیں آپ کا کمرہ چاہیے۔ کیا آپ ایک دوسرے کمرے میں جانا پسند کریں گے؟ ذرا چھوٹا ہوگا۔

''یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ ہم سے یہ قربانی کس شخص کے لیے دلائی جا رہی ہے؟'' ''ایک امریکی جوڑے کے لیے جو ہنی مون پر آیا ہے۔ دراصل آج اکٹھے چار جوڑے امریکہ سے ہنی مون منانے آ گئے ہیں۔''

ہم نے کہا: ''کام تو نیک معلوم ہوتا ہے مگر کوئی جوڑا دکھاؤ تو۔''

''جولی بولی: ''ایک تو یہ رہا۔ آیئے، ملیے مسٹر اور مسز فرینکلن سے۔''

ملنے سے پہلے ہم نے جوڑے کو دیکھا۔ دولہا کوئی ساٹھ برس کے پیٹے میں تھا اور دلہن اس سے بھی اگلے پیٹے میں۔ ظاہر تھا کہ یہ محترمہ دولہا کی تیسری یا چوتھی دلہن ہیں اور محترم، دلہن کے پانچویں یا چھٹے دولہا ہیں کیونکہ دونوں کے چہروں پر گزشتہ شادیوں اور طلاقوں کے گہرے نقوش موجود تھے۔ ہم نے بڑھ کر دولہا سے مصافحہ کیا اور کہا: شادی مبارک، مسٹر فرینکلن۔''

''شکریہ اور ملیے میری دلہن سے مگر آج یہ بول نہیں سکتیں۔ ان کے دانت میں درد ہے۔'' جواب میں محترمہ نے منہ کھولے بغیر تبسم کیا اور اس خندۂ ناتمام کی کمی آنکھیں مٹکانے سے پوری کی۔ دانت درد کے باوجود دلہن کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی مٹکاہٹ باعثِ حیرت بھی تھی اور قابلِ داد بھی۔ چنانچہ جواب میں ہم نے ارادۃً تو کلمۂ تحسین ہی کہا لیکن غیر ارادی طور پر ہم سے بھی کچھ مسکراہٹ اور مٹکاہٹ سرزد ہو گئی۔ ہماری اناڑی ایکٹنگ دیکھ کر دلہن کو بے اختیار ہنسی آ گئی لیکن بے چاری کا منہ کھولنا تھا کہ وہ راز فاش ہو گیا جس کی پردہ داری تھی: دلہن کی لب بندی دانتوں کے درد کی وجہ سے نہ تھی، دانتوں کی کمی کی وجہ سے تھی۔ ہم نے سوچا اگر ہمارا کمرہ اس بے دانت ہنی مون کے کام آیا تو سمجھو حرام گیا۔ ہم نے جولی کی طرف ذرا خفگی انداز سے دیکھا —— جولی جھٹ بولی:

''اور اب ذرا پیچھے دیکھیں۔ ایک اور ہنی مون جوڑا آ رہا ہے۔'' اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مدھ بھری جوانی میں مخمور جوڑا، باہوں میں باہیں اور نگاہوں میں نگاہیں ڈالے، غیروں کے وجود سے بے خبر اور فقط ایک دوسرے کے لمس سے باخبر آہستہ آہستہ کھانے کے کمرے سے نکل کر ہماری طرف آ رہا ہے۔ فرمودۂ اقبال ہے کہ کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب۔ جس سیل دوگانہ سے ان کی کشتیاں دوچار تھیں، وہ تو ان دونوں کے دل ہی جانتے تھے لیکن کشتیوں کے باہمی ٹکراؤ سے بیرونی تھپیڑوں

کا یہ عالم تھا کہ ساحل نشین تماشائیوں کی من کشتیاں بھی ڈولنے لگیں۔ ہم نے اپنی ڈولتی کشتی سے جولی کو کہا:

''جولی، اگر کمرہ اس جوڑے کے لیے چاہیے تو کمرہ تو کیا ہم دنیا بھی خالی کرنے کو تیار ہیں۔''

جولی بولی: ''آپ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے۔ عاشقوں سے ہر کوئی عشق کرتا ہے۔'' ہمارے سامنے عشق ہو رہا تھا اور ہم اُسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میچ دیکھ رہے ہوں اور تماشائیوں کی طرح داد بھی دے رہے تھے واہ وا! لیکن ہمارے کھلاڑی ہماری داد سے بے نیاز اور بے خبر رہے ناچار جولی نے ایک زور کی مصنوعی چھینک ماری جو ہمیں لگی، بوڑھے بوڑھی کو لگی لیکن اس عشق باز جوڑے کو نہ چونکا سکی۔ آخر وہ محبت ہی کیا جو چھینک سے منتشر ہو جائے۔ اس پر بوڑھے دولہا نے نوجوان کا ہم عمر نہ سہی، ہم مشرب ضرور تھا، بڑھ کر نے دولہا کا کندھا تھپتھپایا۔ نوجوان نے ایک لمحے کے لیے اپنی دلہن سے اجازت لی اور بڑے میاں سے مخاطب ہوا:

''یس سر''

جولی کو موقع مل گیا اور جھٹ بول اٹھی:

''آپ کے لیے کمرے کا انتظام ہو گیا ہے۔''

نوجوان کہ اپنے بازو بدستور محبوبہ کی کمر میں حائل کیے ہوئے تھا مختصراً بولا: ''فائن''

اور اگلے لمحے میں نو بیاہتا جوڑے کے لب و رخسار کا باہمی فاصلہ بتدریج صفر ہونے لگا۔ اس بوڑھے نے اپنی بڑھیا کی آنکھوں میں جھانک کر اُسے بھی جنس وار طیش دلانا چاہا لیکن بڑھیا کے ترکش میں ایک ہی تیر تھا: آنکھیں مٹکانا! جو اس نے بڑی چابکدستی سے مٹکائیں۔ بے شک ان آنکھوں میں ربع صدی پیشتر قیامت کی کشش ہو گی لیکن اس کشش تک پہنچنے کے لیے اب پچیس برس تفریق کرنے کی ضرورت تھی۔ ہماری ریاضی یوں بھی کمزور ہے چنانچہ ہماری نگاہیں بدستور ادھر ہی جمی رہیں جہاں جمع تفریق کی حاجت نہ تھی۔''(۱۱)

''بسلامت روی'' میں شگفتگی کے ساتھ فکری عنصر کا بھی غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ کرنل محمد خاں جس ملک میں بھی گئے اور انہوں نے وہاں اپنی آنکھ سے جو کچھ بھی دیکھا، اس کو شگفتگی کے ساتھ بیان

کر دیا ہے۔ انہوں نے خصوصاً یورپ کے کلچر کی بھی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے ان ممالک کی آزادانہ سوچ اور ان کی مادر پدر آزادی کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کے عریاں نظامِ حیات پر انہوں نے کوئی پردہ نہیں ڈالا تو بے جا نہ ہو گا۔ اس طرح کرنل محمد خاں یورپ کے لوگوں کے عمومی مزاج کو بیان کرتے ہوئے بھی پست سطح پر اترے بغیر بڑی بے ساختگی، روانی اور شگفتگی کے ساتھ سب کچھ قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح ''بسلامت روی'' میں کہیں کہیں ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے بھی ملتے ہیں۔ اس کے ذریعے وہ ان ممالک کا کلچر اور ماحول بڑی بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری ان ممالک کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اقتباسات دیکھیے جن میں جنس نگاری کے کچھ حقیقی نمونوں کے ساتھ مزاح کی آمیزش بھی ہے تا کہ قاری زیادہ سے زیادہ حظ اٹھا سکے:

''بارش تھم چکی تھی۔ مطلع صاف تھا اور روشنیاں تبدریج روشن تر ہونے لگیں۔ پھر ہمارے سامنے سے حسینانِ پیرس کی پریڈ گزرنے لگی۔ ان کے ملبوس؟ ہاٹ پینٹیں (Hotpants)، دہکتی پینٹیں، بلکہ اکا دکا بھاپ دیتی پینٹ نیچے کھولتی انگیائیں، اوپر بولتی بلاؤزیں اور بعض اوقات نہ انگیائیں نہ بلاؤزیں فقط کھلے پٹ کی ہوادار بنیانیں، اُن پر شوخ رومال اور رنگیلے منکے۔ دوسری طرف مردوں کی خودسر زلفیں اور خود رو داڑھیاں۔ مونچھیں جیسے ہر دو گوشۂ لب سے جونکیں جھول رہی ہوں اور قلمیں جیسے کانوں سے جرابیں لٹک رہی ہوں۔ اور اس ہزاروں کی برات میں شاذ ہی کوئی اکیلا یا اکیلی ہے۔ ہر طرف جوڑے ہی جوڑے ہیں۔ جوڑا اگر پیدل ہے تو وہ اپنی ہم خرام کو بازوؤں میں لپیٹے رواں ہے اور اگر سکوٹر پر سوار ہے تو یا اپنے ہم جلیس کو کلاوے میں لیے اڑتی جا رہی ہے اور جب سامنے ٹریفک کی بتی لال ہو جاتی ہے تو ہم جلیس یک لخت سکوٹر روکتا ہے اور اس خداداد فرصت میں رخ پیچھے موڑتا ہے پھر کچھ یہ جھکتا ہے، کچھ وہ اُبھرتی ہے لب لبوں سے ملتے ہیں اور غیر معینہ مدت کے لیے ملے رہتے ہیں تا آنکہ کوئی تیزی کا مارا موٹر سوار ہارن دے کر بتی کے سبز ہو جانے کی خبر بد سناتا ہے اور پھر اس وقت تک دونوں کی بددعائیں سنتا رہتا ہے جب تک کے اگلے چوک کی لال بتی نہیں آ جاتی اور ادھر دیکھیے۔ یہ بی بی خلاف معمول تنہا چلی آتی ہے۔ چلی آتی ہے حتیٰ کہ ہمارے بالکل قریب آ گئی۔ اللہ، یہ سچ مچ کوئی فتنہ روزگار ہے بالکل ارما لا دیوس لگتی ہے۔ اگر وہ نہیں تو اس کی سگی بہن ہے۔ ہم اسے ارما ہی کہیں گے۔ اس کے گریبان کی

دی (V) کی شاخوں کی کشادگی اور زاویے کی گہرائی تو ملاحظہ فرمائیں۔ اگر یہ دی ایک نُوت اور کشادہ ہوتی تو سینے کی سرکشی راز نہ رہتی اور اب بھی یہ راز جو جزوی طور پر ہی سر بستہ ہے مکمل طور پر افشا ہونے کے لیے ایک چھوٹی سی چھینک یا ہلکی سی ہچکی کا محتاج ہے۔ ارما ہماری نشستوں کے بالمقابل پہنچ کر ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے دو فرانسیسیوں نے ارما کو غور سے دیکھا۔ باہم نوٹ ملائے اور پھر اُس پر فرانسیسی زبان میں ایک چبھتا ہوا آوازہ کسا جو ہماری سمجھ میں تو نہ آیا لیکن یوں معلوم ہوا جیسے کہتے ہوں "کاش تیرے گریباں کا زاویہ ذرا اور کشادہ ہوتا" ـــــ اس پر ارما نے مُڑ کر انہیں سوالیہ انداز میں دیکھا اور سینے کو مزید تان کر کچھ کہے بغیر مسکرا دیا لیکن جو کچھ ارما نے نہیں کہا تھا، ارما کی مسکراہٹ نے کہہ دیا اور چونکہ مسکراہٹ کی زبان فرانسیسی نہیں ہوتی، لہٰذا ہم بھی ارما کا مدعا پا گئے۔ ارما کہہ رہی تھی:

میری اتنی روشنی سے دل و جاں سُلگ رہے ہیں۔

میں ذرا سی لَو بڑھاؤں تو یہ بزم جل نہ جائے؟

اور بلاشبہ یہ خطرہ بالکل حقیقی تھا کہ ہمارے گردوپیش ابتدائی دُھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا لیکن اتنے میں کہیں سے ایک ان دُھلا لونڈا آ نکلا اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے سالم ارما کو اپنے بازوؤں میں لے کر پریڈ میں شامل ہو گیا۔"(۱۲)

"ہم نے سیلز گرل کو سویٹر دکھانے کو کہا۔ وہ خود تو ہماری انگریزی سمجھ نہ سکی مگر شتابی سے ایک اور سہیلی کو پکڑ لائی جو انگریزی بھی بول سکتی تھی۔ انگریزی داں لڑکی مسکراتی آئی تو اپنی انگریزی دانی کی اہمیت سے ہی نہیں، شکل و صورت سے بھی انتخاب نظر آئی۔ بالکل برشی بار دوت لگتی تھی۔ ہم سے انگریزی زبان مگر فرانسیسی لہجے میں بولی:

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مجھے ایک زنانہ سویٹر چاہیے اپنی لیڈی کے لیے"؟

یہ سوال غیر ضروری تھا لیکن بڑی تواضع سے پوچھا گیا تھا لہٰذا ہم نے بھی مناسب خوش مزاجی سے جواب دیا:

"جی ہاں ـــــ بالکل۔"

"کیا سائز ہے؟"

اور ہمیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ سویٹر خریدنے سے پہلے اس کا سائز معلوم ہونا چاہیے جو ہمیں معلوم نہ تھا۔ ہمیں اپنی سادہ لوحی کا احساس ہوا اور معافی مانگ کر لوٹنے ہی کو تھے کہ برشی بولی: "ٹھہریے"

اور فرانسیسی میں ذرا بلند آواز سے کسی کو پکارا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف اونچائیوں اور گولائیوں کی چھ لڑکیاں اپنے کونٹر چھوڑ کر ہمارے سامنے سینہ تان کر قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ برشی نے ہمیں دعوت دی:

"موسیو ـــــ ان لڑکیوں کو دیکھیں اور بتائیں کہ ان میں کس کا سائز آپ کو بیگم کی یاد دلاتا ہے۔"

لڑکیاں دیکھنا شروع کیں تو جس پر نگاہ پڑتی، اُسی کا کرشمہ دامن دل کھینچ کر کہتا کہ جا اینجاست اور بیگم کی یاد کی طرف بڑھنے نہ دیتا۔ کسے چنتے اور کسے رد کرتے؟ کچھ فیصلہ ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ آخر ہم نے ناکامی اور نفی میں سر ہلایا لیکن اس پر بھی برشی مایوس نہ ہوئی۔ وہی فاتح عالم مسکراہٹ لیے بڑی بے تکلفی سے آگے بڑھی اور ہمارے روبرو دو ملی میٹر کے فاصلے پر آ کھڑی ہوئی۔ پھر آرام سے ہمارے دو بازوؤں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور ہمیں دعوت پیمائش دی۔ جونہی ہمیں برشی کے منصوبے کا اندازہ ہوا ہم نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:

"میڈم موزیل، مجھے اتنے صحیح ناپ کی ضرورت نہیں۔ بس اپنے ہی سائز کا سویٹر دے دیں۔"

ہم نے اتنی جارحانہ سیلز مین شپ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گلے ملنا بنیادی طور پر بے شک مستحسن فعل ہے لیکن اس کے پیچھے کچھ شوق، کچھ محبت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ گلے ملنا کس کام کا جس کا محرک سویٹر فروشی کا جذبہ ہو ـــــ بہر حال صحیح یا غلط ہم نے برشی کے سائز کا سویٹر خرید لیا لیکن جب برشی نے سویٹر کا بل پیش کیا تو محسوس ہوا کہ اس میں جتنی قیمت سویٹر کی ہے اتنی ہی فیس معانقہ بھی شامل ہے یعنی دو قدم پیچھے ہٹنے کا قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

سویٹر کا بل ادا کرنے کے بعد ہمارے مزید شاپنگ کے عزائم کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ چنانچہ ہم نے خالی ہاتھ شانز ایلیز ے کا الوداعی چکر لگانے کا فیصلہ کیا اور جب تھک گئے تو کھانے کے لیے ایک جگمگاتے ریستوران میں داخل ہو گئے جہاں ایک

جھلملاتی ویٹریس یا میزبانہ نے ہمارا خیر مقدم کیا، ہمیں میز تک لے گئی اور ہمارا آرڈر لیا لیکن جب کھانا لائی تو اس میں نہ ریستوران والی جگمگاہٹ تھی، نہ میزبانہ والی جھلملاہٹ۔ بالکل بے رنگ اور بے جان سا پکوان تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ پکوان سے کہیں زیادہ میزبانہ غذائیت سے بھرپور نظر آتی تھی لیکن نیک بخت کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ہماری بھوک کے سائز کے متعلق استفسار کرتی حالانکہ یہ بھی برشی کے شہر میں رہتی تھی۔ ناچار ہم کھانا ہی کھا کر لوٹ آئے۔"(۱۳)

کرنل محمد خاں کے ہاں "بسلامت روی" میں بعض مقامات پر افسانوی انداز بھی ملتا ہے۔ کہیں کہیں وہ اپنی ذات کی نمائش کی کوشش بھی کرتے ہیں اور اس طرح کہیں کہیں ان کے ہاں افسانوی انداز کے مبالغہ آمیز نمونے بھی در آتے ہیں۔ دراصل وہ ہر واقعے سے حظ اٹھانا چاہتے ہیں اور جنس کا سہارا لیکر اس کو مزید چٹخارے دار بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کہیں کہیں نہ صرف ان کے سفرناموں میں افسانوی انداز کے مبالغہ آمیز نمونے پائے جاتے ہیں بلکہ ان کا مزاج بھی اکثر مقامات پر جنس کا مرہونِ منت نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے جس میں وہ ایک تقریب کا نقشہ کھینچ رہے ہیں:

"دروازے کی بلندی سے کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے عورتوں اور مردوں کی ایک پوری قطار پھولوں کے ہار لیے کھڑی ہے۔ پرویز نے کچھ صورتیں پہچان کر کہا: "یہ لوگ میرے استقبال کو آئے ہیں۔" اور پھر سیڑھی سے اترا ہی تھا کہ ایک بزرگ نے بڑھ کر اس کے گلے میں ہار ڈالا اور پھر اس سے بغل گیر ہو کر اس کے گالوں اور آنکھوں کو چوم لیا—— ایرانی ملاقات میں سب کچھ ڈال دیتے ہیں: دست و بازو، لب و چشم جان و دل—— پرویز نے فارسی کے چند لفظوں میں ہمارا تعارف بھی کرا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ بزرگ نے جو پرویز کا باپ تھا، ہمارے رخسار و چشم پر بھی وہی عمل کیا اگرچہ خوش قسمتی سے اس میں وہ پدرانہ شدت نہ تھی۔ آگے پرویز کی بوڑھی ماں کھڑی تھی جو خوشی میں بیٹے کو پھولوں کا ہار پہنانا تو بھول گئی لیکن اسے سینے سے لگا کر بوسوں کا ہار پہنا دیا۔ جب ماں سے مل کر پرویز آگے بڑھا تو اس پیاری پوپلی خاتون نے ازراہِ شفقت ہمارے گال بھی گدگدا دیے۔ آگے پرویز کے چچے چچیاں، خالو خالائیں تھیں۔ انہوں نے بھی حسبِ دستور پرویز کو شش پہلو پیار کیا اور ہم سے بھی کسی نے ہاتھ ملایا اور کسی نہ پیٹھ تھپکا دی۔ آگے مقطعے میں تھیں پرویز کی عم زادیاں اور خالہ زادیاں: ماڈرن، حسین،

مہ جبیں اور دل نشیں، ہاتھوں میں ہار لیے، ہونٹوں میں پیار لیے اور آنکھوں میں خمار لیے اور یہاں تخن گسترانہ بات آ پڑی۔ پرویز سے تو وہ بھی اس طرح لپٹیں جیسے ماڈرن کزنیں (Cousins) لپٹا کرتی ہیں مگر ہمیں محض سر کے خم یا لبوں کے تبسم پر ہی ٹال دیا بلکہ قطار کی آخری لڑکی نے تو ہمیں نہ صرف تبسم سے محروم رکھا بلکہ اس طرح گھورا جیسے کہتی ہو: "تو کیستی؟" —— لیکن خیر مجموعی طور پر یہ تقریب ہمیں موافق ہی آئی۔ آخر ہمارے لیے یہ سب کچھ جھونگا ہی تو تھا بلکہ خاصا خوشگوار جھونگا۔ حسینوں کے معاملے میں صحیح فلاسفی وہی ہے جو فیض نے بیان کی ہے:

ع گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اور اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پرویز ایک ایسی لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے جو کسی قدر ہٹ کر کھڑی ہے جیسے استقبال کنندوں میں شامل نہ ہو بلکہ تماشائی ہو اور لڑکی کیا تھی؟ یک دخترِ آفتاب شمائل، سعدی کا سرو سیمیں اور حافظ کا غزالِ رعنا مگر اُداس اُداس جیسے پلکوں پر آنسو آنے والے ہوں یا آ کر گر چکے ہوں۔ پرویز اُس کے قریب جا کر ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ ایک مدت کے بعد پرویز نے ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ ہمارے پوچھے بغیر بولا:

"یہی مہر ہے۔"(۱۴)

کرنل محمد خاں کے ہاں زندگی سے حظ اٹھانے اور واقعات سے محظوظ ہونے کا رویہ غالب ہے۔ وہ زندگی کو ایک آسودہ حال شخص کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ واقعات اور مضحک کیفیات سے نہ صرف خود لطف اٹھاتے ہیں بلکہ قارئین کو بھی اس مسرت میں شریک کرتے ہیں، ان کے ہاں طنز کا پہلو تقریباً ناپید ہے۔ ان کی تحریر قاری کو مسکرانے پر آمادہ کرتے ہوئے حزینہ کیفیت سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان کے ہاں اُداسی اور ناآسودگی کے برعکس خوش طبعی اور زندہ دلی کا احساس غالب رہتا ہے۔ انہوں نے "بسلامت روی" میں سوئٹزرلینڈ، انگلستان، فرانس، جرمنی اور ترکی کی تمدنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خصوصاً وہاں کی میموں کا تذکرہ بڑی بے تکلفی سے اور مزے لے کر کیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں کہیں کہیں سطحی تلذذ کا عنصر بھی ملتا ہے۔ جب وہ دخترانِ فرنگ کے حسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ بات کو طول دے کر چوما چاٹی تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس ماحول سے دامن بچا کر گزرنا ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ضرور ہے کیونکہ اس اشتعال کو برداشت کرنے کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرنل محمد خاں رات بھر اپنی روحانی مرہم پٹی کرنا بھی جانتے تھے وہ

ہوٹل پہنچ کر سب سے پہلا کام یہی کرتے کہ وضو کر کے مصلّے پر بیٹھ جاتے۔ ہمارے بیشتر سفر نامہ نگار اپنے سفر ناموں میں جنسی لطائف اور جنسی واقعات کا بیان تو چٹخارے لے لے کر کرتے ہیں مگر خود کو پارسا ثابت کرتے ہیں کیونکہ اُن کو پتا ہوتا ہے کہ ان کے مشرقی قارئین اُن کی ان بدکاریوں کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے عموماً جنسی واقعات کے بے بہا تذکرے کے بعد جب معاملہ اپنی ذات تک پہنچتا ہے اور کچھ کر دکھانے کا مرحلہ آتا ہے تو قاری کے چسکے کو ادھورا چھوڑ کر ہمارے سفر نامہ نگار خود شرافت کا احرام باندھ لیتے ہیں۔ بہر حال کرنل محمد خاں نے مغربی تفریح گاہوں یعنی بیچ، جوئے خانوں اور دیگر خانوں کا تذکرہ بڑی بے باکی سے کیا ہے اور اس سلسلے میں وہ کہیں بھی نہیں چوکے بلکہ ایسے مناظر کو انہوں نے رنگینی سے بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''ہم بھی دل میں شوق لیے سُوئے برائٹن بڑھے لیکن منزل پر پہنچے تو برائٹن تو موجود تھا مگر بیچ غائب تھی۔ اس کی میلوں کی لمبائی عریاں جسموں اور پریشاں بالوں سے اٹی اور ڈھکی پڑی تھی۔ ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کی ستر پوشی کا واحد ذریعہ اُن کے سَر کے بال تھے، ریت پر کچھ اس طرح گڈمڈ بیٹھے یا لیٹے تھے کہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کون سی باہیں ٹانگیں کس دھڑ اور چہرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس ہمہ گیر عریانی کی ولایت میں ہمیں اپنے آپ کو کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خلاف قانون حرکت کر رہے ہوں اور خدا جانے وہ کون سا اندرونی، قومی یا دینی احتساب تھا جس نے ہمیں اپنے کپڑے نوچ کر اس برہنگی کے سمندر میں کود پڑنے سے باز رکھا چنانچہ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ پکی سڑک پر ہی چلتے رہے لیکن سڑک پر چلنے والوں اور والیوں کا چال چلن بھی کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔ دختران فرنگ فیشن کی رو میں سینہ ننگا کرتے کرتے بہت نیچے چلی گئی ہیں اور رانیں برہنہ کرتے کرتے بہت اوپر جا پہنچی ہیں چنانچہ اس بے باک گریباں چاک ہجوم سے گزرنے کی کوشش کی تو اوپر سینے سے سینہ چھلنے لگا اور نیچے ٹانگوں سے ٹانگیں اُلجھنے لگیں —— خدا جانے پُل صراط سے گزرنا کتنا مشکل ہوگا لیکن برائٹن کی صراط پر چلنا بھی چنداں سہل نہ تھا۔''(۱۵)

''ہمیں ہوٹل کا نیلگوں ''سومنگ پول'' رنگا رنگ چھتریاں اور سرخ و سپید جسم دکھائی دیے ولید بولے: ''آیئے آپ کو ذرا اس مرکزی ہوٹل کا ذائقہ بھی چکھاتے جائیں'' اور پھر سیدھے اس خالی میز کی طرف بڑھے جو نہانے والوں، نہانے والیوں اور تماشائیوں کے جھرمٹ میں سومنگ پول کے کنارے رکھی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے اور پھر گردو پیش نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف جسم ہی جسم دکھائی

دیے برہنہ بے پروا جسم، سنسناتے تھرتھراتے جسم، بے تاب بے حساب جسم، جوانی سے چور اور زندگی سے بھرپور جسم!

اتنے میں ایک بیرا آیا جس نے ولید کو پہچان کر سلام کیا۔ معلوم ہوا کہ ولید صاحب بھی اس حوض کے پرانے شناور ہیں۔ بیرا کوکا کولا لے آیا۔ ہم ہاتھوں سے آب اور آنکھوں سے شراب پینے لگے۔ ناگاہ ایک برق وش نے رُک کر سوئمنگ پول کے نیلگوں پانی سے اپنا رُخ آق سینہ بلند کیا۔ اسے دیکھنا تھا کہ ہمیں دو آبے سے آواز سنائی دی: جتی نہا کے چھپڑوچوں نکلی، سُلّلے دی لاٹ ورگی۔ اگلے لمحے میں اس شعلہ رُو کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُسی لمحے ہم نے اپنے چہرے پر تارچ کی سی روشنی محسوس کی۔ کیا اس کی مسکراہٹ کا رُخ سچ مچ ہماری طرف تھا؟ اجنبیت کے باوجود ہم جواب میں وجد میں آنے کو تھے کہ ولید نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر نہ صرف جنبشِ بازو سے جواب دیا بلکہ چلا کر کہا:

''لیلیٰ''

اور ساتھ ہی ہمیں اطلاع دی کہ ''لیلیٰ میری دوست ہے۔'' ہمارا وجد یک لخت تھم گیا کہ لیلیٰ کی مسکراہٹ کے مخاطب ہم نہ تھے، ہمارا ہم نشین تھا گو یہ بھی کم نہ تھا کہ ولید کی معرفت ایک دُور کی نسبت ہمیں بھی تھی۔ لیلیٰ کو غور سے دیکھا تو ظالم جس حد تک پانی سے باہر تھی، اگر بلا نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ ہم ولید کی خوبی قسمت پر رشک کی ابتدا ہی کر رہے تھے کہ لیلیٰ آبی زینے سے چڑھ کر ایک نوخیز غزالہ کی طرح رقصاں رقصاں ہمارے سامنے اور قریب آ کھڑی ہوئی۔ اتنی قریب کہ ذرا بے باکی سے آنکھ جھپکتے تو اس کے گیلے بدن کو پلکوں سے چھو لیتے لیکن یہ آنکھ جھپکنے کا نہیں آنکھ کھولنے کا مقام تھا اور دیکھا تو جو کچھ پانی کے اندر بھی تھی، اگر قیامت نہ تھی تو کچھ نہ تھی اور قیامت بھی وہ جو عین سر پر آ کھڑی ہو۔ لیلیٰ نے ولید کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''آؤ نہائیں''

ولید بولے: ''پہلے اِن سے ملو، مسٹر خان، میرے مہربان۔''

بولی: ''میرے بھی ہیں۔''

اور پھر ہماری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ''آپ بھی آئیں مسٹر خاں۔''

کہا: ''شکریہ میرے پاس تو نہانے کے کپڑے نہیں۔''

بولی: یہاں بیدنگ سوٹوں کی کمی نہیں اور مرد کا بیدنگ سوٹ ہوتا بھی کیا ہے؟ ایک بالشت کپڑا!'' —— اور مسکرا دی۔

ہم نے کہا: ''جی ہاں، ظلم تو عورتوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے پوری دو بالشت کا سوٹ پہننا پڑتا ہے۔''

بولی: ''پہننا نہیں، کسنا پڑتا ہے۔''

اور پھر بیرے سے بولی: ''بیرا، دو مردانہ کاسٹیوم لے آؤ۔''

ہم نے کہا: ''مس لیلیٰ، دعوت کا شکریہ مگر میں یہاں نہ نہا سکوں گا۔ ہمارے یہاں غسل پردے کا معاملہ ہے۔''

بولی: ''مگر ہم کوئی برہنہ تو نہیں نہار ہے۔''

کہا: ''محترمہ، یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کی برہنگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے۔''

بولی: ''آپ کے ہاں کہاں سے شروع ہوتی ہے؟''

عرض کیا: ''بھئی سچی بات ہے اپنے ہاں تو ٹخنے سے شروع ہوتی ہے اور اکثر اوقات سر سے پار ہو جاتی ہے مگر آج کل آنکھوں پر بھی رُکنے لگی ہے۔''

کہنے لگی: ''تو اللہ آپ پر رحم کرے، آپ تشریف رکھیں۔ مجھے آپ کی پردہ دری منظور نہیں مگر ولید تم؟''

ولید بولے: ''آج ہم بھی پردہ نشیں ہیں —— خدا حافظ۔''

لیلیٰ نے الوداع میں اپنے لمبے بازو کی تمامتر لمبائی کو ایک دلگدازی بخش دی ساتھ ہی ہم دونوں پر ایک متبسم نگاہ ڈالی جو ولید کے دل سے ہوتی ہوئی ہمارے جگر کے پار بھی ہو گئی۔ پھر رقصاں رقصاں لب آب تک پہنچ گئی اور ایک کھلنڈری مچھلی کی طرح پانی میں اتر گئی اور ہم مرکزی ہوٹل کا مزا چکھ کر —— زبان سے کم، آنکھوں سے زیادہ —— آخر اٹھ کھڑے ہوئے۔''(۱۶)

''بسلامت روی'' میں کرنل محمد خاں کے ہاں ہنسی ہنسی میں کہیں کہیں فلسفے کا پیچ بھی ملتا ہے۔ وہ مختلف ممالک میں جن لوگوں سے بھی ملے خصوصاً خواتین سے اس کا ذکر انہوں نے محض خارجی سطح پر ہی نہیں کیا بلکہ ان کے داخلی احساس کی بھی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ان کے اندر جھانک کر دیکھا ہے اور اس طرح ان کی تحریر میں فکری عنصر بھی در آیا ہے۔ انہوں نے وہاں کے ممالک کی خواتین کا طرزِ گفتگو، ذوقِ لباس اور خود اعتمادی کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ انہوں نے وہاں کی خواتین سے جو مصاحبہ نما گفتگو کی ہے اور جو ان کے تاثرات لوگو کے بارے میں

ہیں ان کو انہوں نے بڑی مہارت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر رقم کیا ہے۔ انہوں نے اس سارے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اور عورت کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو عورت اپنے حسن کی نمائش کے لیے برہنگی کا سہارا لیتی ہے تو گویا وہ اپنا آخری داؤ استعمال کرتی ہے کیونکہ عریانی نسوانی حسن کا آخری داؤ ہوتا ہے۔ یورپی معاشرے میں تو عریانی اور فحاشی میں وہ جنس نہیں رہی ہے جسے دیکھ کر انسان بے قابو ہو جائے اب وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے اور طرح کے ''غیر معمولی'' افعال سرانجام دیتے ہیں جو دراصل سراسر ان کی بیمار اور ہیجان انگیز ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ کرنل محمد خاں نے بعض مقامات پر کچھ علمی موضوعات کو بیان کرنے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں انہوں نے انسانی نفسیات (خصوصاً نسوانی) کی کچھ گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے:

''ہم پر یہ راز کھلا کہ جوڈی محض بودی سی، انجان سی، کھلنڈری سی گڑیا نہیں بلکہ بڑی سوچتی سمجھتی، عاقل بالغ لڑکی ہے۔ رہا اس کا طرزِ گفتگو ذوقِ لباس اور اندازِ لغزش تو یہ سب ایک ایسی خود مختار اور خود اعتماد حسینہ کی ادائیں ہیں جو زندگی سے نہایت شاہزادگانہ سلوک کرنا چاہتی ہے۔ ذرا بے تکلفی بڑھی تو ہم نے ایک سوال جو صبح سے ہمارے ذہن میں کلبلا رہا تھا، پوچھ ڈالا:

''جوڈی، تم اس شکل و صورت کے ساتھ گائیڈ ہونے پر کیوں قانع ہو؟''

جوڈی ہنسی اور بولی: ''آپ پہلے آدمی نہیں جس نے یہ سوال پوچھا ہو۔''

''تو تم نے پہلے آدمی کو کیا جواب دیا تھا؟''

''بس یہی کہ مجھے گائیڈ ہونا پسند ہے۔ میں دیس دیس کے لوگوں سے ملتی ہوں (ذرا مسکرا کر) ''آپ جیسے لوگوں سے۔''

''لوگوں سے ملنا تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

جوڈی کی جھلاہٹ کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ ''میں اتنی بڑی نعمت کا ذکر کر رہی ہوں، تم سمجھتے کیوں نہیں؟'' اور سمجھنے کی کوشش کی تو اچانک ہم پر ایک بڑی سچائی کا انکشاف ہوا کہ سچ مچ زندگی کی رونق تو لوگوں سے ملنے ہی میں ہے۔ خود ہماری اس لمحے کی رونق جوڈی سے ملنے میں تھی بلکہ ہمارے سارے سفر کا حاصل رنگا رنگ لوگوں کی ملاقات ہی تھی اور یہ کتاب کیا ہے؟ یہ انہی ملاقاتوں کی روداد تو ہے۔ جوڈی کا انگریزی جملہ ہمارے ذہن میں گونجنے لگا People are Fun، ویسے جوڈی

نے کوئی نئی بات تو نہیں کہی تھی۔ غالب یہی سبق ایک مدت ہوئی دے چکے تھے بلکہ غالب کو تو لوگوں سے ملنے پر کسی قدر ناز بھی تھا اور کم آمیز پیغمبروں کو بھی نہیں بخشتے تھے:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

لیکن مرزا اپنی بلاغت کے باوجود یہ سبق ہمیں اتنا اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرا سکے تھے جتنا جوڈی نے چند لمحوں میں کرا دیا۔ آخر بحیثیت استاد جن آلات سمعی و بصری سے جوڈی لیس تھی، میرزا اُن سے یکسر محروم تھے۔ میرزا کی تمامتر بلاغت اُن کی زبان میں تھی جو بتیس دانتوں میں بند تھی اور جوڈی کی بلاغت اس کے گریبان میں تھی جو نصف سے زیادہ چاک تھا۔ بہر حال جوڈی کو دیکھ اور سُن کر ہمیں خاص خوشی ہوئی کہ خدا نے بہت کم حسینوں یا حکومتوں کو ایسی خوشگوار اور آزاد خارجہ پالیسی کی توفیق عطا فرمائی ہے چنانچہ اس شام آکسفورڈ سے لوٹے تو ہر چند کہ ہمارا اس جگہ کا قیام مختصر تھا ہماری وہاں کی یادیں بڑی دیرپا تھیں۔"(۱۷)

"عمر کے لحاظ سے تو اب جوانی کو پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن باتیں بدستور رنگین مزاجوں کی سی کرتے تھے۔ ہمیں مختلف مقامات و شخصیات تک لے جانے لگے تو کار میں بیٹھتے ہی بولے:

"کرنل خاں، آپ غلط وقت پر ایڈن برا آئے ہیں یعنی کوئی ایک مہینہ قبل از وقت۔"

کہا: "ایک مہینہ بعد کونسی نعمت تقسیم ہونے والی ہے۔ ہم پھر بھی آ سکتے ہیں۔"

بولے: "ضرور آیئے۔ اگلے ماہ ایڈن برا میوزک فیسٹیول شروع ہو رہا تھا۔ بڑی غضب کی رقاصائیں آئیں گی۔"

"وہ تو ہم نے لندن میں بھی دیکھی ہیں۔ یہاں کی رقاصائیں کچھ زیادہ غضب کی ہوتی ہیں؟"

"رقص کے اعتبار سے تو نہیں لیکن لباس کے لحاظ سے یقیناً۔"

"کون سا لباس پہنتی ہیں؟"

"کوئی سا لباس نہیں پہنتیں۔"

"تو یہی ہے وہ نعمت جس کی آپ بشارت دے رہے ہیں؟"

"بے شک۔"

"میرے دوست۔ ایک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"

بولا: "ہمدردی کا شکریہ لیکن وہ رقاصائیں ظالم ہیں ہی بڑی صبر آزما۔"

"مجھے آپ سے بھی زیادہ ان رقاصاؤں سے ہمدردی ہے۔"

"ارے تمہارا دل انسان ایمان شکنوں کے لیے بھی گداز ہونے لگا؟ بھلا کیوں؟"

"اس لیے کہ بے چاریاں زندگی کی دوڑ میں کپڑوں سمیت ناکام رہ گئیں تو کپڑے اُتار کر دوڑنے لگیں۔"

"ارے میاں، یہ کپڑے اُتارنا نہیں، محبوس جسم کو آزاد کرنا ہے۔ تم آزاد حُسن کو ناکام کہتے ہو؟ حیف!"

ہم نے بھی ذرا فلاسفی جھاڑی اور کہا:

"کرنل، تمہارے اندر ایک حریص مرد بول رہا ہے ورنہ عریانی حُسن کا آخری داؤ ہے۔ حسین عورت نے اپنے حُسن کی نمائش کے لیے برہنگی کا سہارا لیا، اس نے گویا اپنا آخری داؤ لگا دیا۔"

بولا: "ارے میں بھول رہا تھا۔ تم تو برقع فلاسفی کے قائل ہو۔"

"نہیں جناب۔ بُرقع ہم بھی ترک کر چکے ہیں۔ ہم شلوار قمیض فلاسفی کے قائل ہیں۔ خدا ہر دو کو استقامت بخشے۔"

"بڑی دل سے دُعا نکل رہی ہے۔"

"اس لیے کہ ہماری شلوار اور قمیض بھی کچھ دنوں سے مائلِ اختصار ہی ہیں۔"(۱۸)

کرنل محمد خاں کے سفرنامے "بجنگ آمد" اور "بسلامت روی" اردو ادب میں عمدہ اضافہ ہیں۔ ان کو پڑھ کر قاری جہاں کہیں بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہوتا ہے وہاں ایک سوچ کی لہر بھی اس کے ذہن میں در آتی ہے اگرچہ ان کا غالب رنگ مزاح نگار کا ہی بنتا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کے ہاں مختلف ممالک کے معاشرتی اور تہذیبی رویوں کو بغور دیکھنے اور ان پر غور کرنے کا انداز ملتا ہے۔ جہاں ان کے سفرناموں میں بے ساختہ مزاح اور بات سے بات پیدا کرنے کا انداز ملتا ہے وہاں کہیں کہیں معاشرے کی ناہمواریوں کو نشانہ بنانے کا رنگ بھی موجود ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو حظ و مسرت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

کرنل محمد خاں کے ہاں شوخی اور بے باکی پائی جاتی ہے یہی شوخی اور بے باکی انہیں دوسرے سفرنامہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔اسی شوخی اور بے باکی سے قاری حظ اور لطف حاصل کرتا ہے۔انہوں نے اپنے سفرناموں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے جنس نگاری کا سہارا بھی لیا ہے۔کرنل محمد خاں کے ہاں جنس نگاری کے مختلف انداز ملتے ہیں لیکن ان میں غالب رجحان مزاح اور جنس کے امتزاجی رنگ کا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کہیں کہیں کسی ملک کی معاشرت کو پیش کرنے کے لیے بھی جنس کے ہتھیار سے کام لیا ہے اور کہیں تہذیبی موازنے کی فضا پیدا کر کے جنس کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے کہیں کہیں اپنے ذاتی واقعات کو دلچسپ بنانے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے اور اس طرح کہیں کہیں ان کے سفرنامے آپ بیتی کے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں کیونکہ بعض مقامات پر صرف سفرنامہ نگاری کی ذات کے قصے ہی ملتے ہیں اور سفر کہیں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔بہر حال کرنل محمد خاں نے اُردو سفرناموں میں طنز و مزاح شوخی و شگفتگی کا رنگ بھر کر اس صنف ادب کو باغ و بہار بنا دیا ہے جس پر اُردو سفرنامہ بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔

☆☆☆

شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن ۱۹۲۰ء میں کلانور (بھارتی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کی اور ایڈن برا (انگلستان) سے ڈی۔پی۔ایچ کی ڈگری لی۔آرمی میڈیکل کور میں ملازم ہوئے۔جہاں سے میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔۲۰۰۰ء میں وفات پائی۔(۱۹)

شفیق الرحمٰن نے نہ صرف فکاہیہ ادب تخلیق کیا بلکہ انہوں نے سنجیدہ افسانے بھی لکھے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے ایک انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔یہاں ہم اُن کے سفرنامے "دجلہ" کا جنس نگاری کے حوالے سے جائزہ لیں گے۔

بیسوی صدی عیسوی میں بہت سے سفرنامہ نگار ہمارے ادبی منظر پر نمایاں ہوئے۔ان میں ابن انشاء، بیگم اختر ریاض الدین، کرنل محمد خاں، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، اختر ممونکا، شوکت علی شاہ، اسلم کمال اور دوسرے بہت سے ادیب شامل ہیں۔انہوں نے بہت شگفتہ سفرنامے لکھے اور ان کے سفرناموں میں نہ صرف خارجی بلکہ داخلی سفر بھی جذبات و احساسات کی صورت میں نظر آتا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنے شگفتہ اسلوب کی مدد سے اس صنف کے فروغ اور ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس حوالے سے ایک بہت اہم نام شفیق الرحمٰن کا ہے۔جنھوں نے اپنے سفرنامے "دجلہ" کے ذریعے جہاں اس صنف میں دلکش اور موثر اسلوب کا اظہار کیا ہے وہاں اپنے مشاہدات اور

تجربات کی بدولت ''دجلہ'' کو اُردو ادب کا ایک منفرد اور رجحان ساز سفرنامہ بھی بنا دیا ہے۔ ''دجلہ'' اگرچہ ایک سفرنامے کی حیثیت سے معروف ہے لیکن اپنی شگفتگی، اسلوب کی دلآویزی اور افسانوی طرزِ احساس کی بدولت اُردو ادب میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔

شفیق الرحمٰن کا سفرنامہ ''دجلہ'' جو مصر، جرمنی اور عراق کے سفر کی رُوداد ہے، اپنی شگفتہ بیانی اور فکر انگیزی کے باعث اُردو سفرنامے کی تاریخ میں اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت رکھتا ہے۔ اس سفرنامے میں انہوں نے مختلف کرداروں کے ذریعے جہاں اپنے سفر کے نقوش کو اجاگر کیا ہے اور سفرنامے کو ایک افسانوی رنگ دیا ہے وہاں انہوں نے دریائے دجلہ کے کنارے عروج و زوال سے گزرنے والی تہذیبوں کی کہانی کو بھی بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس سفرنامے میں اُنہوں نے اپنے مخصوص شگفتہ اور طنزیہ اسلوب میں مختلف تاریخی حقائق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ کسی بھی مرحلے پر قارئین کو گرانی اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ شفیق الرحمٰن نے اپنے اسلوب اور لطافت کی وجہ سے قارئین کو مسحور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بعض ناقدین کے خیال میں ان کی تحریروں میں لطیفوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اگرچہ لطیفوں کی اس کثرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے بیان کیے ہوئے بیشتر لطیفوں کے پس پردہ ہمدردی، محبت اور زندگی کے دوسرے خوبصورت رنگ چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے لطیفے بھی اپنی شائستگی کی بنا پر اُردو کے نثری ادب میں ایک اہم اضافہ سمجھے جاتے ہیں۔

شفیق الرحمٰن کا سفرنامہ ''دجلہ'' اپنے شگفتہ اسلوب اور منفرد زاویہ نظر کے باعث جدید سفرنامے کے تناظر میں خاص اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے اس سفرنامے میں زیادہ تر الفاظ اور دلچسپ واقعات کے بیان سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ سفرنامہ نگار نے کہیں کہیں مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے۔ سفر کے دوران میں جہاں وہ مختلف خوبصورت مناظر کی جستجو میں رہتے ہیں وہاں مختلف شگفتہ، دلچسپ اور رومانوی واقعات بھی تلاش کرتے رہتے ہیں اور ان کی مدد سے اپنی تحریر کو موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف واقعات کو شعوری طور پر افسانوی پیراہن میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں بھی انہوں نے جنس کے ہتھیار سے بخوبی کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں افسانوی انداز میں جنس نگاری کے نمونے پائے جاتے ہیں:

''اچھا، بتاؤ اگر اتفاق سے میری انگوٹھی یا چوڑی دریا میں گر جائے تو کیا کرو گے؟''

''کل صبح کسی غوطہ خور کا انتظام کرا دوں گا۔'' دلبر نے جواب دیا۔

''میرا دوست بہترین تیراک ہے۔ یہ شرما رہا ہے۔ آپ پھینکیے تو سہی،

ابھی کود جائے گا۔''

''میں نے کہا۔ اس پر دلبر نے زور سے چٹکی لی اور کان میں آہستہ سے بولا۔ ''خدا کے لیے تم چپ رہو۔''

''اگر میں نو عمر ہوتی تو چوڑی وغیرہ گرے بغیر فقط میرے کہنے پر تم فوراً کود جاتے۔ جب میں سوسائٹی میں داخل ہوئی تو تہلکہ مچ گیا تھا۔ کتنی ہی دفعہ میرے سینڈل سے شیمپین پی گئی۔''

یورپ میں یہ فقرہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ مانا کہ جراب پہن رکھی ہوگی۔ سینڈل بھی صاف ہوگا لیکن اس سے شیمپین وہی پی سکتا ہے جو ایک دو بوتلیں پہلے چڑھا چکا ہو۔''[40]

''لڑکیوں کے معاملے میں بھی ڈوڈو بالکل نکما تھا۔ ایک دفعہ سڑک پر جاتی ہوئی یہودن نے اسے متوجہ کرنے کے لیے پہلے اشارے کیے، پھر مجبوراً اپنا رومال گرا دیا۔ ڈوڈو نے (جسے زکام تھا) رومال اٹھایا۔ اس میں چھینک ماری اور ناک پر پھیر کر رومال یہودن کو بڑی حفاظت سے واپس لوٹا دیا۔ اسی طرح ایک نرس جو نہایت مختصر عرصے کے لیے ڈوڈو کی منگیتر رہی، اسے کھینچ کھانچ کر انگوٹھی کے سلسلے میں ایک جوہری کی دکان پر لے گئی۔ دیر تک انگوٹھیوں کا معائنہ ہوتا رہا۔ آخر ایک انگوٹھی نرس کو بہت اچھی لگی۔

''واقعی یہ تمہیں پسند ہے؟'' ڈوڈو نے پوچھا۔

''ہاں!'' نرس خوش ہو کر بولی۔

ڈوڈو نے انگوٹھی خریدی۔ پھر بڑے اطمینان سے اپنی انگلی میں پہن لی؟

دکان سے باہر نکلتے ہوئے وہ آگے آگے تھا اور نرس پیچھے پیچھے۔ جر جیس پل پر کھڑی ہوئی لڑکیوں پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ''یہ حسین ہے مگر فربہ ہے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ عینک بہت موٹے فریم کی لگا رکھی ہے۔ اور اسے ضرور احساس کمتری ہوگا جو اس قدر اونچی ایڑی کے جوتے پہننے پڑے اور اتنا میک اپ تھوپنا پڑا۔ مگر وہ جو مٹک مٹک کر چل رہی ہے واللہ خوب ہے۔''

''جر جیس یوں دور دور سے دل خوش کرنا بے کار ہے۔ سب سے اچھی وہ ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ چلے۔'' منصور بولا۔''[41]

''اب سٹیمر واپس آ رہا تھا اور دلبر بار بار ایک سنہرے بالوں والی حسینہ کو

سام کے کھانے پر مدعو کر رہا تھا۔ ہر دفعہ وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ میں نے ٹوکا کہ رہنے دو، ضد کیوں کرتے ہو۔

"تم نہیں جانتے، شاید یہ ہنگری کی ہو۔ وہاں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں سر ہلایا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے "ہاں" اور یونانی زبان میں لفظ NAI سے مراد ہے۔ جی ہاں۔"

سٹیمز کا تو دلبر نے ایک ایک لڑکی کی انگلیاں چومیں۔ انہیں جھک کر سلام کیا۔ وی آنا پہنچے تو اس نے بتایا۔ "ان لڑکیوں کو کیز انو وا بار میں مدعو کیا تھا۔" یورپ میں جہاں کہیں اوٹ پٹانگ حرکتیں ہونے کا امکان ہوں۔ مثلاً قمار خانے، مے خانے، وہ ناچ گھر جہاں ترقی پسند رقص ہوتے ہوں۔ الغرض جہاں بھی خرمستیاں ہو سکتی ہوں اس جگہ کو غریب کیز انووا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بد اچھا بد نام بُرا۔" (۴۴)

شفیق الرحمٰن کا سفرنامہ "دجلہ" عام سفرنامے کے اس چال چلن سے ہٹ کر ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ اس میں غیر ملکی مناظر اور افراد کو نئے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے اپنے مخصوص اسلوب کے تحت اپنے آزمودہ ہتھیاروں یعنی کرداروں سے مقدور بھر کام لیا ہے۔ ان میں شیطان، حکومت آپا اور مقصود گھوڑے کے کردار خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سفرنامے میں "دھند" کو مخصوص انداز کا رومان بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے دل کی بات کرداروں کے منہ سے نکلواتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی خوبصورت چہرہ نظر آتا ہے تو وہاں بھی وہ کردار کے منہ میں اپنی زبان ڈال دیتے ہیں۔ دراصل شفیق الرحمٰن کا سفرنامہ "دجلہ" زبان اور رویے کے اعتبار سے رومانوی اسلوب کا نمائندہ ہے۔ شاید اسی لیے اس کے اندر دلچسپی کا عنصر بھی موجود ہے۔ یہ رومانوی طرز شفیق الرحمٰن کی بیشتر تحریروں میں نمایاں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا سفرنامہ "دجلہ" بھی افسانوی طرز تحریر کے مزاج کے قریب ہے۔ شفیق الرحمٰن کی تحریر میں ان مسرتوں کا اظہار بھی ملتا ہے جن کی تکمیل شاید ان کی حقیقی زندگی میں ممکن نہ ہو سکی ہو۔ اس طرح ان کے ہاں ناآسودگی کا رنگ بھی ملتا ہے۔ ان کے کردار محبت کے متلاشی ہیں مگر اپنی کیفیت کو محبوب پر ظاہر کرنے میں اس روایتی جھجک کا شکار رہتے ہیں جو مشرقی معاشرے کا خاصہ ہے۔

ان کے سفرناموں میں افسانوی انداز میں جنس نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے کرداروں کے ذریعے مزاح بھی پیدا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے ہاں جنس کے

ذریعے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے مخصوص کردار اپنی جملہ ہیت کذائیوں کے ساتھ اپنی مسکراہٹوں اور لطافتوں سے آسودگی کی ایک خاص فضا تخلیق کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ بہر حال انہوں نے اپنے کرداروں کی گفتگو کے ذریعے بھی جنس نگاری کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"ہم اندر گئے۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ان کے لباس بڑے دلچسپ تھے۔ نیلی پتلونیں، لمبے فراک، چھوٹی نیکریں۔ کسی کی دو چوٹیاں تھیں تو کسی کے بال چھوٹے تھے جیسے کوئی مرد ابھی حجامت کرا کر آیا ہو۔ کسی نے بالوں کا مور چھل بنا کر دُم سی لٹکا رکھی تھی اور کسی نے بالوں کا اتنا بڑا گنبد پہن رکھا تھا کہ چہرہ بالکل چھوٹا سا محسوس ہوتا جیسے کوئی پرندہ گھونسلے سے جھانک رہا ہو۔

"انتظار کس چیز کا ہے۔۔۔؟" اہیمل نے آدھ گھنٹے کے بعد پوچھا۔

"بڑا اچھا سوال ہے۔ تم تینوں کو کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں ایک بُت طناز کا منتظر ہوں۔" دلبر نے جواب دیا۔

ایک لڑکی پیانو بجانے لگی۔ اس کے گلے میں چمکیلا لاکٹ جھوم رہا تھا۔ سنہری زلفیں نیلے رُومال میں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک پہلوان نما آدمی وائلن بجانے لگا اور لوگ ناچنے لگے۔

"محمد تم ناچتے کیوں نہیں؟"

"خاک ناچوں۔ پتہ نہیں یہ کس قسم کا رقص ہے اور کس طرح کی موسیقی ہے"؟

"ہماری موسیقی نہیں سُنی؟ ٹھیٹھ مغربی دُھنیں بھی ہیں، بلقان کی بھی بحیرۂ روم اور ایشیا کی تانیں بھی سنائی دیتی ہیں اور یہ جو ناچ رہی ہیں یہ کیسی ہیں؟" پتہ نہیں کچھ عجیب سا ہجوم ہے کسی کے بال سیاہ ہیں کسی کے سُرخ کسی کے سنہری۔ اسی طرح آنکھیں بھوری ہیں، نیلی، سبز اور سیاہ ہیں۔ نہ خدوخال ملتے ہیں نہ قد۔ دو لڑکیاں ایک دوسری سے نہیں ملتیں۔۔۔ دلبر نے انگور کی شراب کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پیار کھا ہوا تھا۔ لڑکے لڑکیاں تسلے کے تسلے چڑھا رہے تھے۔ آخر انتظار ختم ہوا اور جوبانہ آئی۔ چھوٹے قد کی موٹی تازی خاتون، بڑی تیز طرار۔ اسے دیکھتے ہی دلبر نے بھاگ کر اس کا ہاتھ چوما اور ہم سے تعارف کرایا۔

"اسے انگریزی نہیں آتی، ترجمہ کرنا پڑے گا۔ تم سب جلدی سے اس کا ہاتھ چوم لو۔"

مجھے تو ہاتھ چومنے سے کوئی دلچسپی نہیں ——— ''ہیمل بولا۔

''اچھا ہونٹوں تک مت لے جانا۔ یونہی ٹھوڑی سے چھُو لینا۔''

''بہتر ہوگا کہ یہ اپنا ہاتھ چوم لے اور میں اپنا ہاتھ۔''

''ضد مت کرو، یہ بڑی غصیلی ہے'' دلبر نے درخواست کی۔

''ہم تینوں نے اس کی انگلیاں ٹھوڑی سے چھُو کر چھوڑ دیں۔ وہ مسکرا کر ایک طرف جا بیٹھی۔ خاتون کا ہاتھ چومنا شوکری کی رسم ہے۔''(۲۳)

''وہ مائیکروفون کے سامنے آئی تو خوب تالیاں بجیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں گانا کم تھا اور مٹکنا اور تھرکنا زیادہ۔

مجیدہ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور لباس ضرورت سے زیادہ چست۔ بازو تھرکتے، گردن ہلتی، کمر مٹکتی، سارا جسم بَل کھاتا۔ اور کبھی کبھی نغمے کا کوئی چھوٹا سا مصرعہ بھی زبان پر آ جاتا۔

''کیا جذبات ہیں! ——— واللہ۔ کیا اظہار ہے۔!'' جرجیس جھوم جھوم جاتا۔

''کون سے جذبات؟ اور کون سا اظہار ہے ———!'' میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

''یہ دجلے کا رقص ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہو رہا ہے۔ واللہ!'' جرجیس نے جواب دیا گانا ختم ہوا تو خاموشی طاری ہوگئی۔ مجیدہ ہجوم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اب شاباش ملے گی۔ اُدھر سارا ہجوم ایک اور خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا جو مجیدہ سے کہیں تندرست و توانا تھی۔ جس نے اور بھی زیادہ پھنسا ہوا لباس پہن رکھا تھا۔ اور جو کسی موزوں کُرسی کی تلاش کے بہانے بالکل آہستہ آہستہ اِدھر سے اُدھر جا رہی تھی اور اُدھر سے اِدھر آ رہی تھی۔''(۲۴)

''میں نے اُسے کبھی غمگین نہیں دیکھا۔ اس کی وجاہت، گستاخ سی مسکراہٹ، اس کے حوصلے اور اُولوالعزمی سے سب متاثر ہوتے۔ کوئی اداس ہوتا تو کہتا۔

''مرد کو نیوٹرل گیئر میں رہنا چاہیے۔ کڑھنا، اپنے اوپر ترس کھانا ناکامیوں پر بہانے تراشنا بالکل بے سود ہے۔ زندگی میں بارہا شکست ہوگی۔ کئی مرتبہ ناحق ٹوکا جائے گا۔ بلا وجہ شبہ کیا جائے گا بغیر قصور سزا ملے گی جیسے کیرم کھیلتے وقت اصلی نشانہ کسی اور رُخ میں ہوتا ہے لیکن زد میں کوئی اور آتا ہے اور Tangent کسی اور طرف لگتی ہے۔ اسی طرح بغیر کچھ کیے مرد دوسروں کی زد میں کئی مرتبہ آتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر سوچ لینا چاہیے

کہ یُوں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور ہوا کرے گا۔ مرد کبھی ہراساں نہیں ہوتا اور کبھی ہار نہیں مانتا۔''میں نے اُن حسین لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن سے وہ بغداد میں ملا کرتا۔

''ہاں کئی ہیں۔'' وہ مسکرانے لگا۔

''کوئی منتخب کی؟''

''نہیں دیر تک کنوارا رہنے میں یہی خرابی ہے۔ جب شوخ و شنگ موسیقی سُنتا ہوں تو چنچل سلامہ یاد آتی ہے۔ جس کی موجودگی راگ رنگ کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے پھیکی خیالی سی سہ پہر کو خون کے مجسمے کیتھرین سے ملنے کو جی چاہتا ہے جو خنک و بے کیف فضا پر یُوں چھا جاتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں۔ بذلہ سنجی میں گل رُخ کا کوئی جواب نہیں۔ جب محض خرافات بکنی ہو تو روز لین جیسا رفیق ملنا محال ہے۔ غضب کی پھکڑ اور واہی تباہی ہانکنے میں بے مثال ہے۔ زندگی کے اداس لمحوں میں جی چاہتا ہے کہ پَر لگا کر رفعت کے پاس پہنچ جاؤں۔ دل جوئی کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ بہت سے منصوبے باندھ لیے ہوں یا اپنے متعلق غلط فہمی ہونے لگی ہو تو زہرہ کی تمکنت اور حسن بے پناہ کے سامنے سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے ——— ستمبر کی رات تھی۔ ہم رقص گاہ میں موسیقی سن رہے تھے۔ ایک لڑکی قریب سے گزری۔ جرجیس نے اُسے ٹھہرا لیا اور پوچھا۔'' معاف کیجیے آپ کی میز پر ایک خوبصورت سی لڑکی ہے وہ کون ہے؟''

''میں ہوں ——— ''جواب ملا۔

''مگر اس کے رُخسار پر تو تِل تھا۔''

''سُرمے کا تِل تھا۔ رومال سے اُتر گیا ہوگا۔ فرمائیے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ شاید ملا بھی ہوں۔''

''آپ نے پتہ نہیں کیا کیا دیکھا ہوگا۔ ویسے میں آج پہلی مرتبہ بغداد آئی ہوں۔''

''لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ——— ''

''اب آپ فرمائیں گے کہ میری شکل جانی پہچانی سی ہے۔ میں آپ کو خوابوں میں نظر آتی ہوں یا آپ کو مدت سے میرا انتظار رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ——— ''وہ آناً فاناً غائب ہوگئی۔ جرجیس بہت خفا ہوا'' میں نے دیکھا کسی اور کو تھا لیکن یہ خواہ مخواہ

ڈانٹ گئی۔ اب اس پر باقاعدہ عاشق ہو کر نہ دکھایا تو جرجیس نام نہیں۔" وہی لڑکی پھر سامنے سے بالکل تیر کی طرح گزر گئی اور جرجیس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ کچھ دیر تلملا تا رہا۔ پھر سیدھا اُن لڑکیوں کے جھنڈ پر بیل کی طرح حملہ آور ہوا لیکن فوراً واپس آ گیا۔

"رقص کے لیے کہا تھا لیکن نہیں مانی۔"

جب آرکیسٹرا نئی دھن شروع کرتا تو جرجیس تیزی سے اس طرف جاتا اور انکار کرا کے واپس آ جاتا۔ ایک دفعہ جو گیا تو سرپٹ واپس آیا۔" وہ کہتی ہے کہ یہاں اتنے لڑکے موجود ہیں جو تم سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ بھلا تم میں کون سی ایسی خوبی ہے جس پر اترا رہے ہو؟ اللہ کوئی منہ توڑ جواب سوچیے تا کہ اسے خاموش کرا سکوں۔" (۲۵)

شفیق الرحمن کے سفرنامے "دجلہ" میں ہمیں تجربات کی وسعت، مشاہدے کی گہرائی اور حقیقت کے ادراک کی ایسی فضا نظر آتی ہے جو موضوع کے اعتبار سے گمبھیر نہیں بلکہ لطیف اور شگفتہ ہے۔ ان کی بصیرت میں شگفتگی اور طنز میں شائستگی ہے اور دونوں کے امتزاج نے "دجلہ" میں شفیق الرحمن کے اسلوب کو دلکش اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ انہوں نے صورتِ واقعہ سے بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کرداروں کی گفتگو بھی سفرنامے میں چار چاند لگا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جس جگہ بھی گئے انہوں نے وہاں کی تہذیب و معاشرت اور ماحول کو اپنے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے نائٹ کلبوں اور جوئے خانوں کا ذکر بڑی بے باکی سے کیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے بھی ملتے ہیں جن کے ذریعے انہوں نے وہاں کی تہذیب و معاشرت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ایسے مناظر کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے جزئیات نگاری سے بھی کام لیا ہے خصوصاً خواتین کا ذکر انہوں نے بعض مقامات پر علامتی انداز یا تشبیہ و استعارہ کے پردے میں کیا ہے۔ اس طرح باذوق قاری اس سے زیادہ حظ اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں اُن کے ہاں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے پائے جاتے ہیں:

"لیکن ہم زبردستی اُسے لے گئے۔ ہوٹل میں پہلے ایک موسیو نے ہمیں آداب پر مختصر سا لیکچر دیا اور بتایا کہ گھڑی، بٹوہ، پاسپورٹ اور نقدی ہوٹل میں رکھوا دینا۔ دو تین سو فرانک سے زیادہ مت لے جانا۔ ٹائی کی جگہ گلے میں رنگین رومال باندھ کر سگریٹ منہ میں دبا کر اندر داخل ہونا۔ وہاں خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو کسی کی طرف مت دیکھنا۔ کوئی لڑکی تنہا بیٹھی ہو تو اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنا اور رقص شروع کر دینا۔ بیس پچیس منٹ خیریت سے گزر جائیں تو ایک طرف بیٹھ جانا لیکن خبردار جو کسی سے

کوئی سوال پوچھا۔

ٹیکسی والے نے ہمیں اندھیری سی گلی میں اُتار کر ایک طرف اشارہ کیا اور غائب ہو گیا۔ وہاں ایک زینہ تھا جو نیچے کسی تہ خانے میں جاتا تھا۔ دیا سلائی جلا کر ہم سیڑھیاں اُترنے لگے۔ سازوں کی گھٹی گھٹی صدائیں آ رہی تھیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا، چھوٹی سی کھڑکی کھلی، ایک چہرہ جھانکنے لگا۔ مجد ہی نے فوراً سگریٹ کا لمبا کش لگا کر سارا دھواں کھڑکی پر چھوڑ دیا۔ دروازہ کھل گیا اور ایک سُرخ ہونٹوں اور لمبے بالوں والے مرد نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر جاتے ہوئے غور سے دیکھا تو یہ مرد لڑکی نکلا۔ اندر رقص ہو رہا تھا۔ مدھم سی روشنی تھی اور دھواں ہی دھواں۔ موسیقی بے حد ہیجان خیز تھی۔ مرد، عورتیں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ناچ رہے تھے۔ کئی تو ایک دوسرے کا سہارا لیے تقریباً سو رہے تھے۔ نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ایک اونگھتی ہوئی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور دلبر کے اوپر ڈال دیا۔ دلبر ناچنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجد فوراً ہی کہیں غائب ہو گیا اور تلاش کرنے پر بھی نہیں ملا۔ چہروں کی طرف دیکھنے کی ممانعت تھی۔ اس لیے نظریں نیچی کر کے پارٹنر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ رنگین لباس والی حسینہ کوئی ڈاڑھی والا آرٹسٹ نکلا۔ دُور ایک سگریٹ پیتی ہوئی لڑکی کی پُشت نظر آ رہی تھی، اُسے زبردستی پکڑ کر رقص شروع کیا۔ ایک جگہ سگریٹ کا دھواں ذرا کم تھا، وہاں اس کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے نے کم از کم پچاس خزائیں دیکھی ہوں گی۔ اس پر کوئی آرٹسٹ خاصا وقت صرف کر چکا تھا۔ مصنوعی بھویں، مصنوعی پلکیں، مصنوعی تل، اصل خدوخال ندارد تھے۔

آدھ گھنٹہ خیریت سے گزر چکا تو ہم نے حاضرین کا جائزہ لیا۔ ہر شخص کا لباس نرالا تھا۔ جن مردوں کی باقاعدہ ڈاڑھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہفتے سے حجامت نہیں کرائی تھی۔ شکرے کی سی آنکھیں، کلائیوں پر پٹیاں بندھی ہوئیں، شوخ رنگ کی قمیصیں۔ عورتوں کے لباس بے حد چُست تھے۔ جیسے پارسل مضبوطی سے پیک کیے ہوئے ہوں۔ بکھری زلفیں، خوابیدہ نگاہیں اور تیز خوشبو کی لپٹیں۔" (۲۶)

"ہمارے سامنے پینتالیس پچاس سال کی تندرست و توانا عورت بیٹھی مُسکرا رہی تھی۔ رنگے ہوئے بال، گلے میں ہیروں کا بیش قیمت ہار، ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس، گلابی چہرے سے جیسے خُون ٹپک رہا تھا۔

''کھیل نہیں رہے ____؟'' اس نے دلبر سے پوچھا۔
''نہیں ____''
''کھیلو گے ____؟''
''ابھی نہیں ____''
''اچھا تو پھر میری طرف سے کچھ شلنگ کسی رنگ پر لگا دو ____''
دلبر نے انکار کیا۔ وہ بڑے ملائم لہجے میں بولی ____
''میں وہمی ہوں اور شگونوں کی معتقد ہوں، تبھی تم سے کہہ رہی ہوں۔ بس کوئی سا رنگ چن کر ٹکیاں اس پر رکھ دو ____''
اس نے گول ٹکیاں دلبر کے ہاتھ میں تھما دیں۔
سبز آنکھیں، سیاہ بال، سرخ ہونٹ، زرد لباس، سفید ہیرے۔ ان سب رنگوں میں سرخی نمایاں تھی۔
''جاؤ ٹکیاں سرخ رنگ پر لگا دو'' میں نے دلبر کے کان میں کہا۔
سرخ رنگ آیا اور ساڑھے تین سو شلنگ دگنے ہو گئے۔
''ایک دفعہ اور ____'' اس نے اصرار کیا۔ پھر سرخ رنگ چنا اور پھر جیت ہوئی۔

دلبر نے سب کچھ سمیٹ کر اس کے سامنے رکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔
''بس ایک دفعہ اور۔ آخری مرتبہ۔ بے شک رنگ بدل لو''
دلبر نے ڈھیر میں سے تین چوتھائی کے قریب ٹکیاں اٹھائیں۔ سبز رنگ پر لگا کر فوراً ہار کر واپس آ گیا بقیہ ٹکیاں گنی گئیں، حساب تقریباً برابر رہا تھا۔
''جوئے سے بہت ڈرتے ہو ____'' وہ ہنسنے لگی۔ سامنے پانچ چھ خالی کیے ہوئے گلاس رکھے تھے، راکھ دانی سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔
بیرا بل لایا۔ اس نے بیگ سے سفری چیکوں کا بنڈل نکالا اور دس پاؤنڈ کا چیک تھالی میں رکھ دیا۔
وہ واپس آ گیا ''شلنگ دیجیے ہمیں سفری چیک لینے کی اجازت نہیں ہے۔''
میں نے مشورہ دیا کہ ٹکیاں واپس کر کے شلنگ لے لو، لیکن وہ ضد کرنے لگی۔ بیرا منیجر کو لے آیا۔

''یہ پاؤنڈ ہیں اور یہاں کی کرنسی سے کہیں بہتر ہیں ____'' وہ بولی
''مگر چیک صرف بینک والے ہی لے سکتے ہیں ____'' منیجر نے سمجھایا۔
اس نے منیجر کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مجد ہی کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ سارا ہجوم دلبر کو اور مجھے بُری طرح گھور رہا تھا۔ جوا بند ہو گیا اور سب میز کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔'' (۲۷)

شفیق الرحمٰن کے سفرنامے ''دجلہ'' میں کہیں کہیں مسکراہٹوں کے عقب سے دردمندی اور دل سوزی بھی اپنا جلوہ دکھاتی نظر آتی ہے لیکن اس کا تاثر اتنا گہرا نہیں کہ جلد زائل نہ ہو سکے۔ سفرنامہ نگار اگلے ہی لمحے اُداسی کے اس ماحول سے نہ صرف خود نکل آتا ہے بلکہ قاری کو بھی اس ماحول سے باہر نکال لیتا ہے اور ایسے تفریحی مقامات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے خصوصاً مغربی معاشرے کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ ان معاشروں میں جو محرومیوں کا احساس ہے۔ بلکہ ان ناآسودگیوں اور حسرتوں کا کھلا اظہار ان کے ہاں ملتا ہے جن کا سامنا خصوصاً مشرقی اقدار رکھنے والے انسان کو اپنی زندگی میں وہاں کرنا پڑتا ہے۔ شفیق الرحمٰن کی تحریروں کا ماحول اگرچہ بڑی حد تک مغربی ہے مگر ان کے کرداروں کی نفسیات خالصتاً مشرقی ہے۔ ان کرداروں کی نفسیات بھی دراصل سفرنامہ نگار کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے چونکہ وہ خود ایک دیسی ریاست کے باشندے ہیں اور انہیں ان معاشروں میں کھل کھیلنے کا رویہ پسند نہیں۔ انہوں نے مغربی معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی بھی کئی مقامات پر کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی نمونے ملتے ہیں۔ ایسی چیزوں کو بیان کرنے میں ان کا شوخ و شنگ اور شگفتہ اسلوب قارئین کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ انہوں نے جنس نگاری کا سہارا محض رنگ آمیزی کے لیے نہیں لیا بلکہ حقائق کو بیان کرنے کے لیے لیا ہے۔ اگرچہ اس سے سفرنامے کی مجموعی فضا بھی پُر لطف بن جاتی ہے اور اس سے قاری نہ صرف ان معاشروں کی خرابیوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے بلکہ حظ بھی اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے پائے جاتے ہیں:

''اپنے متعلق باتیں کہ آسٹریلیا سے دُنیا کی سیر پر نکلی ہے۔ اب تک اٹھارہ ملک دیکھے ہیں۔ آسٹریلیا میں جائیداد ہے اور بے شمار بھیڑیں جن کی اُون دساور کو بھیجی جاتی ہے۔ خاوند امریکہ میں ہے اور مکہ بازی کے مقابلوں کا مہتمم ہے۔'' وہ شرابی ہے، جواری ہے۔ ہالی وڈ کی ایکسٹرا لڑکیوں میں خاص دلچسپی لیتا ہے۔ کیونکہ مشہور فلم سٹارا سے قریب پھٹکنے نہیں دیتیں۔ مجھے اس پر ذرا بھروسہ نہیں، کبھی تو محسوس ہوتا ہے جیسے

اس سے محبت ہے اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ بڑا ہی ناقابل اعتماد شخص ہے۔ شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں لیکن وہ مجھے بالکل نہیں سمجھتا۔ کبھی اب تک میں اس کے ساتھ چار پانچ ہفتے سے زیادہ نہیں رہی۔ دراصل شادی میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آئے دن ایسے مرد ملتے رہتے ہیں جو اپنے خاوند سے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ اس کی تصویر دکھاؤں ——؟'' ایک قہقہے کے نیچے اس نے تصویریں دکھائیں۔ ''یہ میرا خاوند ہے ——''

''اور یہ شاید آپ کے لڑکپن کی تصویر ہے ——'' دوسری تصویر میں بیس بائیس برس کی حسین لڑکی مسکرا رہی تھی۔

''یہ میری لڑکی ہے ——''

''آج کل کہاں ہے ——؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں نہیں ہے ——'' اُس نے تصویر ہاتھ سے چھین لی۔

''لیکن آپ کی شادی کو تو فقط پانچ برس ہوئے ہیں۔''

''پہلے خاوند کی لڑکی ہے —— یہ رہا پہلا خاوند ——''

''اور یہ جو لمبی مونچھوں والا آپ کے ساتھ کھڑا ہے، یہ کون ہے ——؟''

''یہ اُس سے پہلا خاوند تھا۔'' اس نے جھنجھلا کر تصویریں بٹوے میں رکھ لیں۔''(۲۸)

''بوڑھا ہنسنے لگا۔ ''تمہیں اپنی محبوبہ سے ملاؤں۔'' اس نے اشارہ کیا۔ پختہ عمر کی ایک فربہ اندام عورت جھومتی جھامتی آئی۔ کسی زمانے میں بڑی حسین ہوگی۔ ہمارے کندھوں پر زور سے دھپ لگا کر چلی گئی۔ میں نے دلبر کو جھنجھوڑا کہ تم بھی بوڑھے سے کچھ کہو۔ ''تمہاری بیوی خوش مزاج معلوم ہوتی ہے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

''یہ بیوی نہیں، محبوبہ ہے۔ ہم مدتوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں، لیکن شادی نہیں کی۔''

۔۔۔ یہاں زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو شادی کے جھنجھٹ میں پھنسے بغیر اپنی مرضی سے مردوں کے ساتھ رہتی ہیں اور بہت خوش ہیں۔''(۲۹)

''دجلہ'' میں شفیق الرحمن نے لڑکیوں کے متعلق کرداروں کے ذریعے کہیں کہیں قصے بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف قصے ہی بیان کیے ہیں بلکہ لڑکیوں کی نفسیات پر بحث بھی کی ہے۔

اس نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بعض کردار لڑکیوں کی خوشامد اور ضرورت سے زیادہ مدح سرائی کرتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ نفسیاتی طور پر مرد تعدد پسند ہے اور وہ بھنورے کی طرح ہر پھول کا رس چوسنا چاہتا ہے۔ سفرنامہ نگار کا عورت کے متعلق یہ خیال بھی ہے کہ عورت سائے کی طرح ہوتی ہے۔ اگر اس کا تعاقب کرو گے تو آگے آگے بھاگے گی۔ اگر دور ہو گے تو پیچھے پیچھے آئے گی۔ اس سفرنامے میں عورت کی نفسیات کے متعلق بھی فلسفہ نظر آتا ہے۔ دنیا میں ہر جگہ لڑائی یا دولت کی وجہ سے ہوتی ہے یا پھر عورت کی وجہ سے۔ خواہ ترقی پسند معاشرے ہوں یا مہذب معاشرے ہر جگہ لوگ عورت کے لیے ہی لڑتے ہیں۔ بہر حال اس سفرنامے میں جنس نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں جیسے لڑکیوں کی نفسیات پر بحث کے دوران میں جنس نگاری کے نہ صرف تہذیبی اور حقیقی نمونے ملتے ہیں بلکہ جنس کے نفسیاتی پہلوؤں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''اس کا عقیدہ تھا کہ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرا دو کہ وہ بے حد حسین ہے۔ اس کے بعد وہ تمہارے بقیہ جھوٹ بھی سچ مان لے گی۔

لیکن ہم اسے اکثر ٹوکتے کہ وہ لڑکیوں سے ملتے ہی انہیں خفا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی تکنیک میں ضرور کوئی خرابی ہوگی۔ ۔ ۔ جرجیس پھر ہانکنے لگتا۔ ''کل سُوزی تمہارے مٹاپے پر فقرے کس رہی تھی۔ میں نے اُسے ڈانٹا اور سمجھایا کہ تم موٹی بالکل نہیں، فقط تمہارا وزن تمہارے قد سے مناسبت نہیں رکھتا۔ بھلا اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟'' —— ''خبردار! آئندہ مجھ سے دُور رہنا۔ تمہارے اور میرے خیالات بالکل مختلف ہیں۔''

''واقعی مختلف ہیں۔ آپ کو شاید لڑکوں میں دلچسپی نہ ہو لیکن اس خاکسار کو لڑکیاں بہت پسند ہیں۔''(۳۰)

''پھر مشورہ دیا کہ ''اگر ایک لڑکی کے لیے چند مرد آپس میں لڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر تین چار لڑکیاں ایک دوسری سے جل کر چار پانچ مردوں میں ناچاقی کرا دیں تو قصور مردوں کا ہے بعد میں یہی لڑکیاں آپس میں ملیں گی تو فوراً شیر و شکر ہو جائیں گی اور مرد بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ جائیں گے لہٰذا آئندہ لڑکیوں کے گروہ میں فالتو باتیں مت کیا کرو۔''(۳۱)

''یہ کیوں لڑ رہے ہیں؟'' دلبر پھر سوال پوچھ بیٹھا۔

''لڑائی یا تو دولت، جائیداد پر ہوتی ہے یا عورت پر۔ یہاں سب قلاش

ہیں اس لیے ایک حسینہ کے لیے لڑ رہے ہیں۔'' اور حسینہ بڑے مزے سے تماشا دیکھ رہی تھی بلکہ مسکرا رہی تھی۔ باقی لوگ اطمینان سے ناچ رہے تھے۔

''جنہیں مہذب کہا جاتا ہے وہ لوگ عورت کے لیے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں جلی کٹی باتیں، چٹکلیاں، گری ہوئی حرکتیں۔ سب کچھ دُور دُور سے کرتے ہیں لیکن مردُنگوں سے اس طرح فیصلہ کیا کرتے ہیں۔'' (۳۲)

''پروگرام بنا کہ دجلے میں کشتی کی سیر کی جائے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ بڑی سہانی رات تھی۔ لولیتا ایک نئی لڑکی کو لائی اور مجھ سے کہا۔'' ہم دونوں آپ کی کشتی میں چلیں گی۔'' منصور نے بتایا کہ یہ گلنار ہے، سعدہ کی چھوٹی بہن۔ ابھی ابھی ایران سے آئی ہے۔'' اور یہ التفات اس لیے ہے۔'' وہ میرے کان میں بولا'' کہ ساری شام تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لڑکیوں کے بھی عجیب موڈ ہوتے ہیں۔ آج خوشامد چاہتی ہیں تو کل بے رُخی پر ریجھ جائیں گی۔'' (۳۳)

شفیق الرحمٰن کو خصوصاً بغداد کے نسوانی حسن نے متاثر کیا وہ ابن جبیر کو بھی اس سلسلے میں اپنا ہمنوا سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''بغداد سے کئی سیاح گزرے۔ بارہویں صدی میں ابن جبیر آیا تو اسے گردونواح میں جگہ جگہ نہریں اور پل ملے مگر بغداد میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ باشندے بھی خشک سے لگے لیکن وہ نسوانی حُسن سے بہت متاثر ہوا اس نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے —— ''بغداد میں حُسن کی وہ فراوانی ہے کہ خوف خدا نہ ہو تو انسان فوراً غلط راستے پر پڑ سکتا ہے۔'' (۳۴)

''دجلہ'' میں شفیق الرحمٰن کے ہاں مشرق اور مغرب کے موازنے کی فضا بھی ملتی ہے۔ وہ جب غیر ملکی لڑکیوں سے ملتے ہیں تو اُن سے گفتگو کے دوران میں اپنے خطے کے رومانی گیتوں پر بھی تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی محبوب کا بھی موازنہ ان کے ہاں ملتا ہے۔ جھوٹے محبوب ،مشرقی لڑکی اور ہرجائی کے کردار پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس موازنے کی فضا سے علمی بحث یا اعلیٰ حقائق کو بیان کرنے کے لیے انہوں نے جنس کا سہارا لیا ہے۔ اسے ہم جنس نگاری کی عمومی سطح ہرگز نہیں قرار دے سکتے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے جس میں وہ مشرقی ،مغربی، جنوبی اور ایشیائی لڑکی سے ہٹ کر محبوب کے بارے میں یہ خیال پیش کرتے ہیں:

''یہ مشرقی لڑکی کیا ہوتی ہے؟ مشرق، ایشیائی، جنوبی ،مغربی وغیرہ کی

اضافت محض دُم چھلا ہے۔ لڑکی ہر جگہ لڑکی ہوتی ہے اور محبوب محبوب ہوتا ہے ہرجائی ہو یا کچھ اور۔'' منصور نے جواب دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر تل والی کے نازک ہونٹ ہلے۔'' (۳۵)

شفیق الرحمٰن کا سفر نامہ ''دجلہ'' الگ نوعیت کا حامل ہے۔ اس سفرنامے میں رومانویت کا عنصر غالب ہے۔ اس میں شفیق الرحمٰن کے کردار نوعمر ہیں۔ اسی لیے وہ کردار بھی نوجوان ہونے کے باعث رومانوی رویوں کے عکاس ہیں۔ اس سفرنامے میں طلسماتی ماحول کا عکس بھی ملتا ہے یعنی ایسی کیفیت اکثر مقامات پر ملتی ہے کہ جس کردار سے ہم اپنائیت کا احساس رکھتے ہیں اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں بھی ہم اپنی خواہشات کا عکس دیکھتے ہیں۔ اس کے رنج سے رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور اس کی مسرت سے کھل اٹھتے ہیں۔ اس طرح اس سفرنامے میں نفسیاتی کشمکش سے بھی بعض مقامات پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس سفرنامے میں جنس نگاری کے مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر شفیق الرحمٰن نے کسی منظر کے ذریعے اور کہیں کوئی واقعہ پیش کر کے تو کبھی کرداروں کی گفتگو اور ان کی مضحکہ خیز حرکات سے جنس نگاری کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔ انہوں نے ہر بات کو پردے میں بیان کیا ہے۔ بالکل کھلا ڈلا اور رنگ آمیزی والا اسلوب انہوں نے بہت کم اختیار کیا ہے۔ ان کے ہاں جو جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں وہ زیادہ تر خوبصورت ہیں ان میں کہیں کہیں تجسس کا عنصر بھی ملتا ہے بلکہ وہ نمونے ایسے نہیں ہیں کہ ان سے گھن آئے یا تعفن کا احساس ہو۔ کہیں کہیں سفرنامہ نگار نے مزاح پیدا کرنے کے لیے جنس سے کام لیا ہے۔ بعض مقامات پر انہوں نے مشرق اور مغرب کے موازنے سے نہ صرف مزاح پیدا کیا بلکہ جنس کے حوالے سے بھی مشرقی اور مغربی رویوں کا فرق واضح کیا ہے۔ کہیں کہیں انہوں نے جنس نگاری کے ذریعے اعلیٰ علمی و ادبی سطحیں دکھائی ہیں۔ یعنی جنس کو اعلیٰ حقائق تمثیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ شفیق الرحمٰن کے ہاں جنس نگاری زیادہ تر رومانویت کے پردے میں نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں رومانویت کے گہرے اور انمٹ نقوش ملتے ہیں۔ یہ رومانوی رنگ مزاحیہ اسلوب سے ہم آہنگ ہو کر ان کی تحریر کو ایسی خوبصورتی عطا کرتا ہے جو انفرادیت کی ضامن ہے۔ پھولوں، تتلیوں، خوبصورت چہروں، خوبصورت مناظر اور مہ رخوں کا ذکر اس سفرنامے میں ایک سحر انگیز رومانوی فضا پیدا کرتا ہے۔ شفیق الرحمٰن کے اس شگفتہ اور مسحور کن اسلوب سے قاری نہ صرف دوسرے ممالک کی سیر کرتا ہے بلکہ حظ بھی اٹھاتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شفیق الرحمٰن کے ہاں زندگی کے روشن اور مثبت پہلو غالب ہیں اور وہ مایوسی اور ناکامی کے اندھیروں میں بھی اُمید کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ہر مقام پر اپنی مثبت سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ ۱۹۳۹ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے ٹیکنیکل کالج نوٹنگم (NOTINGAM) انگلستان میں بھی زیر تعلیم رہے۔[۳۰] ان دنوں لاہور میں مقیم ہیں۔ روزنامہ ''Dawn'' لاہور/کراچی میں اتوار کے روز ان کا کالم شائع ہوتا ہے اور ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' میں بھی ''کارواں سرائے'' کے زیر عنوان کالم لکھتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اُردو کی بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ بیک وقت سفرنامہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار اور کالم نگار ہیں۔ یہاں ہم بطورِ خاص ان کے سفرناموں میں پائے جانے والے جنسی رجحان کا جائزہ لیں گے۔ انہوں نے جو سفرنامے تحریر کیے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نکلے تری تلاش میں
۲۔ اندلس میں اجنبی
۳۔ خانہ بدوش
۴۔ ہنزہ داستان
۵۔ سفر شمال کے
۶۔ چترال داستان
۷۔ کے ٹو کہانی
۸۔ پتلی پیکنگ کی
۹۔ شمشال بے مثال
۱۰۔ نیپال نگری
۱۱۔ کالاش
۱۲۔ سنولیک
۱۳۔ دیوسائی
۱۴۔ رتی گلی
۱۵۔ برفیلی بلندیاں
۱۶۔ یاک سرائے

۱۷۔ نانگا پربت
۱۸۔ سنہری اُلّو کا شہر

مستنصر حسین تارڑ کا شمار دورِ جدید کے اہم سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف سفرنامے بلکہ ناول اور ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ شاید اسی لیے ان کے سفرناموں میں بھی افسانوی رنگ غالب نظر آتا ہے اور ان کے بعض ناولوں میں سفرنامے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اُنہوں نے سفرنامے کی صنف کو بہت سی نئی جہات سے آشنا کیا۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات، معلومات اور تاریخ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ سفرنامے کی فضا بوجھل کیے بغیر قاری کو ان مقامات کی سیر کرا دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب ایسا ہے کہ وہ جن مقامات پر بھی گئے اور جن لوگوں نے ان کے دل کو متاثر کیا وہ قاری کے محسوسات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ آج سفرنامہ پڑھنے والوں کے سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف ہیں کیونکہ انہوں نے اپنا ہر سفرنامہ لوگوں کی نفسیات اور پسند کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا ہے۔ انہوں نے بارہ مصالحے کی چاٹ اور معلومات جس کے بارے میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جہاں بھی مستنصر گئے وہاں کے معلوماتی کتابچوں کی مدد سے افسانوی انداز میں وہ سب کچھ تحریر کر دیا جو قاری پڑھنا چاہتا ہے۔ ایک عام قاری جسے پڑھنے سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ چاہتا ہے کہ ہلکے پھلکے انداز میں سفرنامہ نگار اُسے بیرونِ ملک کی معلومات مہیا کر دے جو اس کے لیے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہوں۔ اس طرح وہ گھر بیٹھے سیر بھی کر لے اور جنس لطیف یا میموں کے حوالے سے چٹخارے دار باتوں سے حظ بھی اٹھا لے۔ مستنصر حسین تارڑ کی یہ خوبی ہے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے؟

مستنصر حسین تارڑ نے سفرنامے کو خارجی سے داخلی احساسات سے روشناس کیا۔ شاید اسی لیے ان کے سفرناموں میں ان کے عشق کی داستانیں بھی ملتی ہیں اور بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر سفرنامے میں اپنے تازہ عشق کو بیان کر رہے ہیں۔ اس طرح ان کے سفرنامے ان کی عشق کی داستانوں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ مختلف مقامات کی سیر کے دوران میں سفرنامے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے وہ خواتین کا ذکر خوب کرتے ہیں اور ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بعض اوقات وہ مقامات کی سیر کم اور خواتین کی سیر زیادہ کرواتے ہیں۔ مستنصر بعض مقامات پر سچوایشن کو اس قدر رومینٹسائز کر دیتے ہیں کہ سفرنامے کا گمان کہیں بہت دور دھندلکے میں رہ جاتا ہے اور پھر یوں لگتا ہے جیسے کسی افسانے کا مطالعہ شروع کر دیا گیا ہے۔ مستنصر کے قلم کی جولانیاں وہاں بطورِ خاص دیکھنے والی ہوتی ہیں جہاں انہیں کوئی کومل سا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ بعض اوقات انہیں خود پر قابو نہیں رہتا۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے اور سوچتے ہیں اُسے بلا جھجک صفحۂ قرطاس پر

منتقل کر دیتے ہیں یعنی بٹن اور بلاؤز کے اس کھیل میں وہ جھجک اور شرم کی اوٹ میں نہیں چھپتے اور نہ ہی منافقت کا دبیز یا مہین نقاب اپنے چہرے پر ڈالتے ہیں بلکہ وہ جس طرح اور جس شدت سے سوچتے ہیں اسی شدت سے اس کا برملا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ اگر مستنصر حسین تارڑ کسی مقام پر خواتین کو تاڑتے یا ہوس زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں تو اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں ان کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ اس سلسلے میں قاری کی ساری "ہمدردیاں" مستنصر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جنہیں پڑھ کر قاری یقیناً حظ اٹھاتا ہے اور بوریت سے دور رہتا ہے:

"میرے پیچھے دو امریکی لڑکیاں کھڑی تھیں جنہیں کسٹم آفیسر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان کی تلاشی تو درکنار اس نے ان کے پاسپورٹوں پر مہر لگانے کے بعد ان کو سیلوٹ بھی کیا۔ لڑکیاں خوش شکل تھیں اور ہسپانوی چاہے زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہو، قدرتی طور پر حسن پرست ہوتا ہے۔۔۔ گزشتہ شب سفر کا بیشتر وقت راہداری میں کھڑے ہو کر گزرا تھا، اس لیے اب نیند آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔ "دیکھیے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں؟" میں نے بمشکل اپنی نیند سے بھری آنکھیں کھولیں تو سامنے ہسپانوی آفیسر کی پسندیدہ امریکی لڑکیوں کو کھڑے پایا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں کھسک کر کھڑکی کے ساتھ لگ گیا اور وہ فوراً میرے برابر والی نشست پر براجمان ہو گئیں۔

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی پستہ قد اور قابلِ رشک صحت کی مالک لڑکی نیلے رنگ کی چست پتلون اور کالے سویٹر میں ملبوس تھی۔ سویٹر لمبائی میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے پتلون تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ وہ بار بار سویٹر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر سویٹر اور پتلون کے درمیانی فاصلے کو پُر کرنے کی کوشش کرتی مگر ہاتھ اُٹھاتے ہی جسم کے بالائی حصے کے کھچاؤ کی وجہ سے سویٹر سکڑ کر پھر اپنی پرانی حالت پر آ جاتا اور پتلون کی بیلٹ کے عین اوپر اس کا سفید پیٹ نظر آنے لگتا۔ دوسری لڑکی نے جس کا چہرہ قدرے لمبوترا تھا، اپنے کندھوں پر ایک کھیس نما شال اوڑھ رکھی تھی۔

"دراصل ہمیں ان ہسپانوی مزدوروں نے بے حد تنگ کر رکھا تھا" پستہ قد لڑکی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بلکہ۔۔۔" دوسری نے اپنے جسم کا ایک حصہ سہلاتے ہوئے منہ بنا لیا۔ "چٹکیاں بھی لیتے تھے۔" ڈبے کے ایک کونے میں چند جنس کھو نوجوان ہسپانوی مزدور کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ لڑکیوں کو میرے پاس

بیٹھے دیکھ کر انہوں نے خوب ہاؤ ہو مچائی۔

"ویسے ان کا قصور نہیں۔" پستہ قد لڑکی نے ہنس کر کہا۔ "موسم گرما میں لاکھوں سویڈش لڑکیاں ہسپانیہ میں وارد ہو جاتی ہیں اور ان کے مقاصد اتنے نیک نہیں ہوتے۔۔۔ ابھی صرف سات بجے تھے چنانچہ میں ریلوے سٹیشن کے ایک کونے میں سامان کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی میں اونگھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ امریکی لڑکیاں پھر وارد ہو گئیں۔ "اب آپ کو کون تنگ کر رہا ہے؟" میں نے وہیں لیٹے لیٹے دریافت کیا۔ "کوئی بھی نہیں!" پستہ قد لڑکی نے اپنا کالا سویٹر کھینچتے ہوئے ہنس کر کہا "ہم صرف یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ ہسپانوی کرنسی کہاں سے مل سکتی ہے؟"۔۔۔ کمبخت اصل ہسپانوی نہیں لگتا تھا کیونکہ میری ساتھی امریکی لڑکیوں نے نہ صرف اپنی مسکراہٹوں کا آزادانہ استعمال کیا بلکہ پستہ قد لڑکی نے اپنے برہنہ پیٹ کو سویٹر کھینچ کر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہم مایوس ہو کر باہر آنے کو تھے کہ میری نظر ڈائننگ روم میں بیٹھی دو انگریز بوڑھیوں پر پڑی جو چائے پینے میں مشغول تھیں۔ انگریز اس لیے کہ یورپ میں چائے پینے کا تردد صرف یہی قوم کرتی ہے۔ میں ڈائننگ روم کا دروازہ کھول کر ان کے پاس چلا گیا۔ نہایت رونی شکل بنا کر اپنی بپتا سنائی اور ان سے التجا کی کہ وہ ہوٹل میں مقیم گاہکوں کی حیثیت سے ہمیں کرنسی تبدیل کرانے میں مدد دیں۔

"درندے کہیں کے" ایک مائی نے چائے کی پیالی میز پر پٹخ دی۔

"ظالم ہسپانوی" دوسری مائی بسکٹ کھاتے ہوئے اپنا پوپلا منہ چلانا بھول گئی اور دونوں فوراً اٹھ کر میرے ساتھ کاؤنٹر پر چلی آئیں۔" (۳۷)

"جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو ہماری جیبیں پتیوں کے بوجھ سے اور ہمارے پیٹ چائے اور بسکٹوں سے بوجھل ہو رہے تھے۔ پستہ قد لڑکی کا سویٹر مزید سکڑ چکا تھا۔۔۔ "ایک رات کے لیے سان سباستیان میں رک جائیں تو کیا حرج ہے؟" سویٹر والی لڑکی نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہاں کوئی حرج نہیں مگر پھر میں اکیلی کیا کروں گی؟" لمبوترے منہ والی نے ہنس کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" دوسری لڑکی نے اپنا کالا سویٹر پتلون کے اوپر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے مایوسی سے سر ہلایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اگر یہاں تمہارا کوئی دوست ہو تو آج شب ہم چاروں۔۔۔"

"یہاں سان سباستیان میں؟" میں بے اختیار مسکرا دیا۔ "بہر حال پیشکش کا شکریہ۔۔۔ خدا حافظ!" میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور سامان اٹھا کر شہر کی جانب چل دیا۔ "میڈرڈ میں ملاقات ہوگی۔" کالے سویٹر والی کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کر دیا۔" (۲۸)

"میں نے ربیکا کی طرف دیکھا۔ وہ ہماری گفتگو سے بے نیاز ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے سان مارکو چوک کے کبوتروں کو دیکھنے میں مگن تھی، "ہیلو" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "ہائے" اس نے بے دلی سے ماتھے پر پڑی ہوئی سنہری لٹ کو ہاتھ سے ایک طرف کرتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ میں نے ربیکا کی جانب دیکھا وہ بڑی بیدلی سے سلاد کا ایک پتا کانٹے پر اٹکائے منہ بسورے بیٹھی تھی اس کی نظریں اب بھی کبوتروں کا پیچھا کر رہی تھیں۔۔۔ "تم بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟" ہم میز سے اٹھنے لگے تو خاتون نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"یہ تو بات پر منحصر ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا "بہر حال فرمایئے۔"

"اگر تم آج شام فارغ ہو تو۔۔۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "تو پھر تم دونوں اکٹھے شہر کی سیر کے لیے کیوں نہیں چلے جاتے؟ میرا مطلب ہے تم اور ربیکا"

"ممی" لڑکی کے لہجے میں درشتی تھی۔

"ربیکا میں نے غلط کہا تھا کہ تم اس سفر کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتی رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے سفر کے دوران تم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مسکرائیں۔۔۔ آج شام مستنصر کے ساتھ وینس کا خوبصورت شہر دیکھ آؤ تو طبیعت بہل جائے گی۔ کیوں مستنصر؟" اس نے پُر امید نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا۔ اب جو صورتحال پیدا ہوئی۔ وہ میرے لیے قطعی طور پر خوشگوار نہ تھی۔ خاتون اور اس کے خاوند کے شریفانہ برتاؤ کے مدنظر میں انکار بھی نہ کر سکتا تھا اُدھر وہ محترمہ مُنہ پھلائے بڑی لاپرواہی سے میز سے ڈبل روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے چُن چُن کر کبوتروں کو ڈال رہی تھیں۔ "مجھے تو شاید کوئی اعتراض نہ ہو" میں۔ زرا قدرے سنجیدہ ہو کر کہا "مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی بیٹی کو اس پروگرام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔" "ربیکا پلیز" بوڑھے نے اس گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چلیے جیسے آپ

کی مرضی۔ میں شام سات بجے اسی قہوہ خانے میں پہنچ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے نا؟" اس نے اکتاہٹ سے مجھے پوچھا۔

میں نے بیوقوفوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر واپس کیمپنگ میں آ گیا۔ وینس کی دوپہر قدرے گرم تھی، میں نے اپنا جامہ غسل تن کیا اور اپنے خیمے کے سامنے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ سمندر کا نمکین پانی بے حد خوشگوار اور فرحت بخش تھا۔ تھوڑی دیر نہانے کے بعد میں اپنے خیمے میں آ کر سو گیا۔۔۔ بہر حال میں وینس کی شام تو ہر صورت دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ مجھے یوں لگا جیسے پورا سان مارکو چوک خالی ہو چکا ہے اور اُس کے بیچ صرف ربیکا کھڑی مُسکرا رہی ہے۔ سنہری بالوں سے ملتا ہوا پھولدار لباس اور اس کے اوپر ہلکا زرد کوٹ پہنے وہ بیحد خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔ "تم بھی تو اپنی مرضی سے نہیں آئیں" میں نے اُس کا کوٹ لے کر پاس کھڑے ویٹر کو تھما دیا۔

"یہ بات تو نہیں" وہ کرسی پر بیٹھ کر ماتھے پر پڑی سنہری لٹ کو ہتھیلی سے سمیٹتے ہوئے بولی "میری ممی بہت سویٹ ہیں۔ ہم سفر کے دوران جہاں بھی جاتے ان کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ میں اکتا نہ جاؤں اور خوش رہوں۔۔۔ "نہر کے کنارے" اس نے سر ایک طرف جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سنہری لٹ پھر ماتھے پر آ گئی۔ ہماری میز کے ساتھ ہی ریستورنٹ کا چھوٹا سا گھاٹ تھا جہاں درجنوں نازک اور سجے ہوئے گنڈولے جھول رہے تھے۔ ان میں سے اکثر ان لوگوں کی ذاتی ملکیت تھے جو ریستوران میں شام کے کھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میز بڑی نفاست اور سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ مرینو کے بنے ہوئے شیشے کے گلدان میں سرخ رنگ کے درجن بھر پھول بڑے قرینے سے ترتیب دیے گئے تھے۔ ان کے درمیان دو لمبی اور پتلی موم بتیوں کی لو شام کی ہلکی ہوا میں تھرتھرا رہی تھی۔۔۔ شیشے کا اتنا خوبصورت کام میں نے کہیں نہیں دیکھا ربیکا نے اپنی لمبی انگلیوں سے گلدان پر ابھرے ہوئے نقوش کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا "تمہارا کیا خیال ہے مرینو کا بنا ہوا یہ گلدان خوبصورت ہے نا؟"

"ہاں ہے لیکن شاید اتنی خوبصورت انگلیاں مرینو کے کاریگر صدیوں میں بھی تخلیق نہ کر سکیں" اس نے ایک دم گلدان سے ہاتھ کھینچ لیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرا مسرت سے دمک رہا تھا۔۔۔ "یہ تو روم سے جدائی کی دھن ہے اور تم کل وہاں جا رہی

ہو؟" اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں سنجیدہ ہو گئیں "یہی تو میں بھول جانا چاہتی تھی۔" اس نے اُداس ہو کر کہا "مستنصر تم کل ہمارے ساتھ روم کیوں نہیں چلتے۔" اس نے یکدم خلاف توقع میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔ ہم دونوں جی بھر کے روم کی سیر کریں گے۔ صبح کو ویا ویتو میں گھومیں گے۔ پچھلے پہر ہسپانوی زینوں پر بیٹھ کر پھول بیچنے والوں کی صدائیں سنیں گے اور شام کو۔۔۔" (۳۹)

مستنصر کے سفرناموں میں تھکن، الجھاؤ یا بوریت کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ ان کے سفر ناموں میں ناول، افسانہ، آپ بیتی، خاکہ اور نثری نظم کی چاشنی بڑے امتزاج کے ساتھ موجود ہے۔ مستنصر کے ہاں بعض مقامات پر تخیل کے ایسے موتی جڑے ہوئے نظر آتے ہیں کہ سفرنامہ پڑھتے ہوئے قاری بھی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ خیال کی وادیوں میں گم ہو جاتا ہے اور ان سے حظ اُٹھاتا ہے۔ مستنصر صرف چیزوں اور مقامات پر تبصرہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر اتر جاتے ہیں۔ اچھے سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ سفرنامہ نگار کی ذات اس سے الگ نہ ہو اور وہ اپنی شخصیت کو یوں سفرنامے میں جذب کرے کہ اس کو اس سے الگ کرنا مشکل ہو جائے۔ مستنصر اپنے سفرناموں میں بے رنگ جزئیات سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔ خشک معلومات ان کی تحریروں میں بہت کم ملتی ہیں۔ جب وہ دلچسپ اور رنگین واقعات بیان کرتے ہیں تو ان کے جذبات و احساسات کے ساتھ قاری اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ اُن کے دل کی بات قاری کو اپنے دل کی بات محسوس ہوتی ہے۔

مستنصر نے جس کام کا آغاز کیا ان کے ہم عصروں نے بھی اس کا تتبع کیا اور ان کی ڈگر پر چل کر اپنے سفرناموں میں تخیل کی فراوانی اور افسانوی انداز میں کوئی نہ کوئی رومانی داستان ضرور لکھی۔ چنانچہ آج کل سفرناموں کے ذریعے رومانی کہانی لکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ بزنس کے نقطہ نظر سے بھی اب اس نوع کے سفرناموں کا فیشن چل نکلا ہے۔ مستنصر کے سفرناموں کی بنیادی خوبی ان کی رومانویت ہے جو قاری اور سفرنامے کے درمیان انسیت پیدا کرنے کا موجب ہے۔ سفرنامہ نگار کے محسوسات اور محبتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ چیزوں سے انسانوں سے، مناظر فطرت سے تہذیبوں سے، روایات سے، لباس، موسموں، پھولوں حتیٰ کہ سفر کی صعوبتوں سے بھی محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مستنصر اتنی سادگی سے چیزوں کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ عام قاری اپنی کم علمی پر افسوس کرنے کی بجائے مزید جاننے کے شوق میں مبتلا ہو جاتا ہے گویا اس سے قاری کس کمپلکس میں بھی مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ سادہ، رواں اور برجستہ جملے لکھتے ہیں اور ان کے سفر ناموں میں کیلنڈر یعنی دنوں اور وقت کا حوالہ بہت کم ملتا ہے۔ راستے میں ملنے والے لوگوں اور چیدہ

وہ واقعات سے باقاعدہ کہانی سنتے ہیں اور اس طرح سفرنامہ کہانی کی صورت میں کرداروں کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر سفرنامے افسانے کا تاثر لیے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات ان کے سفرناموں میں افسانوی رنگ اتنا غالب آجاتا ہے کہ سفرنامہ اس طرح درمیان میں سے غائب ہو جاتا ہے جیسے بادلوں کی اوٹ میں سورج۔ ان کے سفرناموں میں یہ خود ہیرو ہوتے ہیں اور ہر چلنے والی خوبصورت لڑکی ان کی عاشق۔ اس طرح ان کے ہاں بعض مقامات پر جنس نگاری کے افسانوی اور مبالغہ آمیز نمونے ملتے ہیں۔ کہیں کہیں اپنی ذات کی نمائش کے لیے بھی وہ جنس نگاری کا سہارا لیتے ہیں۔ یوں ان کے سفرناموں میں کہیں کہیں خودنمائی کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ وہ قاری کو محظوظ کروانے کے چکر میں بعض مقامات پر جنس نگاری کے ضمن میں توازن کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ اس افسانوی انداز میں جنس کا عنصر غالب آجاتا ہے اور سفرنامہ بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں جنس نگاری کے نمونے افسانوی انداز میں نظر آتے ہیں:

"رتھ اور کیرن نے اُن وحشیوں کی جانب ہاتھ ہلا کر اُن کے جذبات کی قدر کی۔ رتھ چونکہ کوہ نورد تھی اس لیے اُس کا بدن ایک ٹین ایج لڑکی کی طرح کسا ہوا اور ایک سفیدے کی طرح سیدھا اور سفید تھا۔ اُس کی کاٹھی بہت مضبوط تھی۔ کیرن اُس سے کم عمر تھی لیکن اُسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی البتہ رتھ کا چہرہ اُس کے تجربے اور بیتے برسوں کی چند کہانیاں سناتا تھا۔۔۔ "نہیں نہیں۔" رتھ ہنسنے لگی اور اپنا سیاہ چشمہ اُتار دیا کہ دھوپ کی شدت میں کمی آرہی تھی۔ مجھے اپنی عمر پر بہت فخر ہے۔ میں چھتیس برس کی ہو گئی ہوں۔" "اوہ مائی گاڈ۔" میں نے نہایت سنجیدہ شکل بنا کر ذرا رنجیدہ ہو جانے کی اداکاری کی۔ "اگر چھتیس برس کی ہو تو تم نے میرے دو دن ضائع کر دیے ہیں۔ یعنی کل شام سے اب تک۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس لیے کہ میں تو تمہیں اب تک ایک نہایت نوخیز لڑکی سمجھتا رہا ہوں اور اسی لیے اپنی عمر کی مناسبت سے تمہارے ساتھ فلرٹ کرنے سے باز رہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم چھتیس برس کی ہو چکی ہو اور میری رینج سے بہت باہر نہیں ہو تو میں کل شام سے ہی تمہارے ساتھ فلرٹ کرنے لگتا۔ تم نے دو دن ضائع کر دیے۔"

رتھ اور کیرن بھی تو پہاڑوں سے اُتری تھیں اگرچہ بلاشک و شبہ اپنے خاوند اور بوائے فرینڈ سے مطمئن ہو کر اتری تھیں لیکن اس کے باوجود اُن دونوں کو میری

یہ فلرٹیشنس گفتگو پسند آئی۔۔۔''سر جی مرضی تو ہم سب کی یہ ہے کہ اب آپ ان خارش زدہ میموں کے ساتھ سُریش کی طرح جو چپکے ہوئے ہیں تو ذرا الگ ہوں اور ہمارے پاس آ جائیں ہم سب آپ کے لیے بہت اُداس ہیں۔'' چنانچہ میں نے میموں سے معذرت کی اور تالاب کے کنارے لم لیٹ ساتھیوں کے پاس آ کر پوچھا ''ہاں جی۔ آپ حضرات کیا چاہتے ہیں؟'' ''کچھ نہیں'' سلمان نے لاپرواہی سے کہا ''ہمیں آپ کی صحت کا خیال ہے۔ اس عمر میں میموں کی تا دیر رفاقت آپ کے لیے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔'' (۴۰)

''ہم دونوں کافی پینے لگے۔۔۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔۔۔ پگھلتی موم گولائی کے ساتھ لپٹتی ایک رواں بیل کی طرح نیچے اُتر تنگ کی پشت پر پھیل رہی تھی۔

''تم ایسی حسین لڑکیوں کو تو جوڈو کا لباس پہننے کی ضرورت نہیں۔۔۔''

بالآخر میں نے اس وقفے کو توڑا۔ ''تمہیں تو دیکھ کر ہی ہتھیار ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔'' اُس کے گول چہرے پر موم بتی لشکی۔ ''تم اطالویوں کی طرح جھوٹی مگر خوب صورت باتیں کرتے ہو۔''۔۔۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں اس شہر میں تمہاری رفاقت میں چلوں، باتیں کروں، ہنسوں لیکن تمہارے اندر ایک بے چین بے جہتی ہے۔ تم کوشش کر کے خوش رہتے ہو اور مشقت سے خوبصورت فقرے کہتے ہو، اور اُداسی کی ایک ہلکی سی حدت ہمہ وقت تمہاری آنکھوں میں جلتی رہتی ہے۔۔۔ تمہاری اس خواہش کا مجھے یقین نہ ہوتا تو میں باپ کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ چلی جاتی کیونکہ میں کبھی بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ باہر جانا پسند نہ کروں جو میرے لیے بھی پسندیدگی کے جذبات نہ رکھتا ہو۔۔۔''

''ہمیں میں تو تم سے محبت کرتا ہوں، شدید اور نہایت جذباتی قسم کی، اور اگر میرا اطالوی ویزا کل ختم نہ ہو رہا ہوتا تو میں تمام وقت تمہاری وین کے پیچھے لٹک کر آہیں بھرتا رہتا۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں۔۔۔'' میں نے ہنستے ہوئے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا لیا۔

''اوہ تم بہت ہی ناقابلِ یقین قسم کے آدمی ہو مستنصر۔'' وینڈی مسکرا دی ''جس طرح تم مجھے بتائے بغیر پلازا اسائیوریا میں چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے تو مجھے اُسی وقت شک ہُوا تھا کہ تمہارے ذہن میں کچھ فتور ہے اور میں ایک نیم دیوانے شخص کے ساتھ وینس میں ہرگز گھومنا نہیں چاہتی۔'' ''بالکل'' میں نے سر ہلا دیا۔

''لیکن ہم ایک دوسرے کو اچھے لگے، تھوڑی سی مدت کے لیے، فلارنس میں!''

''ہاں'' میں نے پھر سر ہلا دیا۔ ''بہت اچھے لگے۔''

''تم دراصل مجھے پلازا ماسائیوریا میں ہی چھوڑ آئے ہو۔۔۔'' اُس نے سر جھٹک کر میری طرف دیکھا۔ مسکراہٹ سمٹنے لگی، چہرہ آگے آیا، ہونٹ جدا ہوئے، نیم دائرے میں بدلے اور ایک گہرا سانس موم بتی کے شعلے پر بچھ گیا۔ یکدم اس کا چہرہ اندھیرے میں یوں چمکا جیسے کسی نے ماچس جلا دی ہو۔ یہ روشنی لمحہ بھر کے لیے میرے گالوں پر نم آلود حدت کے ساتھ پھیلی۔ پھر وہ اُٹھی اور پردہ اٹھا کر خیمے سے باہر نکل گئی۔'' (۴۱)

''میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں؟ مجھے کسی غیب کا علم جاننے والے نے بتایا تھا کہ اگر تم سکردو سے پرے آخری انسانی بستی اسکولے جاؤ اور پھر اسکولے سے سفر کرتے ہوئے ایک نیلی جھاڑیوں والے خشک میدان میں پہنچو تو اس کے درمیان میں ایک راستہ ہے اور اس راستے پر ایک ایسی خاتون تمہیں ملے گی جو دنیا کی حسین ترین خاتون ہے۔ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں؟ میں صرف اور صرف تمہیں ملنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ تمہاری تصویر اتاروں گا اور چلا جاؤں گا۔ کیا میں تمہاری تصویر اتار سکتا ہوں؟'' اس کے چہرے کا رنگ مختلف ہوا اور وہ تھوڑا سا شرمائی ''تم یقیناً مذاق کر رہے ہو۔''

''نہیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ بہت عرصے کے بعد تم جیسی حسین لڑکی دیکھی ہے۔ تصویر اُتار لوں؟'' ''ہاں۔'' اس نے جلدی سے اپنے بال درست کیے۔ میں نے تصویر اتاری ''شکریہ۔۔۔'' اور آگے بڑھ گیا اور جب کافی دور جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ وہیں کھڑی تھی، ایک ناقابلِ یقین حالت میں۔'' (۴۲)

''اگر میں اس تصویر کو دیکھوں تو وہ مجھے صرف ایک عام سی لڑکی دکھائی دے۔ لیکن اُن دنوں اس ویران پہاڑی سلسلے کے درمیان جہاں ڈھلوانوں پر سردیوں کے بوسے ہوا تھی۔ کاغذ پر چھپی اس رنگین تصویر نے ہم سب کو قید کر لیا، ہمارے دلوں کو کھینچا کہ آؤ میرے پاس آؤ میں دُنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں، کیا تم نے مجھ جیسی کوئی دیکھی۔ اور ہم سب اُسے دیکھ کر قدرے ابنارمل ہو گئے اور ہماری شریانوں میں دوڑتا تمام تر خون ہمارے چہروں میں سے پھوٹنے لگا۔ ہمارے ہونٹ کپکپائے، حلق خشک ہوئے اور شائد ہمیں بخار بھی ہو گیا۔

''میں صرف اس لڑکی کو دیکھنے ہنزہ جا رہا ہوں۔'' اس نے تصویر پر جھکے

ہمارے سروں کو پرے کیا اور میگزین اٹھا کر پھر سے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔"(۴۳)

مستنصر حسین تارڑ نے خصوصاً مغرب کے معاشرے کی بے لگام آزادی کو بھی اپنے سفرناموں میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے کئی مقامات پر اخلاق سوز مناظر دیکھے اور ان کی عکاسی بڑے خوبصورت پیرائے میں کی ہے۔ وہ اس پوری داستان کو چھوٹے اور ڈھکے چھپے جملوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں وہ کہیں کہیں مغربی معاشرت پر طنز بھی کرتے ہیں۔ خصوصاً ساحل کے مناظر کو انہوں نے ادبی چاشنی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعض مقامات پر وہ ان مناظر کی ہر ہر زاویے سے شرح کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو برہنہ جملوں کی لوٹ سیل بھی لگا دیتے ہیں۔ یہی وہ جملے ہوتے ہیں جنہیں ان کے شائستہ اسلوب پر ہلکے سے دھبے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ مجموعی طور پر وہ جنسیت کے برملا اظہار کے اتنے قائل نظر نہیں آتے لیکن بعض مقامات پر اس سلسلے میں ان کا قلم کچھ زیادہ ہی رواں ہو جاتا ہے اور وہ مناظر کو مزید رنگین کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں ان کے قلم کی جولانیاں عروج پر نظر آتی ہیں:

"یہاں خاصی رونق تھی۔ چند ایک ہسپانوی لڑکیاں ریت پر بیٹھی سویٹر بُن رہی تھیں اور وہ نہانے کے لباس کے بجائے اپنے روزمرہ کے لباس میں ملبوس تھیں البتہ خوش شکل ہسپانوی لڑکوں کی ٹولیاں "شکار" کی تلاش میں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں اور شکار فرانسیسی لڑکیاں تھیں جو نہانے کا مختصر ترین لباس بکینی زیب تن کیے ریت پر لیٹی اپنے متناسب جسم سنولا رہی تھیں۔ بکینی چار گرہ کپڑے کے ان دو ٹکڑوں کا نام ہے جو ستر پوشی کے اصول "وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے۔" پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جسم کے ایک حصے میں اور دوسرے پر اٹکا لیے جاتے ہیں۔ بکینی کے بالائی حصے کی پتلی ڈوری کی گرہ شاید صرف قوتِ ارادی کی بنا پر قائم تھی ورنہ اس میں سوت کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا۔ چند برس پیشتر مذہبی وجوہات کی بنا پر ہسپانیہ کے ساحلوں پر اس قسم کا لباس پہننے پر کڑی پابندی عاید تھی۔ خلاف ورزی کرنے والے کو بلکہ والی کو ہسپانیہ کی پولیس "گاردیا سول" دھر لیتی اور جرمانے کے ساتھ دیس نکالا بھی ملتا۔ اس پابندی کا اثر یہ ہوا کہ سیکنڈے نیویا اور فرانس کی آزاد منش سیاح خواتین نے اپنے جسم کا زیادہ تر حصہ سنولانے کی خاطر ہسپانیہ کی بجائے اطالیہ اور یونان کے ساحلی مقامات کی جانب کوچ کرنا شروع کر دیا۔ ان ہر دو ممالک میں لباس پر ایسی کوئی پابندی عاید نہ تھی بلکہ وہاں کے نوجوان لباس اور زیب تن کے درمیان زیب کی غیر موجودگی زیادہ پسند کرتے

تھے چنانچہ بانی مصلحتوں نے مذہبی جذبات پر غلبہ پایا اور حکومت ہسپانیہ نے یہ پابندی اٹھالی۔ اب غیر ملکی لڑکیاں صرف دو ڈوریاں نیچے اوپر اٹکا کر کھلے بندوں ساحل پر دھوپ سینکتی ہیں اور ان ڈھکی ان ڈھکی لڑکیوں کو دیکھ کر ہسپانوی نوجوان اپنی آنکھیں گرماتے ہیں۔"(۴۴)

"کیمپنگ کے ریستوران میں کھانا کھا کر ساحل کی طرف چلا گیا جہاں بیشمار مرد اور عورتیں ریت پر اوندھے مُنہ لیٹے دھوپ سینک رہے تھے، نہانے میں کسی کو بھی دلچسپی نہ تھی، ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ کسی طرح جسم "براؤن" ہو جائے۔ دو خواتین ایک دوسرے کو "ٹین لوشن" ملنے میں مصروف تھیں، جس طرح ہمارے ہاں رنگ گورا کرنے کی کریمیں دھڑا دھڑ بکتی ہیں اسی طرح یورپ میں "ٹین لوشن" یعنی رنگ بھورا کرنے کی کریم کی بے حد مانگ ہوتی ہے۔ یورپ کے ٹھنڈے ملکوں یعنی سیکنڈے نیویا، جرمنی، ولایت وغیرہ میں ہلکی بھوری رنگت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ حامل حال قریب میں ہی ہسپانیہ یا اطالیہ کے حسین ساحلوں کی ریت چھان کر واپس لوٹا ہے اور یہ قابل فخر کارنامہ گنا جاتا ہے۔ فدوی پر چونکہ دھوپ سینکنے کا اثر افریقہ سے واپسی ظاہر کرتا ہے اس لیے "دھوپ میں نہانے" کا ارادہ ترک کر کے ساحل کے ساتھ ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ اسی رات کیمپنگ میں پارٹی ہوئی اور خوب دھماچوکڑی مچی بلکہ ہم نے بھی مچائی۔"(۴۵)

"سوئمنگ پول کے کنارے ایک لائف گارڈ کھڑا رہتا حالانکہ وہ ایک باتھ ٹب سے شاید دوگنا ہی بڑا ہو اور گہرائی اتنی کہ اس میں پاؤں کے بل بیٹھ جانے سے بھی باہر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ خواتین ہاتھ پاؤں چلا کر بمشکل اپنے سوئمنگ کا سیشن مکمل کرتیں اور پھر باہر آ کر دھوپ میں لیٹ جاتیں۔ اُن کے کاسٹیوم دھوپ سے کم اور جارج اور سام ایسے نوجوانوں کی بھاپ چھوڑتی نگاہوں سے زیادہ سُوکھتے۔۔۔ انجن روم کے قریب سامنے سے چند خواتین آتی دکھائی دیں۔ میں نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا۔ پہلی سانولے رنگ کی چمکتے دانتوں والی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ دوسری سانولے رنگ کی چمکتے دانتوں والی ایک نوجوان لڑکی تھی مگر عمر میں پہلی سے ذرا بڑی۔۔۔ اور تیسری بھی انہی خصوصیات کی حامل تھی مگر لڑکی سے عورت ہوتی ہوئی۔ ان سب کو کسی ایک ہی بھٹی میں سے نکالا گیا تھا۔۔۔ "سمندر کے دیگر قوانین کیا ہیں؟" میں نے لطف

لیتے ہوئے پوچھا۔

"تاش، کتاب، شراب اور گرلز۔۔۔ تاش مجھے ناپسند ہے۔ استاد ہونے کی حیثیت سے کتاب میرا پروفیشن ہے۔ اس لیے فارغ اوقات میں اس کے قریب نہیں پھٹکتا گرلز جس قسم کی اس شپ پر پائی جاتی ہیں۔ وہ تم نے بھی دیکھی ہیں۔۔۔ باقی شراب رہ جاتی ہے۔"

میں نے اُسے تین نیچے اوپر کی ہو بہو سانولی لڑکیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ہاں میں نے بھی دیکھی ہیں مصری ہیں۔" (۳۶)

"اور یہاں پہنچتے ہی ڈاہر ایک ایسے ملاح کی طرح ہو گیا جو اس پرل آئی لینڈ پر بہت مرتبہ آ جا چکا تھا اور یہاں اگر ایسی حسینائیں تھیں اور گھاس کے سگرٹ پینے "ہولا" ناچتی تھیں تو وہ اُن سے بخوبی واقف تھا۔۔۔ ڈاہر نے پہلے تو صرف مجھے سائٹ سی انگ کروانے کے لیے پورے فلور کا ایک چکر لگایا۔۔۔ موتی بیچنے والی حسیناؤں سے بھاؤ تاؤ کیا۔۔۔ مارکیٹ پرائس کا اندازہ لگایا اور پھر بالآخر اُس چالاک چنچل اور چلبلی حسینہ کے کوٹھے پر میرا مطلب ہے کھوکھے پر لے گیا جہاں سے وہ اپنے لیے اور دوستوں کے لیے خریداری کرتا تھا۔ یہ نیلے میک اپ میں نیلی ہوتی حسینہ ڈاہر کو دیکھ کر نہایت پُرمسرت ہوئی اور اگر اُس کے اور ڈاہر کے درمیان موتیوں اور زیورات سے سجی میز حائل نہ ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ بوس و کنار کرنے سے باز نہ آتی۔۔۔ بالآخر ڈاہر نے اُس حسینہ کو زیر کر لیا۔۔۔ حسینہ کو تو نہیں بلکہ اُس کی بتائی ہوئی قیمت کو زیر کر لیا۔ اور سودا ہو گیا۔" (۳۷)

مستنصر حسین تارڑ اپنے ہر سفرنامے میں مناظر اور انسانوں سے نئے نئے عشق کرتے ہیں لیکن ان کے اندر کہیں یہ احساس چھپا ہوا ہے کہ یہ سفر عارضی ہے۔ یہ ساتھ ادھورا ہے۔ اُدھورے رہ جانے والے جذبوں کے غم کی کسک ہمیشہ انسان کے اندر موجود رہتی ہے۔ مستنصر طبعاً حسن پرست معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے خصوصاً حسن مغرب کی بہار یعنی وہاں کی عورتوں کا تذکرہ مزے لے لے کر کیا ہے۔ مستنصر کا اسلوب دھیما دھیما نرم رو رومانی سا ہے۔ وہ جو منظر بھی دیکھتے ہیں اسے اپنے دل کی دھڑکن بنا لیتے ہیں۔ محبت ایک عالمگیر اور لازوال جذبہ ہے جو کسی زبان، کسی سرحد، کسی ملک اور کسی تہذیب و ثقافت کا پابند نہیں ہوتا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سفرنامے کو کہانی اور ناول کے قریب تر کر کے پڑھنے والوں میں ایک تجسس اور شوق کی کشش پیدا کر دی ہے۔ جس طرح کہیں کہیں

راہیں بھی لطف دیتی ہیں۔ اسی طرح اجنبی دیاروں کے سفر میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ میں ذرا سی بھی نرمی محسوس ہو تو وہاں کے سفر کی تھکان محبت کے جذبے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور محبت محبت ہی ہوتی ہے مستنصر میں بھی اس جذبے کی فراوانی ہے۔

مستنصر کا اسلوب ایسا ہے کہ دورانِ مطالعہ قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کے سفرناموں میں خواتین کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے ان کی حسن پرستی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ پاکستان کے کسی مقام کا ذکر کر رہے ہوں وہاں بھی دوسرے ممالک سے آئے ہوئے یورپی سیاحوں خصوصاً خواتین کے تذکرے سے سفرنامے میں رنگینی پیدا کر دیتے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض مقامات پر مستنصر نے جنس نگاری کا سہارا حظ اندوزی کے نقطہء نظر سے لیا ہے تا کہ قاری دورانِ مطالعہ بوریت کا شکار نہ ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے خواتین کا ذکر کرتے ہوئے کہیں کہیں استعاراتی انداز اختیار کیا ہے ان کے اس علامتی اندازِ بیان نے واقعات کو مزید دلکش بنا دیا ہے۔ جس سے باذوق قاری یقیناً مسرت اخذ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن کو دلچسپ بنانے کے لیے جنس نگاری کا سہارا لیا گیا ہے:

"مائنگ نے کار روک دی اور چاروں لڑکیاں نیچے اتر کر ساتھ والے کھیت میں غائب ہو گئیں۔"

"تم نے ان کی شکلیں دیکھی ہیں؟ ایک بھی کام کی نہیں۔ سب بطخیں ہیں۔" مائنگ کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ اُس کا مشاہدہ کسی حد تک درست تھا۔ لڑکیاں شکل و صورت کے لحاظ سے کافی گئی گزری تھیں۔

"کیوں نہ ان کو یہیں چھوڑ جائیں" مائنگ نے چہک کر کہا۔ "کل صبح چار بطخیں مشرقی جرمنی کے کھیتوں میں قیں قیں کرتی ہوئی خفیہ پولیس کے ہاتھ لگ جائیں تو؟"۔۔۔ "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ سُرخوں کی مصیبت نہ ہوتی تو خیال بُرا نہ تھا" اُس کی نظریں کھیت پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بدستور قہقہے لگا رہا تھا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے کھیت کے مختلف کونوں میں سے برآمد ہوئیں۔۔۔ "بالکل بطخیں" مائنگ نے پھر نعرہ لگایا۔ "کیا؟" انجیلا نے اونگھتے ہوئے پوچھا۔ "شکار کی بات ہو رہی ہے۔ بطخیں!" ۔۔۔ "سب سے پہلے تم دونوں صدر دروازے کے راستے کمرے تک پہنچ جاؤ۔" اس کی مخاطب انجیلا اور جینٹ تھیں۔" اس کے بعد مستنصر اور تونکہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کی مانند ٹہلتے ہوئے اوپر آ جائیں اور پھر آخر میں مارگریٹ تم پہلے

ہوٹل کے قہوہ خانے میں جا کر ایک پیالی کافی پیو اور بعد میں چپکے سے اوپر کھسک آؤ۔ اس نقل و حرکت کے دوران چال میں خود اعتمادی اور لفٹ بوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا بے حد لازمی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔"(۴۸)

"دوسرے روز میں کام سے فارغ ہو کر اپنے فلیٹ میں آیا تو میرے بستر میں ایک سنہری بالوں والی لڑکی۔۔۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہ تھی مگر اُس وقت تھی کیونکہ میں اُس لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی "سوری لیکن تمہارے کمرے میں بستر کے علاوہ اور کوئی شے ایسی نہیں تھی جس پر بیٹھا جا سکے۔۔۔"

ایک روز اُس نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ نہایت اعلیٰ قسم کی ڈیکور والا فرانسیسی طرز کا کمرہ ،صفائی اور مہنگائی کی مہک لیے ہوئے۔ دس منٹ کے عرصے میں اُس کی لینڈ لیڈی نے کم از کم بیس مرتبہ کسی نہ کسی بہانے اندر جھانکا۔

"دیکھا دوست میں اذیت میں ہوں۔" پیٹر لوجی نے بے چارگی سے کہا۔ "تم لڑکے ہو تو اُس نے اتنی مرتبہ اندر جھانک کر دیکھا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو رہی۔۔۔ بھلا میں یہاں کسی لڑکی کو کیسے لا سکتا ہوں۔"

"میرے ساتھ اٹھ آؤ۔"

"تمہارے بستر میں جگہ بچے تب ناں"

پیٹر لوجی واقعی اذیت میں تھا۔ ایک سیاہ حس مزاح کا مالک ،منہ بسورتا ہوا اور سٹاک ہوم سے بیزار۔ "میرا تو سارا "سیزن" تباہ ہوگیا ہے۔ میں روم واپس جا کر اُن تمام دوستوں کی پٹائی کروں گا جنھوں نے سویڈن کی سنہری خوبصورتیوں کے بارے میں مجھے بھڑکایا تھا کہ پیٹر لوجی وہ تو تمہیں دیکھتے ہی اپنے کپڑے پھاڑ ڈالیں گی ،دو ماہ ہو گئے ہیں اور میں کسی فرشتے کی طرح معصوم پھر رہا ہوں۔"" اور اُس روز میرے فلیٹ میں؟"

"تم آ گئے تھے۔۔۔ میں بے حد مایوس ہوں دوست" اُس نے ایک رقت آمیز آہ بھری۔ میں نے اُسے دلاسا دیا کہ مایوسی گناہ ہے۔

"لگتا ہے کہ میں اس شہر میں ہمیشہ گنہگار ہی رہوں گا۔" وہ ہونٹ لٹکا کر بولا۔

"ذرا خیال کرو کہ موسم گرما ہے ،سالانہ چھٹیاں ہیں تو یورپ اور امریکہ کی بیشتر خوبصورت لڑکیاں اس وقت کہاں ہوں گی۔ روم میں ہسپانوی زینوں کے آس

پاس۔۔۔ اور میں ایک رومن کہاں ہوں ،روم میں نہیں سویڈن میں۔۔۔ لعنت ہے مجھ پر۔" اور یہ کچھ کچھ میرے لئے بھی ناقابل فہم سی بات تھی کہ پیٹر لوجی جو یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ خوش شکل اور خوش مزاج تھا ،خواتین کے معاملے میں جانے کیوں انتہائی بد قسمت واقع ہوا تھا۔

وہ راہ چلتے جوڑوں کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا "مستنصر میرے دوست تم ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیا میں اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے گاؤدی سے کئی لاکھ گنا بہتر نہیں ہوں۔۔۔ میری رومی ناک ،سیاہ گھنگھریالے بال ،یہ سانڈھوں ایسی چمکتی آنکھیں۔۔۔ اور میرا یہ روم کے بہترین درزی کے ہاتھوں کا سلا ہوا براؤن سُوٹ۔۔۔ لعنت ہے مجھ پر۔" اُسے یقین تھا کہ اُس کے دوستوں نے جان بوجھ کر اُسے روم سے چلتا کیا ہے تا کہ وہ اُس کی غیر موجودگی میں ہسپانوی زینوں کے آس پاس پائی جانے والی لڑکیوں کو بلا مقابلہ جیت سکیں۔"(۴۹)

"فرانسیسی سیاحوں کا ایک گروہ ہانپتا ہوا اُوپر آیا۔ ان میں ایسی خواتین بھی تھیں جن کے فیشن ماڈلوں ایسے لباس سے لگتا تھا کہ وہ پیرس کی کسی شبینہ پارٹی میں شمولیت کے لئے بن سنور کر نکلی ہیں۔ سلک کے بلاؤز مزید ریشمی ہو رہے تھے ،گھیرے دار پھولوں والے سکرٹ جنھوں نے کیا کیا گھیر رکھا تھا اور بڑے بڑے ہیٹ۔ اُن کے چہرے دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہے تھے اور ہونٹ سانس لینے کے لیے کھلے کے کھلے تھے اور وہ پورے بدن سے ہانپ رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار علم ہوا کہ ہانپنا صحت کے لیے کتنا مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ دیکھنے والے کی صحت کے لیے۔ ان سیاحوں نے بھی سب بابوں سے ہاتھ ملائے۔ بابوں نے مردوں کے ہاتھ چھوئے اور خواتین کے محسوس کیے لیکن نہایت شائستگی کے ساتھ۔"(۵۰)

"صرف سرسبز کھیت تھے اور ان میں سرسوں پھولتی تھی اور ان کھیتوں میں جو شمشالی لڑکیاں جھکی تھیں وہ سر اُٹھا کر ہمیں دیکھتی تھیں تو وہ بھی زرد تھیں جیسے چینی شہزادیاں ہوتی ہیں۔۔۔ خواتین جو خوش شکل اور خوش لباس تھیں۔ قدیم طرز کی ٹوپیوں میں ،کھیتوں میں کام کرتی اور اپنے دور اُفتادہ دیار میں اجنبیوں کی آمد سے پُر تجسس ہوتیں۔ اپنے آپ کو اس وادی کی مانند پوشیدہ بھی رکھتیں اور پھر ظاہر ہو کر ہمیں بھی تکتیں۔ کھیتوں میں پانی لگاتے۔۔۔ گوڈی کرتے اور رات کے چولہے کے لیے

سرسوں کا ساگ بھی توڑتی۔ خوش شکل اور خوش لباس حیر تیں۔"(۵۱)

مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب بڑا شوخ اور بے باک ہے۔ وہ پتھر کی بنی ہوئی عمارتوں میں دلچسپی لینے کے بجائے زیادہ تر انسانوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی کسی منظر سے خود حظ اٹھاتے ہیں۔ اس میں قاری کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کہیں کہیں اپنے ذاتی واقعات کو دلچسپ بنانے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے اور اس طرح بعض مقامات پر صرف سفرنامہ نگار کی ذات کے قصے ہی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری محظوظ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"ایک قریبی جزیرے "آئل ڈے لواں" کا بڑا چرچا تھا کہ وہ جزیرہ قدرتی حالت میں دھوپ سینکنے والوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔۔۔ ان دنوں تو یورپ اور امریکہ میں تقریباً ہر ساحل کا کچھ حصہ نیوڈ خواتین و حضرات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔۔۔ میں بکری ہو گیا۔ میرے جیسے ڈرپوک حضرات کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی کہ وہ ایک عدد مختصر لنگوٹ زیب تن کر کے جزیرے میں قدیم رنجہ فرما سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک ایک لنگوٹ مقامی بازار سے حاصل کیا اور اُسے زیب تن کر کے مقامی بازار سے عیوب برہنگی صاف چھپتے بھی نہ تھے اور سامنے آتے بھی نہ تھے۔۔۔ جزیرے کی برہنہ مخلوق میں شامل ہو گئے۔ پہلے پہل تو شرمندگی کے مارے نظر نہ اٹھاتے تھے پھر کہاں تک ٹھوکریں کھاتے، چلتے نظر اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ جو دیکھا اُسے دیکھ کر کان سُرخ ہو گئے۔ چہرہ لال بھبھوکا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔۔۔ ایک خاتون ایک ہینڈ پمپ چلا کر پانی بھر رہی تھی اور جیسے وہ تھل تھل کر رہی تھی ویسا نظارہ تو خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھلائے۔ کچھ دیر بعد نظر کو عادت ہو گئی اور وہ سب کچھ نارمل نظر آنے لگا۔ کہنا میں یہی چاہتا تھا کہ نظر کو آسانی سے عادت ہو جایا کرتی ہے۔"(۵۲)

دیکھا جائے تو سفرنامہ ایک بیانیہ صنفِ ادب ہے چنانچہ سفرنامے کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ لکھنے والے نے واقعی وہ سفر کیا ہوتا کہ صداقتِ بیان مجروح نہ ہو کیونکہ یہی صداقت اسے افسانوی ادب سے بھی زیادہ موثر اور دلچسپ بناتی ہے۔ اگر سفرنامہ نگار سفر کو اکتسابِ مسرت کا وسیلہ سمجھے، اسے بوجھل نہ جانے تو پھر اس کا رومانوی طرزِ فکر، سفر کی مشکلات اور اس کے مصائب کو قابلِ برداشت ہی نہیں، پر لطف بھی بنا دیتا ہے۔ سفرناموں میں معلومات کی فراہمی ایک معروف روایت ہے۔ بعض اوقات یہی معلومات سفرنامے کو بوجھل بنا دیتی ہیں لیکن مستنصر نے اس روایت کو اس حسن و خوبی سے انجام دیا ہے کہ سفرنامے کی دلکشی میں فرق نہیں آنے دیا بلکہ اسے اور زیادہ جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔

جہاں کہیں ایسے مقامات آتے ہیں اُنہوں نے دلنشیں پیرائے میں معلومات فراہم کی ہیں انہوں نے بعض معلومات یوں فراہم کی ہیں کہ قاری کی ہر سطر پڑھنے کے ساتھ ساتھ دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ جزئیات نگاری اتنے پُرکشش انداز میں کرتے ہیں کہ دلچسپی کا تار نہیں ٹوٹتا۔ مستنصر کے سفرناموں کی ایک خصوصیت جزئیات نگاری بھی ہے۔ وہ جس ماحول میں بھی ہوں اس سے بے خبر نہیں رہتے۔ اس کے بیان میں چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کی گرفت میں ہوتی ہے۔ وہ ماحول کی عکاسی اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری خود کو اسی ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ جیسے مستنصر نے پیرس کے بدنام ترین علاقے پگال کا نقشہ اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ قاری کی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور وہ بوریت کا شکار بھی نہیں ہوتا اسی طرح مستنصر نے اپنے سفرناموں میں جنسی ادویات اور کشتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کا ذکر خصوصاً چین کے حوالے سے انہوں نے خوبصورت اور دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سفرناموں کا ایک موضوع طوائف بھی ہے اس کا بیان بھی انہوں نے بے لاگ طریقے سے کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کے مستنصر کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے بھی ملتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"ہاں" میں نے سر ہلایا۔ "یہاں جان کا خطرہ رہتا ہے۔"

"جان کا نہیں جسم کا۔" ملاح نمبر ایک شرارت سے بولا۔ آپ کے ہوٹل کے عقب میں پگال کا علاقہ ہے۔۔۔ ایسا علاقہ جہاں اگر ملاح گھس جائیں تو انہیں پولیس ہی آ کر نکالتی ہے۔"

"پگال تو پیرس کا بدنام ترین ایریا ہے۔"

"یہ بھی کچھ کم نہیں۔۔۔" ملاح نمبر دو تجربہ کار نظر آنے لگا۔ آپ کا ہوٹل تو یہ سامنے ہے، آیئے کچھ دیر کے لیے اُدھر ہو آئیں۔"

میں نے مجبوراً "ہاں" کر دی جو قدرے پُرشوق تھی۔ پگال میں وہ تمام لوازمات موجود تھے جن کی غیر موجودگی میں ملاح سمندر پر پیاسا رہتا ہے۔ ناچ گھر، شراب خانے، نیلی فلمیں اور نیلی کیسٹ، کاروباری حسینائیں اور بٹے کٹے غنڈے۔"(۵۳)

"وانگ لی۔ بھئی یہ کیا ہے؟"

"یہ" وانگ لی نے نہایت شائستگی سے اور بے حد ماسٹر آف فیکٹ انداز میں کہا:

"یہ مردوں کے لیے ہے۔"

"مردوں کے لیے؟" میں نے سمجھا کہ کوئی خصوصی سٹور ہے جہاں سے مردوں کی بیماریوں کے لیے دوائیں ملتی ہیں اگرچہ میری سمجھ میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ پھر بھی وہ فرق تھا جو فی الحال میری سمجھ میں نہ تھا۔ "عورتیں کے لیے نہیں؟"

"یہ دراصل عورتوں کے لیے ہے" اس نے اپنی منگول گندمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور وہ جان گئی تھی کہ میں ایک بدھو بوڑھا ہوں۔ "آپ دیکھنا پسند کریں گے؟"

سٹور کے اندر بے شمار لوگ خریداری کر رہے تھے۔ خواتین مشورے دے رہی تھیں اور مرد خریداری کر رہے تھے۔ اکیلی خواتین بھی تھیں جو سیلز گرلز کے ساتھ نہایت سنجیدگی سے مصروف گفتگو تھیں اور ان کے کہنے پر کچھ مرکبات وغیرہ پسند کر رہی تھیں۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چینیوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ زیادہ کام اور جنسی سرگرمیاں انسان کے بدن کو نقصان پہنچاتی ہیں اور یوں زندگی کم ہو جاتی ہے۔ ان نقصانات سے بچنے کے لیے چینی صبح کی سیر کرتے ہیں۔ ورزش کرتے ہیں اور جنس صفر۔۔۔ وہیل کے گوشت، چھپکلیوں کے اچار، ہرن کے سینگوں کے گودے وغیرہ کے استعمال سے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طور شیر کا گوشت بھی قوتِ مردمی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ گینڈے کے سینگ ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور بندر کا بھیجہ ذہانت اور ایستادگی کے لیے نہایت کارآمد ہے۔

دیو سائی کے ٹریک کے دوران اس سطح مرتفع پر رہائش پذیر چند ریچھوں کی بقا کے لیے جو عملہ متعین تھا، انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ان ریچھوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ چینی بھائیوں کی جانب سے ہے جو ان کی چربی اور اعضائے مخصوصہ کو نہایت گراں قیمتوں پر خرید کر اپنے آپ کو توانا کرتے ہیں۔

"ڈرگ سٹور" کے اندر شوکیسوں میں وہیل مچھلی کے ڈھانچے، مارخور کے سینگ، ریچھوں کی چربی کے علاوہ متعدد مرتبان تھے جن میں چھپکلیوں، بچھوؤں اور سانپوں کے اچار وغیرہ تھے۔ یعنی چینی برادران نے اس فن کو جس کے زور پر ہماری حکمت اور حکیم زندہ ہیں یا لاہور کے فٹ پاتھوں پر داتا دربار اور نگار سینما کے باہر سلاجیت بیچنے والوں کہ ٹن ٹن کرے گا جیسے سکول کا گھنٹہ بجتا ہے اور سانڈے کا تیل فروخت کرنے والوں کے فن کو ہی ذرا ماڈرن اور معزز کر دیا ہے۔

اور وانگ لی نہ شرماتی تھی نہ جھجکتی تھی، بیان کرتی چلی جاتی تھی۔ "یہ ادویات استعمال کرنا چین کی ثقافت کا ایک حصہ ہیں۔ اگر آپ وٹامن کھا سکتے ہیں اپنے بدن کو مضبوط کرنے کے لیے تو یہ بھی زندگی کا ایک بہت لازمی حصہ ہیں۔ آپ کچھ خریدنا پسند کریں گے؟ آپ کی عمر کے لوگ تو بہت اشتیاق سے یہ مرکب خریدتے ہیں۔"

"لیکن مجھے کچھ تجربہ نہیں۔"

"آپ ان سیلز گرل کو بتا دیں کہ آپ کس قسم کے نتائج چاہتے ہیں تو وہ آپ کو مطلوبہ مرکب مہیا کر دیں گی۔" میں نے اپنی عمر کو اور اپنی بیگم کی بزرگی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ مشورہ ترک کر دیا۔۔۔ ویسے مجھے ان سٹورز میں فروخت کی جانے والی ادویات اور عرق جات کی برقی بیداری کا علم بہت دنوں بعد ہانگ چو جا کر ہوا لیکن یہ ایک اور کہانی ہے جو انتظار کر سکتی ہے۔ انتظار کے بعد بھی یہ بیان ہونہ ہو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

"وانگ لی۔ کیا ان چیزوں کا کوئی اثر ہوتا ہے؟"

وانگ لی کی منگول آنکھیں تقریباً بند ہو گئیں۔ سرشاری سے "کیوں نہیں وہ بہت بہتر ہو جاتا ہے۔"

"اب واللہ اعلم یہ "وہ" کون تھا۔

یہ عجیب بیجنگ تھا جس سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ شاید ان قدیم کشتوں کا ہی کرشمہ تھا کہ چین دنیا میں سب سے زیادہ آبادی والا ملک تھا۔"(۵۴)

"واپسی پر۔۔۔ اسی فٹ پاتھ پر۔۔۔ اس مقام پر۔۔۔ انہیں کھمبوں کے قریب۔۔۔ وہی سنانے میں لے جانے والی پُرکشش لمبی ٹانگوں والی خواتین کھڑی تھیں۔۔۔ اور میں حیران ہوا کہ کیا کل شب سے اب تک انہیں کوئی مزدوری نہیں ملی۔

"اب تو خوش ہو جاؤ" تتلی میرے کان کی لو کے ساتھ شرارت سے پھڑ پھڑائی۔ "تم اپنی من مرضی کرنا چاہتے تھے تو کر لو۔"

"اس عمر میں من مرضی سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔۔۔ بائی چانس کی گیم ہو جاتی ہے۔ اور یوں بھی یہ شغف میرا کبھی نہیں رہا۔"(۵۵)

ایک زمانہ تھا کہ سفرنامے سنجیدہ اور سپاٹ ہوتے تھے، پھر مزاح کی آمیزش شروع ہو گئی جس نے تحریر کا رنگ چوکھا کر دیا۔ اب تقریباً ہر سفرنامہ نگار نے یہ چلن اختیار کر لیا ہے کہ تحریر کو

چٹخارے دار بنایا جائے۔ شاید سفرنامہ نگار قاری کی نفسیات کو سمجھ گیا ہے کہ چٹپٹے کھانوں کی چٹپٹی تحریریں بھی پسند کرتا ہے اور مستنصر ہمیں اس میدان میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ان کا ہاتھ قاری کی نبض پر ہوتا ہے اور ذہن اس کی نفسیات کو پڑھ رہا ہوتا ہے۔ چلبلاہٹ، شوخی، شرارت، جملے بازی سے وہ قاری کے ہمدرد اور غمگسار بن جاتے ہیں ان کی یہی خوبی ان کی پوری سفرنامہ نگاری پر حاوی ہے۔ ان کے اکثر صفحات پر طنز اور خصوصاً مزاح اور شگفتگی کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ وہ ہر جگہ اور ہر بات میں خوش طبعی و زندہ دلی کا پہلو نکالنے کے فن سے واقف ہیں۔ وہ ظرافت کے سہارے ہر مقصد اور ہر مشکل کو حل کر لیتے ہیں۔ وہ ترشے ہوئے فقروں اور ڈرامائی انداز سے عام اور خاص دونوں کو مسرور کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں ہنسانے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور بہت سے مقامات ایسے بھی آتے ہیں۔ جہاں قاری اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکتا۔ وہ تمام کمزوریاں جو ہم میں موجود ہیں لیکن ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ ہمہ وقت مستنصر کے سامنے رہتی ہیں۔ وہ اکثر اوقات ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں جس میں تجسس اور مزاح کی آمیزش ہوتی ہے۔ وہ بعض واقعات کو اپنے تخیل کے سہارے مزید رنگین اور دلچسپ بھی بنا دیتے ہیں لیکن ان کے بعض واقعات میں تکرار کا عنصر شامل نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ جب کسی مقام پر جاتے ہیں اور وہاں انہیں رہنے کے لیے جگہ نہیں ملتی تو وہ ٹائلٹ یا باتھ روم کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اکثر مقامات پر مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مزاح شاید جنس ہی کا مرہونِ منت ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"پہلے مرد حضرات نے کپڑے بدلے اور بستروں میں گھس کر بدبودار کمبل آنکھوں پر تان لئے۔ اس مردانہ باپردگی کے دوران خواتین نے بھی یہی عمل دُہرایا اور ذاتی یا اجتماعی طور پر دراز ہو گئیں۔ تینوں سویڈش لڑکیاں ایک ہی بستر میں گھسی ہوئی تھیں مگر ان کی چھ عدد نفیس ٹانگیں ایک انسان کیکڑے کی طرح کمبل سے باہر جھانک رہی تھیں۔ سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر کنڈی اُتار دی۔ ایک ترک دہقان جبڑے پچکائے ہنس رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"ٹائلٹ" اس نے ہمارے کمرے سے ملحقہ غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ میں راستے سے ہٹ گیا اور وہ بستروں کے درمیان میں سے انتہائی کاہلی سے چلتا، آنکھیں لڑکیوں پر سینکتا، دانت نکالتا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ فوراً ہی باہر نکل آیا اور پھر اُسی طور مٹر گشت کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں کنڈی چڑھا کر لیٹا ہی تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ اب ایک اور صاحب حماقت آمیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے "ٹائلٹ، ٹائلٹ" کر رہے تھے۔ وہ بھی آنکھیں دائیں بائیں گھماتے مغربی دوشیزاؤں کو بستروں میں دراز دیکھتے مسکراتے ہوئے غسل خانے میں گھس گئے فوراً ہی واپس آ گئے اور لڑکیوں کو جھک جھک کر گڈ مارننگ کہتے دوسرے کمرے میں چلے گئے پھر ایک اور دستک ہوئی۔ مشتاقانِ ٹائلٹ کا تانتا بندھ گیا۔ بالآخر فرانسیسی ہنری کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے تازہ ملاقاتی کو پہچان لیا تھا کہ وہ تیسری مرتبہ ٹائلٹ کی آرزو لے کر حاضر ہوا ہے۔ "یہ جنس زدہ ترک صرف ہماری لڑکیوں کو تاڑنے کے لیے آتے ہیں مت کھولو دروازہ۔" --- "ان بلڈی مسافروں میں سے ہر ایک تین تین مرتبہ ٹائلٹ جا چکا ہے۔" سائمن نے ایک زہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "اور ہاں ---" خلیلی بولا۔ "آپ حضرات یوں بغلگیر ہو کر نہ سوئیں، میرے مسافروں کو اعتراض ہے۔"

"یہ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔" ہنری غصے سے لرزنے لگا۔

"بیشتر مسافر جوان جہاں ہیں اور خواتین کی ٹانگیں ---" ---

معاہدے کے مطابق ایک مسافر آگے آتا اور افیمیوں کی طرح بستروں کے درمیان سُستی سے چلتا ٹائلٹ میں گھس جاتا۔ کئی حضرات ٹائلٹ کے دروازے کو ہاتھ لگا کر یوں اداکاری کرتے کہ او ہو ضرورت ہی نہیں تھی ایسے ہی آ گئے اور واپس چلے جاتے لیکن اس مرتبہ انہیں صرف لڑکے ہی دیکھنے کو ملے کیونکہ خواتین حفاظتی اقدام کے تحت کمبلوں میں رُوپوش تھیں البتہ سویڈش لڑکیاں اپنی لمبی ٹانگوں کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ ان کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ جب آخری امید وار واپس جا رہا تھا تو ہنری بستر پر کھڑا ہو کر خلیلی سے کہنے لگا "اب اگر کوئی --- ترک ادھر آیا تو" اُس نے مکّہ لہرا کر ایک فحش اشارہ کیا۔ "میں کیا کر دوں گا۔" (۵۶)

"سونے کا کیا انتظام ہے؟"

"تمہارے حصے میں غسل خانہ آیا ہے۔ بلتن کا غسل خانہ ہے پیارے، ہم لوگ یہیں قالین پر گزارا کر لیں گے۔" اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

غسل خانے کا ٹب میرے سونے کے تھیلے اور دو تکیوں کی مدد سے اچھا

خاصا بستر بن گیا۔ "رات آرام سے کٹے گی۔" میں نے سوچا "بشرطیکہ سوتے میں پاؤں پانی کے نل کی ٹونٹی پر نہ جا پڑے تو!" میں نے دروازہ بند کر کے روشنی گل کر دی اور اپنے خمدار بستر پر لیٹ گیا۔ مانگ کے بے ہنگم قہقہوں اور "بطخوں" کی متواتر قیں قیں کے باوجود میں جلد ہی سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی "اندر آ جائیں" میں نے اونگھتے ہوئے کہا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ میں کسی کمرے کی بجائے غسل میں سو رہا ہوں اور دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں جمائیاں لیتا ہوا اُٹھا اور دروازے کی چٹخنی کھینچ دی۔ باہر ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی میں تونکہ کھڑی تھی۔ نائلون کے باریک شب خوابی کے لباس میں وہ بالکل بیخ نہیں لگ رہی تھی۔

"میں اندر آنا چاہتی ہوں" اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، بالکل۔ ضرور۔" میں نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ میری آنکھوں سے نیند بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اُٹھا کر اس طرح انگڑائی لی جیسے وہ بھنگڑا ڈالنے کے موڈ میں ہو۔ ہاتھ نیچے کرنے سے اُس کا لباس کندھے سے ڈھلک گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا اور پھر اُسے بیوقوفوں کی طرح تکنے لگا۔

"تم باہر آؤ تو ہی میں اندر جا سکتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑے پیار سے مجھے باہر دھکیل کر غسل خانے کی کنڈی چڑھا لی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری خواب گاہ میں بہتوں کی اور بہت سی "حاجتیں" پوری ہو سکتی ہیں مگر کم از کم رومان ان میں شامل نہیں۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے میں پانی بہنے کی آواز آئی اور پھر تونکہ اپنا لباس درست کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ "مخل ہونے کی معافی چاہتی ہوں۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا اور واپس جا کر قالین پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ میں اپنی خواب گاہ میں واپس آیا تو لیٹنے کی بجائے سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ ہر لحظہ یہی دھڑکا لگا رہتا کہ ابھی چار باقی ہیں۔

صبح ہوئی تو میں نے ٹب میں سے اپنا بستر سمیٹا اور پھر اس میں گرم پانی بھر کر غسل کیا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو لوگ تولیے اور دانتوں کے برش ہاتھ میں لیے قطار باندھے کھڑے تھے سب کو فراغت ہو چکی تو مانگ نے ہر ایک سے دس مارک چندہ

وصول کیا اور نیچے بل ادا کرنے چلا گیا۔ اس کے بعد چال میں خود اعتمادی اور لفٹ بوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا عمل شروع ہوا اور ہم آدھ گھنٹے میں مانگ کی کار میں پہنچ چکے تھے۔۔۔ اس لیے مغربی جرمنی میں داخل ہونے پر مانگ نے مجھے اُتار دیا۔ وہ حسب وعدہ خواتین کو واپس فرینکفورٹ لیے جا رہا تھا اور یوں ایک ایسے سفر کا اختتام ہوا جس کی یادوں میں خبطی مانگ کے بے ہنگم قہقہے، ریمبرانت کی تصویر، "بطخوں" کی رفاقت، ہلٹن ہوٹل میں قیام اور چڑیا گھر کے بندر شامل تھے۔" (۵۷)

یہ چٹخارے دار، شریر جملے دیکھیے ان میں بھی جنس کے ذریعے مزاح پیدا کیا گیا ہے:

"یہاں میں نے "جرمن" کو ایک مرتبہ پھر دیکھا۔ وہ ایک اطالوی سیاح خاتون کے ہمراہ تھا۔ خاتون پر بالائی بوجھ بہت تھا۔ جرمن نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پھر اس بوجھ کی طرف دیکھا۔" (۵۸)

"پھر ایک طویل فلم دکھائی گئی۔۔۔ اُسے دیکھ کر سویڈش مردوں نے کرسیوں کو تھاما اور خواتین نے اپنے سینوں کو۔" (۵۹)

مستنصر کے سفرناموں میں ایسے رچے ہوئے مزاح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ چوٹ کھا کر بھی بدمزہ ہونے نہیں دیتیں۔ پیشانی پر بل نہیں پڑتے بلکہ کہیں کہیں سوچ کی گہری لکیریں اُبھر آتی ہیں۔ مستنصر کے ہاں مکالموں کی شکل میں حاضر جوابی سے بھی مزاح کا ایک انداز ملتا ہے۔ وہ بعض اوقات خیال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مستنصر عموماً صورتِ واقعہ سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر کو شگفتہ بنانے کے لیے اس حربے سے بھرپور کام لیا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں انہوں نے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے جنس کے ہتھیار سے بخوبی کام لیا ہے اگرچہ انہوں نے کہیں کہیں فلسفے کا تڑکا بھی لگایا ہے:

"وہ دونوں مصروف رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہنی مون میں بڑی مصروفیت رہتی ہے۔ کمرے سے باہر نہیں نکلتے لیکن وہ آپ سے ملاقات کے لیے نکل آئے ہیں۔ بُلا لوں؟"

۔۔۔ اچھی پنجابی شکل والا گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے اور مدھر سیاہ کشش آنکھوں والا اور اس کے پہلو میں کرن۔۔۔ جو ایک ٹی شرٹ اور جین میں تھی اور میز پر رکھے اپنے راج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اُسے دبا تی تھی اور وہ دونوں مسکراتے ہوئے اور محبت بھری نظروں سے ہماری جانب دیکھتے تھے۔۔۔ "اوئے آ جاؤ" سردار جی دوپٹے

والے نے نعرہ لگایا۔ وہ دونوں تھکن کے ساتھ اُٹھے جو نو بیاہتا جوڑوں کے بدن کو خوشی دیتی ہے اور ذرا جھجکتے ہوئے ہماری ٹیبل پر آ گئے۔۔۔ کرن اُس کی ہم عمر لگتی تھی اور وہ ایک اُبلتی ہوئی اور اپنے خاوند کے بدن کی باس لئے سلگتی تھی اور اُس اتنی موٹی دھند میں تھی جس میں کچھ بھی اور کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ جوانی کی نوخیزی میں، بخار بدنوں والے اور ابھی جذبوں کے نقشوں پر اپنی اپنی آسودگی اور محبت کے شہر دریافت کرنے والے جوڑے مجھے ہمیشہ خوش کر دیتے ہیں کیونکہ بعد میں تو یہ نقشے ازبر ہو جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی بھید نہیں رہتا۔ اور آپ آنکھیں بند کر کے جذبوں کی اُن جھیلوں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں آب و ہوا گرم مرطوب ہوتی ہے۔ راج اور کرن ابھی ایک دوسرے کی کائنات کے اور بدن کے بھیدوں کے وہ کھوجی تھے جو تجربے کی تکنیک سے ایک دوسرے کو دریافت نہیں کرتے تھے بلکہ بھٹکتے ہوئے انجانے میں کسی ایسی منزل پر پہنچ جاتے تھے جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوتی تھی۔ جذبوں کے نقشے جب ازبر ہو جائیں اور ردِ عمل طے شدہ اور معلوم ہو تو انسان محبوب سے ایک مشین میں بدل جاتا ہے۔ جیسے ایک اجنبی بستی میں کشش اور جذبے کا تناؤ صرف تب تک رہتا ہے جب تک آپ اُس کے گلی کوچوں کے بارے میں یہ نہیں جانتے کہ یہ گلی کہاں پر جا کر ختم ہو گی اور اس کوچے کے اختتام پر کیا ہے۔ جہاں اجنبیت ختم ہوتی ہے وہاں سے جذبے سرد ہونے لگتے ہیں۔"(۶۰)

"میں کابل کی "چکن مارکیٹ" میں کسی ایسی ہی سیاح خاتون کے ساتھ فلرٹ کر سکتا تھا جو نوادرات کی کسی دوکان پر کسی ازبک دیہاتن کی سو برس پرانی ماند پڑتے ہوئے سنہری تلے سے مزین ایک چولی کو اپنے بدن کے بالائی حصے پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے کہتی تھی "یہ افغان خواتین۔۔۔ وے آر بگ۔۔۔ یہ تو مجھے پوری نہیں آتی۔"(۶۱)

"سیاح۔۔۔ کچھ غیر ملکی۔۔۔ زیادہ تر ملکی۔۔۔ جن میں سے بیشتر کافر حسیناؤں کے حسن کے فریب میں مبتلا۔۔۔ ان کے "آسان" ہونے کی افواہیں سن کر ادھر آئے تھے۔ خوب رونق تھی۔ پرانی ساخت کے نیم تاریک چوبی ہوٹلوں میں جو چہرے نظر آتے تھے وہ کچھ نشئی لگتے تھے۔ یہ غیر ملکی سیاح ان سستے ہوٹلوں میں مہینوں پڑے رہتے تھے اور "واقعی" پڑے رہتے تھے کہ انہیں یہاں چترال کی بین الاقوامی شہرت یافتہ چرس وہیں پڑے پڑے مل جاتی تھی۔ ان ہوٹلوں میں برادر پاکستانی بھی تھے جن کی

آنکھیں صرف کالاش کی لڑکیوں کو تلاش کرتی تھیں اور وہ ان آنکھوں کو ان پر رکھ کر سینکتے تھے اور باری باری سینکتے تھے چنانچہ جو جل اٹھتی تھی تو دوسری آنکھ بدلتے تھے۔"(۶۲)

کبھی کبھار مزاح کے لیے لطیفے کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ ان کے بعض بیان کیے ہوئے لطیفے بہت عامیانہ اور کھلے ڈلے ہوتے ہیں اور ان سے جنسیت ٹپک رہی ہوتی ہے۔ ان میں رمزیت کا عنصر بہت کم شامل ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے بیان کیے ہوئے کچھ لطائف کبھی کبھی فحاشی کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان سے مزاح پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ لطیفہ دیکھیے:

"میں نے ٹونی کی خوش پوشاکی سے متاثر ہو کر اسے اس حبشی کے بارے میں بتایا جو لندن کی کسی گلی میں ننگ دھڑنگ گھوم رہا تھا۔ ایک انگریز بڑھیا نے اسے اس حالت میں دیکھا تو ڈانٹ کر کہنے لگی۔ "نوجوان لڑکے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیب تن کر کے آؤ۔" حبشی نے نہایت برخورداری سے سر ہلایا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے اپنے گلے میں ایک نہایت نفیس قسم کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ صرف ٹائی۔۔۔!"(۶۳)

رسم و رواج، روایات اور معاشرت کی عکاسی سفرنامے کے لوازم میں سے ایک ہے اس سفرنامے کو ادھورا قرار دیا جائے گا جس میں تہذیب و تمدن، عادات، مزاج اور رہن سہن کا بیان نہ ہو گا۔ مستنصر نے اپنے سفرناموں میں اس نکتے کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے، اس معاشرے کو جس انداز سے دیکھا، پیش کر دیا۔ مستنصر جس ملک میں بھی گئے ہیں انہوں نے وہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور ان کے ماحول کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہاں کے لوگوں کے سماجی رویوں کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کی تحریر سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ اس طرح جب وہ خصوصاً یورپ کی تہذیب اور روایات کی عکاسی کرتے ہیں تو انہیں اس کو بیان کرنے کے لیے جنس کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ وہاں کی مادر پدر آزادی کو بیان کرنے کے لیے جنس کا بیان ضروری ہے۔ اس طرح ان کے ہاں جنس نگاری کی صرف عمومی سطح ہی نہیں بلکہ خاص علمی و ادبی سطحیں بھی جا بجا ملتی ہیں گویا ان کی تحریر میں جنس نگاری محض تلذذ کے لیے ہی نہیں اعلیٰ حقائق کی تمثیل کے لیے بھی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"ہفتے میں ایک شب اس کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر والدین قہوہ خانوں سے باہر فٹ پاتھ پر

بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر کافی یا شراب سے دل بہلاتے ہیں اور ان کے چھیتے اور چہیتیاں قسمت آزمائی کے لیے سڑک پر مٹر گشت کرتے ہیں۔ بائیں جانب لڑکوں کے غول کے غول شام کے بہترین لباسوں میں نکھرے، مسکراتے، آنکھیں گھماتے چلے آ رہے ہیں اور دوسری طرف قصبے کی کنواری لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتیں "آنکھیں بائیں" کے فوجی اُصول پر عمل پیرا لہک لہک کر چل رہی ہیں۔ پوری مخلوق میں سے ایک زہرہ جبیں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ آپس میں مشورے ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ نظارہ صرف دور دور سے کیا جاسکتا ہے۔ پاس آئیے گا تو کرسیوں پر براجمان خواتین کے والدین آپ کے خلاف فاؤل دے کر میدان سے باہر نکال دیں گے۔ حسینوں کی اس پریڈ میں اگر آپ کوئی خاتون بھلی لگے اور وہ بھی آپ کے قریب سے گزرتے وقت اک شانِ دلبرائی سے بالوں میں لگا پھول اتار کر سونگھنا شروع کر دے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ دوسری شب گٹار کاندھے پر ڈالے پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں تھامے ان محترمہ کی بالکونی تلے کھڑے ہو کر "موشے میو" قسم کا گانا گائیں۔ لڑکی کو آپ کا گانا اور اس کے والدین کو آپ کا گلدستہ پسند آ جائے تو آپ کو گھر کے اندر بلا لیا جائے گا۔ ذریعہ معاش، تعلیم اور خاندان کے مکمل کوائف دریافت کرنے کے بعد آپ کو مطلع کیا جائے گا کہ برخوردار کل اپنی اماں کو ہمارے گھر بھیج دینا یا پھر دوسری صورت میں "خبردار جو آئندہ ہماری لڑکی کو۔۔۔" وغیرہ۔

پاسیو کی ایک لطیف روایت یہ بھی ہے کہ قصبے کی تمام لڑکیاں سڑک پر ہونے والی پریڈ میں شریک نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے نسبتاً شرمیلی خواتین اردگرد کے مکانوں کی بالکونیوں پر بچ بن کر براجمان ہو جاتی ہیں۔ ان بالکونیوں کے آگے کسی ایک رنگ کا ریشمی کپڑا لٹکا دیا جاتا ہے۔ سلاخوں سے اسی رنگ کی دیدہ زیب جھنڈیاں اور فیتے بندھے ہوتے ہیں۔ پیدل چلنے والی خواتین تو اشاروں کنایوں میں اپنا مدعا بیان کر لیتی ہیں یا پھر وہ سر میں لگا چنبیلی کا پھول بھی اس کام آتا ہے مگر بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی خواتین اپنی پسند کا اظہار بالکل انوکھے اور مختلف طریقے سے کرتی ہیں۔ ان کے پاس کاغذ کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گیند ہوتے ہیں جن کے ساتھ تقریباً دو گز لمبے دو تین پتلے کاغذ کے فیتے چپکے ہوتے ہیں۔ ان فیتوں کا رنگ وہی ہوگا جو بالکونی سے لٹکنے والے کپڑے اور جھنڈیوں کا ہوتا ہے۔ ادھر نگہہ انتخاب کسی خوش قسمت

پر ٹھہری اور ادھر اس شرمیلی بی بی نے بالکونی سے جھک کر ایک عدد گیند تاک کر دے مارا۔ گیند کے درمیان ایک اُبھری ہوئی چھوٹی سی ون لڑکے کے لباس میں اٹک جاتی ہے اور وہ اس کے پیچھے لہراتے ہوئے فیتوں کا رنگ دیکھ کر جان جاتا ہے کہ جانِ جاں کس بالکونی میں تشریف فرما ہے۔" (۶۴)

"شادی کی رسم بے حد عجیب و غریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکی جوان ہونے پر اپنے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رکھتی ہے۔ اس کا محبوب بظاہر چوری چھپے رات کو کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آ جاتا ہے اور شب بسری کے بعد صبح سویرے اُس راستے واپس چلا جاتا ہے۔ اگر معینہ مدت کے بعد لڑکی کا پاؤں بھاری ہو جائے تو والدین دونوں کی شادی کر دیتے ہیں ورنہ لڑکی کے لیے عشق کے امتحاں اور بھی ہوتے ہیں۔" (۶۵)

شان: یہ آپ۔۔۔ یہ لوگ روزانہ ڈانس کرتے ہیں۔

ارمان: ہاں صاحب۔ پر یہ ویسا ڈانس نہیں ہوتا جیسا ادھر آپ کی طرف ہوتا ہے۔

یہ تو دن بھر کی تھکاوٹ اتارنے کے لیے اپنی خوشی سے کرتے ہیں صاحب۔۔۔ مرد لوگ ساتھ ساتھ گاتے ہیں اور ڈھول بجاتے ہیں۔۔۔ آپ دیکھو گے صاحب۔۔۔؟

(شان اُٹھتا ہے اور دونوں خیمے سے پرے ہو جاتے ہیں۔ ارمان کے ہاتھ میں ایک لالٹین ہے۔ جس سے وہ راستہ دکھاتا ہے۔ چڑھائی ہے۔۔۔ اور ڈھول کی آواز اور خواتین کی چیخوں کی آواز قریب آتی جاتی ہے۔ پھر گاؤں آتا ہے۔ جس کے باہر ایک کھلی جگہ پر رقص ہو رہا ہے۔ کالاش مرد ایک گھیرا بنائے گا رہے ہیں چند ٹورسٹ بھی بیٹھے ہیں۔ یہاں روشنی بہت کم ہے۔ نیم تاریکی ہے۔ ڈھول کی آواز۔۔۔ بنسری کی لے اور رقاص خواتین "او۔۔۔ او۔۔۔ او" کی دُھن۔۔۔ شان بالکل مسحور ہو چکا ہے اور اس سارے منظر کو دیکھ رہا ہے، جو کسی کتاب کا لگتا ہے۔ یہاں پہلی بار ہم سیریل کی مرکزی کردار کالاش لڑکی کو ایک دروازے کی اوٹ میں دکھاتے ہیں۔ وہ شان کو دیکھ رہی ہے۔ شان اُس کی موجودگی سے لاعلم ہے۔ یہاں پر ذرا دور اندھیرے میں مینڈک والے نقاب کو بھی دکھایا جاتا ہے جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ رقص کے مختلف پوز۔۔۔ لوگوں کے کلوز۔ خوشی اور مسرت۔۔۔ کچھ لوگ شان سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ وہ لڑکی مختلف جگہوں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور بالآخر نیچے اُترتی ہے اور رقص کرنے والی لڑکیوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ بار بار مڑ کر شان کو دیکھتی ہے اور شان بھی محسوس کر رہا ہے کہ ایک خاص لڑکی اُسے

خاص طور پر دیکھ رہی ہے۔ دونوں کے کلوز۔۔۔ یکدم ایک مینڈک کی چھلانگ لگا کر شان کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور یہاں پر منظر جامد کر دیا جاتا ہے۔"(۶۶)

مستنصر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ غیر محسوس انداز میں کرداروں یا واقعات کے ذریعے قومی کمزوریوں اور معاشرتی برائیوں کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے بلیغ جملے غیر محسوس انداز میں ہماری سماجی برائیوں کی عکاسی کرتے ہیں کہ ہم کس قدر کاہل اور بے حس ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے سفرنامے "رتی گلی" میں جھیل سیف الملوک کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے ایک طوائف قرار دیتے ہوئے صاحب اقتدار اور سیاحت اور ثقافت کے وزیروں پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہیں۔ وہ جھیل سیف الملوک کو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسی دوشیزہ کی مانند ہے جس کی اجتماعی بے حرمتی ہوئی ہو حالانکہ پہلے یہ جھیل صاف ستھری اور بے داغ تھی۔ اب دولت کے لالچ نے اس پریوں کی جھیل کو برباد کر دیا ہے۔ اس سے ہمارے لوگوں کی بے حسی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مستنصر کا اسلوب اپنے اندر رومانوی رنگ سموئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے وسیلہ اظہار کے لیے تشبیہ و استعارہ کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ وہ اپنے سفرناموں میں اپنے تجربات، مشاہدات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہیں کہیں اپنی بات کے اظہار کے سلسلے میں طوائفوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے جنس نگاری کا سہارا لیتے ہیں تا کہ قاری معلومات کے حاصل کرنے کے ساتھ حظ بھی اٹھا سکے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"پھر کہیں سے ایک مقامی فنکار نمودار ہو گیا اور اس نے گیس کی روشنی میں ہمیں کچھ لوک گیت سنائے جو اس جھیل کی شان میں تھے جو نظر نہ آتی تھی۔ جھیل اگر نظر آ ہی جاتی تو پلو چہرے پر کھینچے ایک ایسی دوشیزہ کی مانند شرمسار جس کی اجتماعی بے حرمتی ہو چکی ہو ایسے نظر آتی۔۔۔ اور اسے مقامی سیاستدانوں، ضلعی حکام اور مرکز میں بیٹھے ہوئے سیاحت اور ثقافت کے وزیروں نے ہی تو بے حُرمت کیا تھا۔ وہ اندھے تو نہ تھے کہ دیکھ نہ سکتے تھے کہ اس پریوں کی جھیل کو کیسے برباد کیا جا رہا ہے۔ ہاں وہ اندھے ہو چکے تھے۔ اُس دولت کے لالچ میں جو اس جھیل کی عصمت دری کے نتیجے میں ان تک پہنچتی تھی انہوں نے جو صاحب اقتدار ہیں اس جھیل کو ایک طوائف بنا دیا ہے تو کیا انہوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو بھی ایسا نہیں کر دیا کہ یہ جھیل بھی تو کبھی اتنی ہی پوتر اور بے داغ تھی۔

اگر میرا بس چلتا تو میں اُن کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ

درج کروا دیتا صد شکر کہ میں دن کی روشنی میں یہاں نہیں آیا۔"(۶۷)

"یہ گھنے بالوں اور نرم کھال کا خرگوش ایسا تھا کہ اسے آغوش میں لے کر بھینچنے کو جی چاہتا تھا۔۔۔ جیسے سمور کی کھال کے کوٹ میں ملبوس کرسمس کی شام میں برفباری کے دوران ایک لڑکی کو گلے لگانے کو جی چاہتا ہے۔"(۶۸)

"میں نے ایسا عشق صرف حسین طوائفوں کے سارنگی نوازوں یا طبلہ بجانے والوں میں دیکھا ہے جو اپنی بائی کی محبت میں دائم رہتے ہیں اور اپنی زندگی اس آس میں گزار دیتے ہیں کہ جب اس کی عمر ڈھلے گی تو یہ ادھیڑ عمر عاشق اور دولت والے اسے چھوڑ دیں گے تب شاید یہ پیچھے مڑ کر میری طرف اک نگاہ کرے۔"(۶۹)

وہ ایک مقام پر اپنی نوجوانی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے جذبات پر تبصرہ کچھ یوں کرتے ہیں:

"ہم بہت معصوم اور بے خبر تھے۔ لاہور میں تو تھے ہی لیکن کسی نا معلوم کاغان وادی میں گھرے نادان سے کہیں بڑھ کر معصوم اور بے خبر تھے اور نوجوانی کے اوائل میں تھے۔ جب ہم مکمل طور پر برقعہ پوش لڑکی کا ایک ٹخنہ نظر آنے پر اُس پر عاشق ہو جاتے تھے اور خودکشی پر مائل ہو جاتے تھے۔"(۷۰)

مستنصر ایک رنگین مزاج اور زندہ دل آدمی ہیں۔ اس بات کا ثبوت ان کے سفرناموں سے بھی ملتا ہے۔ ان کے سفرناموں میں نوجوان لڑکیوں کا ذکر اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ اس طرح اُنہوں نے اپنے سفرناموں میں خوبصورتی اور رعنائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے سفرناموں میں یہ شوخ رنگ رومانی تصویریں لیے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید مستنصر کے بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کا شمار ایسے سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے پُر کیف مناظر اور ان دیکھی دنیاؤں کے قابل دید مشاہدات سے خواب و خیال کو جگایا اور سفرنامے کو ایک ایسی اوڈیسی بنا دیا جس میں سیاح لمحات گزراں کی ہر لرزش اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اور لرزشِ خفی سے نہ صرف ماحول کو منکشف کرتا ہے بلکہ آپ کو اس نئی دنیا کا باسی بھی بنا دیتا ہے۔۔۔ مستنصر شاید اُردو کا واحد سفرنامہ نگار ہے۔ جس نے سفرنامے سے پہلی محبت پیدا کی۔۔۔ سفر اس کے لیے کو ندا کا آوازہ ہے اور وہ بوئے حیات کے اس مست بلاوے پر بے اختیار لپکتا چلا جاتا ہے۔ اس کا سفرنامہ زندگی کا مسلسل اور متحرک بیانیہ ہے اور وہ سفر میں تتلیوں، رنگوں اور پروں کو ہی نہیں پکڑتا

بلکہ جذبے کے جزرومد کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔"(۷۱)

مستنصر مناظرِ فطرت سے ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ نسوانی حسن کی خوشبو ان کی رگ و پے میں بس جاتی ہے۔ جہاں کہیں خوبصورت عورت کا ذکر آتا ہے مستنصر عالم مدہوشی میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر اس حُسن کی منظر کشی اس خوبصورت پیرائے میں کرتے ہیں کہ اس عالم میں ان کے ہاں حسن کی تعریف میں کمال کے نثر پارے وجود میں آتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں خواتین کا ذکر اکثر جگہوں پر ملتا ہے وہ شدید سردی کے بیان میں بھی کسی نہ کسی خوش شکل خاتون کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور کے ٹو کی بلندی پر بھی وہ نجانے عشق کرنے کے لیے خوبصورت لڑکی کو کیسے تلاش کر لیتے ہیں۔ بہر حال دوران مطالعہ قاری اس طرح نہ صرف اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ مستنصر بعض اوقات اس خاتون کی ایسی سراپا نگاری اور مدح سرائی کرتے ہیں کہ قاری سفرنامے کو بھول کر اس خاتون کے حسن اور اداؤں میں گم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں دلچسپ واقعات کے ذریعے خوبصورت خواتین کا ذکر کیا گیا ہے:

"ان میں سے ایک خاتون بہت اچھی اور دل رُبا قسم کی شکل والی تھی چنانچہ جب وہ گزر گئی تو میں نے خاص طور پر مڑ کر اسے کچھ دیر کے لیے دیکھا اور اچھا محسوس کیا۔ آپ بے شک دنیا کے عظیم ترین اور سب سے حسین منظر میں کھڑے ہوں انسانی حسن کا ذرا سا لشکارا آپ کو ہر شے سے غافل کر دیتا ہے لیکن میں زیادہ دیر کے لیے غافل نہیں ہوا اور پھر چلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے سوچا کہ پھر غافل ہوا جائے اور مُڑ کر اس راستے کو دیکھا جس پر وہ خاتون ٹریکر چلی جا رہی تھی۔"(۷۲)

"اسی لمحے ان کمروں میں سے جنہیں احسان تانگا پربت ٹورسٹ کاٹج روپل ترشنگ کا نام دیتا تھا۔ ایک خوش شکل اور مناسب مقامات پر بھری بھری خاتون باہر نکلی۔ اس کے کاندھے پر ایک چھوٹا سا تولیہ تھا اور ہاتھ میں برش جس پر ٹوتھ پیسٹ کو وہ سنبھالتی چلی آتی تھی۔ اس نے ہماری طرف ذرا ناراض نظروں سے دیکھا اور پھر اسی دو تین فٹ چوڑی ندی کے کنارے بیٹھ کر دانت صاف کرنے لگی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ پہلے اس نے ندی پر جھک کر منہ دھونے کی کوشش کی اور جہاں تھی وہیں سن ہو کر رہ گئی کہ پانی بالکل برف تھا پھر اس نے منہ دھونے کا ایک طریقہ نکالا۔ وہ ایک ہاتھ سے منہ پر چھینٹا مارتی اور فوراً دوسرے ہاتھ میں تھامے تولیے سے منہ پونچھ لیتی تاکہ برفیلا پانی زیادہ دیر چہرے پر رہ کر اسے برف نہ بنائے۔ اس منظر کو دیکھ کر ہم نے

اپنے آپ کو کچھ بے گھر اور مسکین سا محسوس کیا۔"(۷۳)

مستنصر کے ہاں جنس نگاری کا ایک انوکھا طریقہ یہ ملتا ہے کہ وہ تخیل کے ذریعے بھی حظ اٹھاتے ہیں۔ وہ جس خوبصورت خاتون کو چاہتے ہیں اس سے اپنے تخیل کے ذریعے اور اس کی مختلف اشیاء سے محظوظ ہوتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اس عمل کو "جنسی علامت پرستی" کہتے ہیں۔ اس میں فرد جسمانی علامات کے علاوہ دوسری اشیاء سے بھی حظ اٹھاتا ہے جیسے انڈر ویئر چولی یا جوتے وغیرہ۔ جنسی علامت پرستی میں نفسیاتی خواہش عورتوں کے لباس یا اعضاء پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس نوع کے لوگ عورتوں کے زیر جاموں، چولیوں اور جوتوں وغیرہ کو چرا کر انہیں سینت سینت کر رکھتے ہیں اور یوں انہیں دیکھ دیکھ کر یا سونگھ سونگھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ عموماً جنسی علامات کو جنسی عمل کا بدل سمجھتے ہیں۔ جنسی علامات کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت میں آدمی کے لئے ماورائی (جسمانی علامات کے علاوہ) اشیاء ہوتی ہیں جیسے چمڑہ، ربڑ، انڈر ویئر اور جوتے وغیرہ دوسری صورت میں وہ کسی عورت کے جسم کے کسی حصے سے حظ اندوز ہوتا ہے مثال کے طور پر عورت کا سرین یا دونوں سرین ،دنیا کے بہت سے حصوں میں عورتوں کی چھاتیاں جنسی علامت نہیں ہوتیں یہ محض بچوں کو دودھ پلانے کا عضو ہوتی ہیں بہت سے ثقافتوں میں عورت کی پشت کو بہت زیادہ شہوت انگیز خیال کیا جاتا ہے۔ جنسی علامت پرستی کا شکار لوگ اپنی خیالی دنیاؤں میں گم رہتے ہیں اور وہ اکثر اپنی شخصیت کے اظہار میں ناکام رہتے ہیں۔ بسا اوقات یہی جنسی علامات مرد و عورت میں جنسی تحریک کا باعث بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہیں جنسی عوامل کے طور پر جنسی تحریک پیدا کرنے کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مستنصر کے ہاں بھی خال خال یہ رویہ نظر آتا ہے ان کے سفرنامے "نکلے تیری تلاش میں" میں خوبرو خاتون سنہری وانگ لی مستنصر کے ساتھ اپنا کمرہ تبدیل کر لیتی ہے۔ جب مستنصر اس کمرے میں جاتے ہیں تو اپنی ناکام حسرت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

"کمرے میں ابھی تک سنہری وانگ لی کے بدن پر چھڑکے گئے یوڈی کولون کی مہک موجود تھی۔ ٹھہری ہوئی تھی۔ باتھ روم میں اس کے میک اپ کے سامان اور زیر جامہ ملبوسات کی ایک بو تھی۔"(۷۴)

مستنصر بعض مقامات پر اپنے سفر ناموں میں تلذذ کے نقطہ نظر سے ہوس انگیز مناظر بھی بیان کرتے ہیں۔ بعض اوقات اپنی ذات کی نمائش کے لیے بھی ایسے مناظر کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہیں کہیں جملوں میں جنسی چٹخارے اور جنسی تپش سے اس کا رنگ اتنا تیز کر دیتے ہیں کہ اکثر صورتوں میں ایسے جملے پڑھنے اور سمجھنے کے دوران میں قاری کے کان سُرخ ہو جاتے ہیں۔

جنس نگاری کے اس رجحان کے بارے میں علی عباس جلالپوری کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''فحش تحریروں میں زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے ایک ایسے خیالی عالم میں پناہ لی جاتی ہے جس میں سوائے جنسی مواصلت کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور یہ وہ عالم ہے جس میں مرد عورتیں ہمہ وقت جنسی مواصلت میں غرق رہتے ہیں۔ یہ خیالی عالم وہ لوگ بساتے ہیں جو جنسی محرومی اور کمزوری کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی واماندگی اور کوتاہ ہمتی کی تلافی شہوانی خیال آرائی سے کرتے ہیں۔''(۷۵)

گویا صرف جنسی تلذذ کے نقطۂ نظر سے اپنی تحریروں میں زبردستی ہوس انگیز مناظر لا کر فن کار اپنے سفلی جذبات کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے جبکہ ایک حقیقی جنس نگار انتہائی غیر جذباتی انداز میں معروضی صورت حال کے پیشِ نظر جنس سے متعلق حقائق کو بیان کرتا ہے۔

مستنصر کے یہ چند اقتباسات دیکھیے جہاں انہوں نے تلذذ کے نقطۂ نظر سے جنس کا سہارا لیا ہے:

''میرے ساتھی ہمیشہ مجھے اس اشنانی عمل میں مصروف پا کر تشویش سے دیکھتے تھے کہ بابا جی اتنی سردی میں یوں پیرس کے کسی نائٹ کلب کی سٹرپ ٹیز ڈانسر کی مانند اپنا اوپر والا حصہ عریاں کر رہے ہیں تو انہیں ڈبل تو کیا ٹرپل نمونیا ابھی ابھی ہو جائے گا۔ لیکن میں باز نہ آتا تھا کہ یہ اشنان مجھے نیا نکور کر دیتا تھا اور میرا بدن کم از کم بالائی بدن کھنکنے لگتا تھا۔ زیریں بدن میں کھنکنے کی صلاحیت یوں بھی کم کم رہ گئی تھی۔''(۷۶)

''اگرچہ وہ بونے سے قد کی تھی لیکن اس کا بدن نہایت کسا ہوا بلکہ۔۔۔ جب چلتی تھی تو جیسے ہوا میں چلتی تھی۔۔۔ وہ میرا سگریٹ سلگا کر پھر مجھ سے غافل ہو گئی۔۔۔ میں ہوں اور سنہری وانگ لی ہے۔۔۔ میری نیلی شرٹ اور اس کا نیوی بلیو فراک ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں اور اس کے سنہری چہرے پر وہی چمکیلی دھوپ نما مسکراہٹ ہے جو پیکنگ کی ایک پنچھی کے لبوں پر ہوتی ہے۔''(۷۷)

''اس کا لباس بدل چکا تھا۔ وہ ایک مونگیا رنگ کے ریشمی اور نہایت چینی انداز کے گاؤن میں تھی جو اس کا بدن بھی تھا اور لباس بھی۔ اس کے بونے سے قد میں کونپلیں پھوٹتی تھیں اور زور کرتی تھیں۔ وہی خاص خوشبو جو میرے کمرے میں اس کے پہناووں کے مختصر قیام سے ٹھہری ہوئی تھی، اب اس کے چینی گاؤن کے نصف

بازوؤں کے اندر سے مہکتی آتی تھی۔''(۷۸)

مستنصر اپنے سفرناموں میں بعض مقامات پر ڈان یو آن بننے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ ایسے مقامات کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں کہیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سفرنامہ نگار نے ایسے واقعات کو بیان کرنے کے لیے سفرنامہ لکھنے کا جتن کیا ہے۔ مستنصر کی جنس نگاری ایک طرح کا ابنارمل رویہ معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے سفرناموں میں ذہنی عیاشی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اس طرزِ عمل یا طرزِ نگارش میں فرد بظاہر احساسِ برتری کے تحت نمائش پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن ہر طرح کے احساسِ برتری کے عقب میں دراصل احساسِ کمتری ہی کارفرما ہوتا ہے۔ مستنصر کو بھی یہی عارضہ لاحق ہے۔ مستنصر کے ہاں دوشیزاؤں کی کثرت نظر آتی ہے۔ کے۔ ٹو کی برفیلی چوٹیاں ہوں یا اندلس کے حسین باغات، پیرس کی گلیاں ہوں یا پیکنگ کے بازار ہر جگہ دوشیزائیں ان کا سواگت کرنے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہیں۔ سچ ہے: خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔

مستنصر کے سفرناموں میں جا بجا ایسے کردار ملتے ہیں جو جنسی نا آسودگی کا شکار ہیں اور بعض اوقات وہ کردار سفرنامہ نگار کو ''دعوتِ عمل'' بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی بہتات بعض اوقات قاری کو یہ بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کرداروں کی یہ جنسی بھوک کہیں سفرنامہ نگار کی اپنی ذاتی جنسی نا آسودگی تو نہیں جس کو وہ اوروں سے منسوب کر کے خود کو پارسا بھی ثابت کر جاتا ہے اور صاف چھپتے بھی نہیں کے مصداق باتوں باتوں میں اس کا اظہار بھی کر جاتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے فرائڈ عقل پر جبلتوں کو فوقیت دیتا ہے۔ جبلتیں جب خارجی عوامل کی بنا پر اظہار نہیں پا سکتیں تو ردِ عمل کے طور پر ذہنی الجھنوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جن کی بگڑی ہوئی شکلیں خواب، ہسٹریا اور اختلالِ نفس کی صورت میں سامنے آتی ہیں مگر یہی جبلتیں یا جنسی قوت ارتفاع پذیر ہو کر فن کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اگر ماہرینِ نفسیات ان کرداروں کی اس جنسی تشنگی اور سفرنامہ نگار کی شخصیت کی اس حوالے سے تحلیلِ نفسی کریں تو کیا عجب ہے کہ وہ بھی ان کرداروں کی نا آسودگی کو مصنف موصوف کی ذاتی خواہشات کا عکاس قرار دیں۔

اس ضمن میں یہ چند اقتباسات دیکھیے:

''اس کی بیٹی آخرین ڈنر سے قبل گھڑ سواری کا مردانہ لباس تبدیل کر کے سیاہ رنگ کا ایک اونی لباس پہن آئی تھی اور یقیناً پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔

''اس سے پہلے کہ تم بھی اونگھنے لگو چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک

چھوڑ آتی ہوں" اُس نے ہنس کر کہا۔

ہم ہال کے درمیان میں سے جاتی ہوئی سیڑھیوں کو طے کر کے دوسری منزل پر آ گئے۔ آئرین نے ہینڈ بیگ سے چابیوں کا وہی گچھا نکالا اور پہلے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ "شب بخیر" اس نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر کہا" اور سہانے خواب" اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

وکٹورین طرز کے قدیم فرنیچر سے آراستہ کمرہ بے حد آرام دہ دکھائی دے رہا تھا میں نے پلنگ پر بیٹھ کر ایک سگریٹ پیا اور اپنا سامان کھول کر کپڑے بدلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو باہر آئرین کھڑی تھی۔

"تم دو چار روز ہمارے ہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ اتوار کو گھڑ دوڑ بھی ہے۔ میں تو اس ویران گھر، سنسان کھیتوں اور ڈیڈی کی بڑبڑاہٹوں سے تنگ آ گئی ہوں۔" اُس کی دعوت میں خلوص کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی پنہاں تھا۔" (۷۹)

"کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے آئینہ لٹکائے کمر کے گرد صرف تولیہ باندھے میں شیو بنا رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ میں نے سر جھکا کر تولیے سے شیو کا صابن پونچھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر ہوٹل کی مالکہ اپنے خزاں رسیدہ ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ سجائے مجھے تک تک تک رہی تھی۔ اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کر میری کمر کے گرد بندھے تولیے کی جانب دیکھا اور پھر جلدی سے کہنے لگی "ہو لا لا۔ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے اور نیچے تمہاری چھوٹی سی موٹی سی عورت تمہارا راہ تک رہی ہے"۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر مائی نے مسکرا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کیوں ننھی سی جان کو ہلکان کر رہے ہو نیچے دفع کیوں نہیں ہوتے۔ میں نے گھبرا کر کھڑکی بند کر دی اور کپڑے بدلنے کی نیت سے تولیہ اتارنے لگا۔ ہوٹل کی مالکہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

"شکریہ میڈم" میں نے جھک کر کہا۔

"شرارتی لڑکا" اُس نے اپنی انگلی میرے چوڑے سینے پر ٹھونکتے ہوئے کہا اور ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔" (۸۰)

"آج پورے تین روز بعد بارش ہوئی ہے۔" کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی صحت مند ڈچ لڑکی نے اپنے بلاؤز کے بٹن ٹٹولتے ہوئے ہم سے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اُن کے ساتھ غسل میں شریک ہو جاؤں۔"

ہو سکتا ہے اس کمبخت نے لباس کے نیچے جامہ غسل سرے سے پہنا ہی نہ ہو" میں نے گھبرا کر سوچا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی اور اپنا اصلی جامہ اتارتی میں جو شوا سے اگلی صبح ملنے کا وعدہ کر کے دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سونے سے پہلے میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا۔ سڑک کے عین وسط میں جو شوا اپنے تمام کپڑوں سمیت ہندوستانی سادھوؤں کی مانند آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنے گرد بارش میں نہاتی ہوئی لڑکیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر والی صحت مند لڑکی کے بارے میں میرے شکوک درست تھے۔" (۸۱)

"ہوٹل کی مالکہ کو کمرے کی چابی تھمائی تو اُس نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

"تم اس ہوٹل کے سب سے عجیب مکین ہو" اُس نے جوانی کے زمانے کی ایک بھولی بسری ادا کو تازہ کرنے کی کوشش میں لب سکیڑ کر کہا۔

"پاکستانی ہونے کی وجہ سے؟" میں نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں موسیو مستنصر" وہ کھلکھلا کر ہنس دی "تم دو روز سے یہاں مقیم ہو۔ کل صبح شہر کی سیر کو نکل گئے اور سرِ شام آ کر سو رہے۔ آج بھی اتنی سویرے تیار ہو کر باہر جا رہے ہو۔"

"اس میں کون سی عجیب بات ہے؟"

"تم پیرس میں ہو نوجوان" اُس نے دونوں آنکھیں میچ کر چنچل بننے کی ناکام کوشش کی۔ "تمہیں چاہیے کہ صرف سرِ شام باہر نکلو۔ تمام شب کسی شوخ جگہ بسر کرو اور صبح سویرے ایک چھوٹی سی موٹی سی عورت بغل میں دابے واپس ہوٹل لوٹو۔" (۸۲)

"ایک دم مجھے اپنے جسم پر انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ پہلے تجربے کی بنا پر میں اب پوری طرح چوکس تھا اور اس سے قبل کہ چٹکی بھرنے کی نوبت آتی میرا ہاتھ مضبوطی سے "مجرم" کی کلائی پکڑ چکا تھا۔ میں پیچھے مڑا تو سامنے گداز جسم کی ایک سنہری بالوں والی لڑکی بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔ اُس نے اپنی کلائی چھڑانے کی چنداں

کوشش نہ کی۔" (۸۳)

"ماگریتا نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی جیسے
پوچھ رہی ہو کیا خیال ہے؟ میں نے سر ہلا دیا، مجھ سے نہ ہوگا۔ اُس نے دونوں ہاتھ
میرے کندھوں پر رکھ دیے اور ہنس کر کہنے لگی "تو دل" میں نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے
گرا دیے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔" (۸۴)

"آپ میری ٹانگ کھینچ رہے ہیں۔"

"بالکل نہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ بھلا مجھے اس عمر کی خاتون کی
ٹانگ کھینچنے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔" (۸۵)

ماضی کے سفرناموں میں جنس کا ذکر شجرِ ممنوعہ تھا لیکن آج کل سفرناموں میں جنسی چٹخارہ عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ دونوں رویے افراط و تفریط کا شکار نظر آتے ہیں اگر گناہ کرنا عملِ بد ہے تو اس کی تشہیر بدتر عمل ہے۔ موجودہ سفرناموں کے مطالعے کے دوران میں قاری کے دل و دماغ میں یہ احساس بار بار جنم لیتا ہے کہ سفرنامہ نگار زیبِ داستاں کے لیے رنگ آمیزی سے کام لے رہا ہے اور تو اور ہمارے سفرنامہ نگاروں نے سفرنامے کو بالکل افسانہ بنا دیا ہے۔

سفرنامہ ایک بیانیہ تحریر ہے جس میں سفرنامہ نگار اپنے محسوسات، مشاہدات اور تجربات بیانیہ انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ سفرنامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورانِ سفر اپنے ظاہری اور باطنی آنکھیں کھلی رکھے۔ گرد و پیش کا بڑی ذہانت اور باریک بینی سے مشاہدہ کرے۔ ایسی متعدد خصوصیات مستنصر کے ہاں ملتی ہیں۔ مستنصر کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کا اندازِ تحریر بے تکلفانہ اور شگفتہ ہے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی رنگینی و رعنائی اور لطافت و روانی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے محسوسات کو نادر تشبیہات اور اچھوتے کنایات میں بیان کیا ہے۔ ان کے جملوں میں مرصع کاری اور فنکارانہ آراستگی اپنے درجہ کمال پر نظر آتی ہے۔ ان کے اسلوب میں مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔ انہوں نے دنیا کو بالغ نظر سیاح کی نظر سے دیکھا ہے اور ان کے اندازِ بیان کی مخصوص انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنی شوخی کے سہارے بڑی سے بڑی بات بھی بڑی معصومیت اور ملائمت سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں دکھ اور سکھ کی کیفیتیں یکجا ملتی ہیں۔ ان کے سفرناموں کے مطالعے سے قاری کے رومانی جذبے کو تسکین ملتی ہے۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے ان کو رجحان ساز سفرنامہ نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے اس رومانوی اور افسانوی اسلوب کے بارے میں کرنل محمد خاں لکھتے ہیں:

"مجھے مستنصر کے سفرناموں میں جس چیز سے جادو ہو جاتا ہے۔ وہ ان
کی فضا ہے۔ وہ دلربا نیم اداس فضا۔ نیم اداسی جو مستنصر کی نشیلی آنکھوں میں ہے۔ اس
کی تحریر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی نیم اداس فضا جس میں غم کے گہرے بادل
ہیں، نہ خوشی کی چمکدار دھوپ۔ بس دونوں کے بین بین رومانویت کی بھینی بھینی خوشبو
سے معطر، ریشمی سی اداسی میں لپٹا ہوا سفر جو محض سفر برائے سفر ہے۔ اس میں دنیا کو فتح
کرنے، علم حاصل کرنے یا معاشرے کو سنوارنے کی کوئی آلائش نہیں۔ مسافر کو صرف
دنیا دیکھنے اور اہلِ دنیا کا تماشہ کرنے کی آرزو ہے۔" (۸۶)

مستنصر کے سفرنامے "پاک سرائے" میں جنس نگاری کا ایک انوکھا نمونہ نظر آتا ہے۔ اس سفرنامے میں وہ کھلم کھلا قدرتی نظاروں سے عشق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انہوں نے فن کو بھی ایک کردار کے روپ میں پیش کیا ہے جو بار بار انہیں زندگی کی کم مائیگی کا احساس دلاتا ہے۔ ان کے فن اور جھیل کے ساتھ مکالمے بڑی خوبصورتی سے تحریر کیے گئے ہیں، انہوں نے جھیل کرومبر کو ایک نسوانی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"آپ جس شکل کے عشق میں ہوں اور وہ بے شک دنیا کی خوبصورت
ترین شکل ہو۔ اگر آپ اسے میلے کچیلے لباس میں باورچی خانے میں برتن صاف کرتے
دیکھیں گے تو۔۔۔ آپ فرار ہو جانے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں لیکن اسی خاتون کو
اگر آپ ایک شاندار دمک والی عورت میں داخل ہوتے دیکھتے ہیں تو اس کے بہترین
ملبوس میں اس کے بدنی زاویوں کی کشش اور دودھیا ابھاروں کی مناسبت کے ساتھ اور
اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اور آنکھوں میں کاسمیٹک لینزز کی ہلکی ہلکی چمک کے ساتھ تو
آپ حواس کھو بیٹھتے ہیں اور مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جھیلیں بھی عورتوں کی طرح ہوتی ہیں۔
آپ جانے انہیں کس روپ میں دیکھتے ہیں۔ کس رنگ میں نگاہ کرتے ہیں جب ہم
یہاں پہنچے تھے ہم نے جھیل کرومبر پر تھکاوٹ اور پژمردگی کی بدنی کیفیتوں سے نگاہ کی
تھی۔ وہ اس وقت برتن مانجھ رہی تھی۔ خراٹے لے رہی تھی اور اس کا منہ کھلا تھا لیکن اب
کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک شاندار دمک والی دعوت میں داخل ہو رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر
اس کے حیرت انگیز چٹانی ابھاروں اور بلند زاویوں اور پامیر کی برفوں کو دیکھ کر ہم مبہوت
ہو گئے۔۔۔ ہم تھوڑے سے شرمندہ ہوئے۔ (۸۷)

"اور اس نے منجمد کر دینے والی یخ بستگی میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں اس

کے بدن میں تھا۔ اس کا ایک حصہ تھا۔ اور اس کی سرد مہری ختم ہوئی اور اس کی جگہ ایک نرم آسودہ گرمی میرے بدن کے ہر حصے میں پہنچی۔ جھیل کر دمبر میں جتنا پانی تھا میں اس کے اندر سانس لیتا اور اس لمس نے مجھے ہرا بھرا کر دیا۔ میں نے اُسے چھوا تو میرے بدن میں زوال کی ساری دراڑیں بھر گئیں اور میرے چہرے پر نمودار ہونے والی عمر کی جھریاں مٹنے لگیں۔"(۸۸)

"میں نے اس ہیر کے لیے بڑی مسافتیں طے کی تھیں۔ میں نے اپنی دنیا اس کے لیے تیاگ دی تھی۔ در بدر ہوا تھا۔ اپنا بھیس بدل لیا تھا اور جب وہ سامنے آئی ہے تو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بہت کچھ ہوگا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔"(۸۹)

مستنصر کے سفرناموں میں تخیل، افسانویت اور زبان کی چاشنی درجہ کمال پر ہے۔ یہ رنگ ان کی پوری سفرنامہ نگاری پر حاوی نظر آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مستنصر کی سفرنامہ نگاری شوخ رنگوں کی دلکش تصویر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی دھنک رنگ تحریر جب افسانوی انداز اختیار کرتی ہے تو عبارت دو آتشہ ہو جاتی ہے اور قاری اسے مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔ اگر چہ بعض مقامات پر افسانوی رنگ سفرنامے پر غالب آ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مستنصر جنس کا سہارا لیتے ہیں اور یہ رنگ بعض مقامات پر تو بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ جب وہ کوئی خوبرو چہرہ دیکھتے ہیں تو بعض اوقات ہوش و خرد کی دہلیز پار کر جاتے ہیں اور پھر دور خلاؤں میں کھو کر اس پیکر حسن کے تخیل میں کھو جاتے ہیں۔ مستنصر کے سفرناموں میں جنس نگاری کے مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں افسانوی انداز کے نمونے بھی جنس کی صورت میں ملتے ہیں بلکہ ان کے سفرناموں میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جہاں ان کے اندر کا افسانہ نگار کھل کر سامنے آتا ہے وہ اپنی زندگی کے واقعات میں لفظوں کے رنگوں سے دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے تمام مقامات پر قاری کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اسلوب بھی مزید رنگین و دلآویز ہو جاتا ہے۔ وہ ہر بار نئے انداز سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے بیان کی دلنشینی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس طرح مستنصر کے ہاں افسانوی انداز میں جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ اگر چہ یہ نمونے کہیں کہیں مبالغہ آمیز بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے۔ کہیں کہیں ان کا مزاح اور جنس یکجا نظر آتے ہیں۔ بعض سفرناموں میں انہوں نے کہیں کہیں اپنی ذات کی نمائش کے لیے بھی جنس کے ہتھیار کو استعمال کیا ہے۔ یہ رویہ انہوں نے شاید کمرشل ازم کو مدنظر رکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔

ان کے سفرناموں میں جنس نگاری کی طرف عمومی سطحیں ہی نہیں ملتیں بلکہ انہوں نے اعلیٰ حقائق کے بیان میں بھی جنس کا سہارا لیا ہے جو در اصل ان کی مجبوری تھی۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ ان کے سفرنامے حقیقت اور تخیل کا خوبصورت امتزاج ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف سامنے کے مناظر کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرتے ہیں وہاں تخلیقی سطح پر قاری کو تخیل کے ذریعے رومانوی دنیا میں بھی لے جاتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں بیان کی یہ دونوں سطحیں ملتی ہیں۔ جہاں وہ خارجی مظاہر و مناظر کے پس پردہ حقائق کا اظہار تخلیقی سطح پر کرتے ہیں وہاں ان کا رُخ خارج سے باطن کی طرف بھی مڑ جاتا ہے۔ مستنصر چونکہ جادو اثر تحریر کے خالق ہیں اس لیے ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ تحیر، تفکر، کہانی پن، افسانویت، فطری بشاشت، ڈرامائیت، بے ساختگی، شوخی و شرارت، فکری تازگی، حقیقت کا ادراک، مشاہدے کی گہرائی، انسان دوستی کا رچا ہوا شعور اور ادبی رکھ رکھاؤ ان کی سفرنامہ نگاری کے اہم عناصر ہیں۔ انھی خصوصیات کی وجہ سے ان کا شمار پاکستان کے مقبول ترین اور بیسٹ سیلر سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن کی معراج پر ہیں جو کہ برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اب مستنصر کے اس انداز بیان کو اپناتے ہوئے بہت سے لوگ سفرنامے لکھ رہے ہیں لیکن تخلیقی کرب کے بغیر یہ انداز نصیب نہیں ہوتا۔

☆★★

عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی ۱۹۴۳ء میں امرتسر (بھارتی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ۱۹۶۷ء میں ایم۔اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔اے۔او کالج لاہور میں اُستاد اُردو کی حیثیت سے سالہا سال کام کیا(۹۰) روزنامہ ”نوائے وقت“ میں کئی سال تک ”روزنِ دیوار سے“ کے زیرِ عنوان کالم نگاری کی۔ آج کل روزنامہ ”جنگ“ لاہور میں کالم لکھتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ناروے اور بعد ازاں تھائی لینڈ میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے کام کیا۔

عطاء الحق قاسمی نے ادب کی مختلف اصناف میں اپنی خلاقی کے جوہر دکھائے ہیں ان کی حیثیت ڈراما نگار، کالم نگار، خاکہ نگار اور سفرنامہ نگار کے علاوہ شاعر کی بھی ہے۔ ہم یہاں جنس نگاری کے ضمن میں ان کے سفرناموں کا تجزیہ کریں گے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ شوقِ آوارگی ۔۔۔ ۲۔ دنیا خوبصورت ہے

۳۔ گوروں کے دیس میں ۔۔۔ ۴۔ دلی دُور است

موجودہ دور میں جس صنفِ نثر نے مقبولیت میں ناول اور افسانے کی ہمسری کا شرف حاصل کیا، وہ سفرنامہ ہے۔ سفرنامہ اگرچہ سفر کی رُوداد ہوتا ہے۔ لیکن جب اس میں دلچسپ اور عجیب و غریب واقعات سفر کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی شگفتگی اور تازگی شامل ہو جاتی ہے تو یہ خاصے کی چیز بن جاتا ہے اور دلچسپی اور افادیت کے لحاظ سے ناول اور افسانے کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ یورپی ممالک کی تہذیبی اور اقتصادی ترقی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں بسنے والے لوگوں کے لیے نہایت

دلچسپی کا باعث ہے۔ خاص طور پر ملک عزیز میں بسنے والے اُن نوجوانوں کے لیے اُن ممالک میں خاص کشش ہے جو اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے خواب سوتے جاگتے دیکھتے ہیں اور ہر وقت اُن ممالک میں بسنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ان کی اس خواہش کو دوچند کرنے میں ہمارے بعض سفرناموں کا بھی ہاتھ ہے۔ نئے دور میں مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں ”نکلے تری تلاش میں“ ”خانہ بدوش“ اور ”اندلس میں اجنبی“ وغیرہ نے یورپ کی خوبصورت زندگی کے کئی دلچسپ اور دلکش واقعات قارئین کے ذہنوں میں نقش کیے ہیں لیکن جس سفرنامہ نگار نے موجودہ دور کو مزید بہتر اور خوبصورت سفرنامے عطا کیے وہ عطاء الحق قاسمی ہیں۔ ان کے سفرناموں ”شوقِ آوارگی“ ”دنیا خوبصورت ہے“ ”گوروں کے دیس میں“ اور ”دلی دُور است“ کو پڑھ کر قاری نہ صرف حظ اٹھاتا ہے بلکہ جو خوشی اور سرمستی اسے ملتی ہے اور جس شگفتگی اور ندرت کے سمندر میں وہ غوطہ زن ہوتا ہے وہ واقعی قابلِ دید ہوتی ہے۔ اگرچہ طنز و مزاح کی آمیزش اس سے پہلے ابنِ انشا کے سفرناموں کا بھی خاصہ رہی ہے لیکن عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں مزاح کی چاشنی اور ہی بہار دکھاتی ہے۔

ہمارے سفرنامہ نگار سفرنامہ لکھتے وقت ”صنفِ نازک“ کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اگر سفرنامہ یورپ سے متعلق ہو تو پھر تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ مغربی معاشرے کی جنس زدگی پر لکھتے ہوئے ہمارے سفرنامہ نگاروں نے خوب چٹخارے لیے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے کہ مغربی معاشرے کی صرف یہی ایک خصوصیت مختلف شکلیں بدل کر اُن کے سفرناموں کے صفحات کی رنگینی میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یورپی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کا قلم محض چٹخارے ہی نہیں لیتا۔ وہ اپنے پاکستانی معاشرے میں بسنے والے نوجوانوں کو مغرب کی جنسی آزادیوں کی رنگین تصویریں نہیں دکھاتے بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں مغربی معاشرے کے چہرے سے رنگین نقاب اُتار کر اس کا بھیانک چہرہ سامنے لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج نوجوان ان کا سفرنامہ بغل میں دبا کر یورپ کی سیاحت پر نکل کر ذلیل و خوار نہیں ہوتا بلکہ ان کا سفرنامہ پڑھ کر وہ اپنی ذہنی پراگندگی کی تطہیر کی کوششوں کو تیز تر کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

ایئر ہوسٹسوں کا ذکر اب سفرنامے کا ایک جزو بن گیا ہے۔ ہر سفرنامہ نگار اپنی نظر سے ان کو دیکھتا ہے اور سفرنامے کو دلچسپ بنانے کے لیے ان کا ذکر کرتا ہے۔ عطا کے سفرناموں میں بھی ایئر ہوسٹسوں کا ذکر طنز و مزاح کے پیرائے میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''پرواز نارمل ہوتے ہی تھائی میزبان لڑکیاں حرکت میں آ گئیں اور انہوں نے ساقی گری شروع کر دی۔ ان تھائی لڑکیوں کے خدوخال ویسے ہی تھے جیسے تھائی لڑکیوں کے ہوتے ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ان کی ریشم ایسی اسکن جس کی تعریف وارث شاہ نے بھی کی ہے۔ حسن اخلاق، نرم و نازک ہاتھ اور ان ہاتھوں سے پیش کیے گئے پیمانوں کے زیر اثر مسافروں نے محسوس کیا کہ وہ پریوں کے جھرمٹ میں ہیں چنانچہ ان میں سے کئی ایک نے خود کو باقاعدہ راجہ اندر محسوس کرنا شروع کر دیا۔ میرے کچھ ہم سفر للچائی ہوئی نظروں سے مینا و جام اور اس کے ساتھ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے رہے کہ شاید گروپ میں سے کوئی ''جرات رندانہ'' سے کام لیتے ہوئے مے نوشی کا آغاز کرے تو وہ بھی ہاتھ بڑھا کر جام اٹھا لیں مگر ہم لوگ اتنا اللہ سے نہیں ڈرتے جتنا ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں چنانچہ الحمدللہ سب نے کوک پر اکتفا کیا۔''(۹۱)

''اب پھر وہی جہاز تھا اور ماتھے پر بندیا لگائے جہاز میں ادھر سے اُدھر آتیاں جاتیاں سانولی سلونی ایئر ہوسٹیس! مثنوی سحر البیان یاد آ گئی۔

ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

تاہم اس میں سے دوسرا مصرعہ غلط سمجھیں کہ ان دیویوں کے پاس دکھلانے کے لیے صرف آنکھیں تھیں جو وہ پانی مانگنے والوں کو دکھلاتی تھیں۔ یہ پانی مانگنے والے بزبان حال یہ مصرعہ بھی تو پڑھتے تھے جو انہوں نے کبھی کسی ٹرک پر لکھا دیکھا تھا۔

آیا ہوں بڑی دور سے پانی پلا مجھے۔

حالانکہ ان پیاسوں میں بھی زیادہ تر فن برائے فن کے قائل ہوتے ہیں اور خاصے سست بھی ہوتے ہیں چنانچہ کنوئیں میں خود ڈول ڈالنے کی بجائے کنوئیں پر کھڑی دوشیزہ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ یہ شعر سن کر ان کے لیے کنوئیں سے ڈول نکالے گی اور انہیں پانی پلائے گی۔ اگر کوئی رحمدل دوشیزہ ایسا کرتی بھی ہے تو یہ اوک میں سے پانی گرانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر پیاسے کے پیاسے رہتے ہیں، سو ایسے معصوم اور بے ضرر عاشقوں کو آنکھیں دکھلانا اگرچہ زیادتی ہے لیکن اس میں بھی بہتوں کا بھلا ہو جاتا ہے کہ وہ آنکھوں سے مے کشید کرنا شروع کر دیتے ہیں، دو چار جام پیتے ہیں اور پھر پکوڑے کھا کر سو جاتے ہیں۔ یہ فضائی دیویاں کچھ اسی قسم کی خدمت خلق

میں مشغول تھیں۔''(۹۲)

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں کو دلکش بنانے کے لیے اپنے دوست احباب کے دلچسپ واقعات کو شگفتگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً جہاں خواتین کا تذکرہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں انہوں نے اپنے دوستوں کے دلچسپ واقعات بڑی بے تکلفی سے بیان کیے ہیں:

''سکرٹ، جین، ہاٹ پینٹ اور دوسرے ملبوسات یا غیر ملبوسات سے خود کو آراستہ کیے ہوئے ''میمیں'' زلفیں کاندھوں پر لہرائے اور اونچی ہیل کی جوتی سے ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتی ہوئی تیزی سے برقی سیڑھیوں کی طرف لپک رہی تھیں یہ وہی میمیں ہیں جو یورپ کا سفر اختیار کرنے والے بیشتر مسافروں کے اعصاب پر سوار ہوتی ہیں بلکہ ایک پاکستان دوست کے متعلق تو شنید ہے کہ جب دوران سفر اس کے ہم سفر نے اسے بتایا کہ ہمارا جہاز لندن ایئر پورٹ پر اُترنے والا ہے تو اس نے پوری وارفتگی سے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا اور بے تابی سے کہا ''لندن آ گیا ہے تو پھر میمیں کہاں ہیں؟''(۹۳)

''اس دوران ایک خوبصورت غیر ملکی لڑکی معطر ہوا کے جھونکے کی طرح خراماں خراماں کمرے میں چلی آئی۔ اس نے اتنے سارے ''ڈشکروں'' کو بیک وقت کمرے میں دیکھا تو کچھ دیر کے لیے ٹھٹھکی پھر اس نے کسی شخص کا نام لیا اور پوچھا کہ کیا وہ اسی کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جنہوں نے آج ہی واپس دہلی جانا تھا کمرے میں بکھرا ہوا اپنا سامان یکجا کرنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے ایک نظر پہلے ہم سب کو دیکھا اور پھر اس حسینہ سے مخاطب ہو کر شائستگی سے کہنے لگے ''نہیں محترمہ وہ اس کمرے میں نہیں ٹھہرے ہوئے۔ اس کمرے میں مَیں مقیم ہوں۔ میرا نام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہے فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں'' اس نے جواب میں کوئی خدمت بتانے کی بجائے ''آئی ایم سوری'' کہا جس کا اردو مطلب غالباً یہ تھا کہ مجھے افسوس ہے میں آپ سے خدمت نہیں کرا سکتی۔ کمرے میں موجود لوگ کوئی اتنے غلط نہیں تھے مگر جب انسان کسی تلاش میں ہو تو پھر نظروں میں شان سکندری بھی نہیں جچتی!''(۹۴)

عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے ایک طرف تو یورپ، امریکہ، ہندوستان، بنکاک، سنگاپور، آسٹریلیا اور تھائی لینڈ وغیرہ کی تمام رنگینیوں، رعنائیوں اور بھرپور جوانیوں کی دلکش تصویریں ہم تک

پہنچاتے ہیں، دوسری طرف اُن ممالک کے اقتصادی کارنامے تہذیب وتمدن لوگوں کے انداز و اطوار، معیارِ زندگی سے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات قاری کو مہیا کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں کہیں کہیں افسانوی انداز بھی ملتا ہے۔ خصوصاً انہوں نے اپنے سفرنامے ''دنیا خوبصورت ہے'' میں بہت دلچسپ افسانوی انداز اپنایا ہے جو بہت بھلا لگتا ہے۔ اُس سفر کو جب اُنہوں نے افسانوی انداز میں سفر نامے کے قالب میں ڈھالا تو پڑھ کر محسوس ہوا کہ واقعی ''دنیا خوبصورت ہے۔'' عطاء الحق قاسمی جہاں بھی جاتے ہیں ان ممالک کی خصوصاً امریکہ کی اقتصادی اور معاشی ترقی کے راز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا سفرنامہ پاکستانی معاشرے کی اقتصادی زبوں حالی کا نوحہ بھی بن جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں میں خصوصاً یورپ، امریکہ اور سکینڈے نیوین ممالک میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ راوی پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن اس طرح سے کہ نوجوان دلوں کی دھڑکنوں کو تیز نہیں کیا اور نہ ہی ان کی آتشِ شوق کو بھڑکایا ہے بلکہ اس سے جنسی بے راہ روی کی تحریک ملنے کی بجائے کسی قدر نفرت کا جذبہ اُبھرتا ہے اور یوں پاکستان کی معاشرتی اقدار پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔ آج دنیا میں ایڈز کا مہلک ترین مرض پیدا ہوا ہے جس میں مبتلا شخص سوسائٹی میں اُچھوت ہو کر رہ جاتا ہے اور جس کے سائے سے بھی لوگ پناہ مانگتے ہیں۔ چونکہ طبی طور پر اس کا بڑا سبب مردوں کی ہم جنس پرستی اور عورتوں سے بھی اسی انداز میں تلذذ کا حصول ہے۔ اسی لیے اسے ہم جنس پرستوں کے طاعون کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مرض اسی طریقے سے دوسرے لوگوں میں منتقل ہوتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان جب غیر فطری طریقے سے جنسی تسکین حاصل کرتا ہے تو اس قسم کی جنسی بیماریوں اور الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ عطا نے مختلف ممالک کی جنسی زندگی کو کسی تماش بین کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے ایک ہمدردانہ شعور رکھنے والے سفر نامہ نگار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں ایسے واقعات سے سفرناموں کی دلچسپی کو ہرگز نہیں بڑھایا بلکہ اُس زندگی کا حقیقی رُخ ہمیں دکھایا ہے جن میں وہ ممالک مبتلا ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے جابجا ملتے ہیں جن سے قاری کو ان ممالک کی جنسی بے راہ روی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''حالانکہ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے لیکن جہاز میں بہت چہل پہل تھی۔ مسافروں کی بڑی تعداد بنکاک کے ''شعلے'' دیکھنے جارہی تھی۔ چنانچہ ان میں وہ ایکسائٹمنٹ پائی جاتی تھی جو چاند رات کو مشاقانِ عید میں پائی جاتی ہے۔ بنکاک کو ''بین الاقوامی ہیرا منڈی'' کی حیثیت حاصل ہے۔ پوری دنیا سے سیاح یہاں

ایڈز خریدنے آتے ہیں اور واپسی پر اپنے پیاروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ عصمت فروشی کو یہاں ''سمال انڈسٹری'' کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ گھر گھر میں چھوٹے چھوٹے ''یونٹ'' قائم ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے بچے بھی بطور ایندھن استعمال ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہاں امرد پرستی کا بازار بھی گرم ہے۔ یہ بات میں نے محاورتاً نہیں کہی بلکہ اس مقصد کے لیے واقعی خصوصی طور پر ایک بازار موجود ہے۔ گلزار وفا چودھری ایک میٹنگ کے سلسلے میں بنکاک گیا تو اس کے دل میں یہ بازار دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا، وہ ایک گھڑیوں کی دکان میں گیا اور اس کے مالک سے بازار کا پتہ پوچھا۔ مالک نے کہا ''تم کہاں بازار ڈھونڈتے پھرو گے۔ دس ڈالر مجھے دو اور ...'' گزشتہ دنوں بنکاک کے وزیر سیاحت کا بیان اخباروں میں شائع ہوا جس میں اس نے بنکاک میں ایڈز کی بڑھتی ہوئی شرح پر سخت تشویش کا اظہار کیا تھا کیونکہ سیاحوں کی تعداد میں کمی کی وجہ سے ملکی معیشت پر بُرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔''(۹۵)

''کھانے سے فراغت کے بعد میں واش روم گیا۔ وہاں اچانک میری نظر دروازے پر چسپاں ایک اشتہار پر پڑی جو حکومت کی طرف سے تھا۔ اشتہار کی سرخی تھی ''محفوظ سفر'' اس کے ساتھ ایک کھلے بیگ کی تصویر تھی جس میں سے کپڑے نکل کر باہر کو گر رہے تھے۔ نیچے لکھا تھا کہ جس طرح سفر کو محفوظ بنانا ضروری ہے، اسی طرح گھر کو بھی محفوظ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ عورت یا مرد کے ساتھ جنسی تعلقات کے وقت کنڈوم ضرور استعمال کریں۔ ''اورل سیکس'' سے بھی ایڈز ہو سکتی ہے اگرچہ اس کے چانسز بہت کم ہیں تاہم احتیاط ضروری ہے۔ مزید معلومات کے لیے درج ذیل فون نمبر پر معلومات حاصل کریں۔ ہمارے ہاں اس نوع کے اشتہارات پر ناک بھوں چڑھایا جائے گا لیکن عالمِ انسانیت کو اس ہولناک مرض سے جو خطرات درپیش ہیں اس کے پیشِ نظر اس نوع کی ''ننگی'' معلومات ضروری ہو گئی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہماری اخلاقیات اس نوع کی اشتہار بازی کی اجازت نہیں دیتی جبکہ یہ اشتہار ان لوگوں کے لیے ہے جن کی ''اخلاقیات'' نے انہیں اس کام کی اجازت دی ہوتی ہے جس سے ایڈز پھیلتی ہے۔ اگر یہ معلومات عام نہ کی گئیں تو اس عفریت کی زد میں صرف گنہگار نہیں، بے گناہ بھی آئیں گے مگر یہ بات ابھی تک ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی!''(۹۶)

''قارئین کی ''قیمتی'' معلومات میں اضافے کے لیے عرض ہے کہ پہلا

بازار بمبئی کے بازار حسن کا نام ہے اور بھارت کے علاوہ اردگرد کے ممالک کو ''ایڈز ''بمبئی سے سپلائی کی جاتی ہے، میں آپ کو ۱۹۸۵ء کے سفر کی رُوداد سنا رہا ہوں۔ اُس وقت صورتحال اتنی سنگین نہیں تھی لیکن آج بھارت میں ایڈز کے مریضوں کی تعداد تشویش ناک حد تک بڑھ چکی ہے اور بمبئی اس ہولناک مرض کا سینٹر ہے۔ نیپال میں تو ایڈز کو ''بمبئی کی بیماری'' کا نام دیا گیا ہے۔ بھارت میں بے لگام جنسی آزادی جہاں بہت سے معاشرتی مسائل پیدا کر رہی ہے وہاں یہ مرض بھی ایک عفریت کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ بھارتی حکومت اس کے سدِباب کے لیے کوشاں ہے لیکن جب تک اس مرض کی ''چھاؤنی'' تباہ نہیں کی جائے گی، اس کا مقابلہ ممکن نہیں ہوگا۔''(۹۷)

''دوسری طرف نوجوان انگریز لڑکے اور لڑکیاں دریا کے کنارے ایک مشکل سے لفظ یعنی فسق وفجور کے مظاہرے میں مشغول تھے۔

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدہ حور

اقبال کو اس خبر سے مسرت ہوگی کہ یہ حور و قصور کی فراوانی اب اہلِ مغرب کے لئے دنیاوی عذاب کی صورت اختیار کر گئی ہے بلکہ محتاط قسم کے لوگ تو حور کو دیکھ کر ادھر اُدھر چھپ جاتے ہیں۔ ایڈز کے خوف نے اہلِ مغرب کی زندگیاں ویران کر دی ہیں!''(۹۸)

مغرب اور امریکہ میں ہم جنس پرستی کو قبیح فعل نہیں سمجھا جاتا بلکہ ''مہذب دنیا'' کی مختلف پارلیمنٹوں میں اس کی باقاعدہ منظوری دی جا چکی ہے۔ وہاں عورتوں کی ہم جنس پرستی کے لیے دروازہ بالکل کھلا ہے۔ وقار اور شائستگی وغیرہ کے جو پیمانے جدید دنیا نے مقرر کیے ہیں ان جرائم اور برائیوں کا ان سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ رشتہ ازدواج سے ہٹ کر جنس سے بھرپور طریقے پر لطف اندوز ہونے کے ساتھ دورِ حاضر کے سماجی حیوان کو جنس کے غیر فطری رویوں سے مستفید ہونے میں بھی کوئی رکاوٹ اور پابندی نہیں ہے۔ وہاں جس طرح مرد مردوں سے غیر فطری طریقے پر جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں اسی طرح عورتیں عورتوں سے غیر فطری طریقہ پر جنسی تسکین کا سامان کرتی ہیں۔ مردوں کی ہم جنسی کو Homo Sexuolity کہا جاتا ہے تو عورتوں کی ہم جنسی کی جدید اصطلاح لسبیئنزم Lesbianisum ہے۔ ہم جنس پرستی عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں کا ایک اہم موضوع ہے۔ انہوں نے اس پر بے لاگ لکھا ہے اور مغربی تہذیب کی جنسی بے راہ روی کی عکاسی کی ہے۔ ہم جنسیت ایک

نفسیاتی عارضہ ہے۔ یہ کوئی صحت مند جنسی رجحان نہیں ہے۔ یہ رجحان مغربی ممالک میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ مغرب اور امریکہ میں تو یہ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ وہاں ہم جنسی ایک دوسرے سے سرِعام پیار کرتے ہیں اور شادیاں بھی رچاتے ہیں۔ مغرب کے قحبہ خانوں میں ہم جنسی میلان اور لزبائی شوق کی تشفی کے سامان فراہم کیے جاتے ہیں گویا وہاں سارا زور غیر فطری جنسی تعلق پر صرف کیا جا رہا ہے اور وہ لوگ اس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے ان معاشروں میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی خصوصاً ہم جنس پرستی پر قلم اٹھایا ہے۔ اس طرح کوئی بھی نوجوان ان کے سفرنامے پڑھ کر اس کھلی تہذیب سے ہرگز متاثر نہیں ہوگا اور نہ ہی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو کسی رنگین سپنے کی نذر ہونے دے گا بلکہ وہ اس تہذیب کی جنسی بے راہ روی، ذہنی پراگندگی اور جنسی ناآسودگی پر خون کے آنسو بہائے گا۔ عطاء الحق قاسمی اپنے قاری کو اس زندگی کا حقیقی رُخ دکھاتے ہیں نہ کہ مغربی تہذیب کی صرف چکاچوند سے اس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''اور پھر نظر پڑی ایک جوڑے پر کہ دونوں مرد ہیں مگر حرکات سے زنانہ پن ٹپکتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ لوگ ایک نظر ان پر ڈالتے ہیں اور زیرِ لب تبسم کے ساتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ جگمگ جگمگ کرتا نیویارک ہے۔ نیویارک جو امریکہ کی کئی ریاستوں سے زیادہ ماڈرن ہے۔ جہاں اسقاط حمل کو قانون قرار دیا جا چکا ہے۔ ہر قدم پر عریاں رسالوں کی دکانیں عریاں فلموں کے تھیٹرز اور جنس کے دیگر مظاہر نظر آتے ہیں۔ BURLESK کا نیون سائن وقفوں کے بعد جلتا بجھتا ہے۔ مختلف عمر کے لوگوں کی ایک تعداد تیر کے ایک نشان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تنگ و تاریک سیڑھیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ سیڑھیاں ختم ہونے پر سامنے بکنگ آفس ہے۔ لوگ ٹکٹیں خرید کر ہال میں جا رہے ہیں۔ بکنگ کلرک جنوبی امریکہ کا باشندہ ہے۔ ''کیا میں ایک نظر ہال پر ڈال سکتا ہوں؟'' ''ڈال تو نہیں سکتے مگر ڈال لو۔ غیر ملکی لگتے ہو!''

میں مسکراہٹ کے ساتھ اس بات کا جواب اثبات میں دے کر ہال میں داخل ہو جاتا ہوں۔ گھپ اندھیرا ہے اور ایک فلم دکھائی جا رہی ہے۔ فلم کیا ہے شیطان بھی دیکھے تو الامان الامان پکار اُٹھے۔ بکنگ کلرک کا شکریہ ادا کر کے باہر آ جاتا ہوں۔ ایک اور نیون سائن پر نظر پڑتی ہے ''ڈانسنگ پارٹنرز'' باہر ایک تختے پر نیم عریاں لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔۔۔ شاید تم انگریزی نہیں سمجھتے۔ جب اس نے زخموں پر یوں نمک

پاشی کی، جب میں جان گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے دل پر مہر لگا دی ہے، کان بند کر دیے ہیں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ جب یہ اسرار منکشف ہوئے مجھ پر تو میں گامزن ہوا اس دکان کی جانب جہاں جنس کے متعلق ہر چیز دستیاب ہونے کا دعویٰ ایک بہت بڑے نیون سائن کے ذریعے کیا گیا تھا۔ یہاں اندر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ شوکیس میں ''ہر طرح'' کا مال سجا پڑا تھا۔ غالب نے کہا تھا:

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

مگر اس شریف النفس انسان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک وقت آئے گا جب دل و جان ہی نہیں، بازار سے ہر سائز کے جنسی اعضا بھی خریدے جا سکیں گے، سو خریدا۔ کم از کم تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم یہاں بھی تھا۔''(۹۹)

''تم لوگ اندر نہیں جا سکتے!''

''کیوں؟''

''آج کی شام صرف ''ہم جنس پرستوں'' کے لیے مخصوص ہے!''

''واقعی؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہاں مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟'' اس نے خفگی کے عالم میں کہا۔

''نہیں نہیں، حیرت کی تو واقعی کوئی بات نہیں!'' میں نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا'' لیکن کیا ہم لوگ بمصر کے طور پر بھی اندر نہیں جا سکتے؟''

''نہیں، تماش بینوں سے کلب کا ''تقدس'' مجروح ہوتا ہے!''

میں نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔ یورپ والوں نے اپنے فلسفوں کے دفاع میں لفظوں کا تقدس بہت بری طرح مجروح کیا ہے!

اب ہم پھر سڑک پر تھے۔

''یار! یہ تماشا دیکھنا ضرور چاہیے!'' میں نے افتخار سے کہا۔

''میرا بھی جی چاہتا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

''ایک دفعہ پھر کوشش کرتے ہیں۔''

''مگر وہ سیاہ پوش تو ہمیں پہچان لے گا۔''

''میرے پاس ڈبل جیکٹ ہے، میں اسے الٹا کر کے پہن لیتا ہوں

آپ ٹائی اتار لیں، کوٹ کے کالر اوپر کر لیں۔''

''اور آنکھوں میں کچھ بے حیائی بھی پیدا کی جائے؟''

''ہاں یہ بھی ضروری ہے۔'' افتخار نے ہنستے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ اس سیاہ پوش کے حضور میں کھڑے تھے۔

''تم لوگ اندر نہیں جا سکتے۔'' اس نے ہاتھ کی دیوار بناتے ہوئے کہا۔

''کیوں''

''تم لوگ ہم جنس پرست نہیں ہو!''

''تم ہمارے کردار پر شک کر رہے ہو'' مصنوعی غصے کے ساتھ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں میرا اپنا بُرا حال ہو گیا۔ ہم اس کلب میں داخلے کے پوری طرح مستحق ہیں۔ راستہ چھوڑ دو۔''

''تم لوگ اگر اپنی ضد سے باز نہ آئے تو میں پولیس کو فون کر دوں گا۔'' اس نے دھمکی دی'' اس فیلڈ میں میرا عمر بھر کا تجربہ ہے۔ میں شکل دیکھ کر پہچان جاتا ہوں۔ تمہارے چہرے پر وہ روشنی ہی نہیں ہے۔''

دوسرے لفظوں میں ہم بدکردار تھے اور ہمارے چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔

۔۔۔'' اس سیاہ پوش کے برابر سے گزرتے ہوئے ہم نے اس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا، جس بے تکلفی کا مظاہرہ پاکستان میں گہرے دوست ایک دوسرے کے ساتھ سڑکوں پر گھومتے ہوئے کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس سیاہ پوش کے برابر سے گزرنا ہے تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ ہم اس کے ''ہم مشرب'' ہیں اور ہاں اگر میں اس کے قریب پہنچ کر آپ کے کاندھوں پر سر رکھ دوں تو آپ پلیز مائینڈ نہ کریں، اس بدبخت کی مزید تسلی ہو جائے گی۔''

''قبول ہے!''

''بس ایک دفعہ ہی ٹھیک ہے۔ خدا کے لیے یہ جملہ کہیں تین دفعہ نہ کہہ دیں، یہاں تو یہ لوگ آپس میں شادیاں بھی کرتے ہیں، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔'' افتخار کے چہرے پر مسکراہٹ تھی! ہمارا یہ تیسرا حملہ کامیاب ثابت ہوا اور ہم

آٹھ آٹھ پاؤنڈ کا ٹکٹ خرید کر اس سومنات میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جہاں ایک جسمانی اور ذہنی کجی یا معذوری کو فلسفے کا روپ دیا گیا تھا اور اب اس فلسفے کا بُت بنا کر یہاں اس کی پوجا کی جارہی تھی۔ اندر سائیکا ڈیلک لائٹس تھیں۔ کانوں کے پردے پھاڑنے والا میوزک تھا اور اس میوزک پر مرد و زن پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ یہاں وہ مرد تھے جو عورت کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے اور ڈانسنگ فلور پر وہ عورتیں تھیں جنہیں مردوں کا نام سننا بھی گوارا نہ تھا چنانچہ مرد مردوں کے ساتھ ناچ رہے تھے اور عورتیں، عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص میں مشغول تھیں۔ اس تقسیم میں محرم یا نا محرم والا "شرعی عذر" نہیں تھا بلکہ یہ تقسیم سراسر غیر شرعی عذر کی وجہ سے تھی۔

ہال کے چاروں کونوں میں تقریباً دس فٹ بلند میزیں دھری تھیں جن پر "سیکسی" "لباس میں ملبوس ہیجڑے" "ہیجان انگیز" ناچ سے تماشائیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں مشغول تھے۔ سامنے ایک بالکونی ٹائپ چیز تھی جس میں ایک موٹی سی عورت کھڑی منہ سے آگ نکال رہی تھی۔ یہاں ویٹریز کی بجائے کم عمر ویٹر تھے جو اپنے ہونٹوں کو سرخی سے سجائے ہوئے تھے۔ ہال کی راہداریوں میں میزیں بچھی تھیں۔ خواتین علیحدہ میزوں پر اور مرد علیحدہ میزوں پر بیٹھے ناؤ نوش میں مشغول تھے۔ ڈانس کا راؤنڈ مکمل ہونے پر چند لمحوں کے لئے ہال کی بتیاں آف ہو جاتی تھیں جس پر مکمل خاموشی چھا جاتی تھی اور بتیاں آن ہونے پر آوازیں کسنے کے انداز میں شور مچایا جاتا تھا۔ یہ ذہنی مریضوں کا اجتماع تھا جسے اب مغرب میں قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کل کلاں یہاں کے قانون ساز ادارے اسے کہیں لازمی قرار نہ دے ڈالیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے یہاں ہمارا دم گھٹ جائے گا، چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہم ہال سے باہر تھے۔ سیاہ پوش چوکیدار کے برابر سے گزرتے ہوئے میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "ہم تمہارے کلب کا "تقدس" مجروح کر کے جارہے ہیں۔ اس "بے حرمتی" پر ہم تہ دل سے معافی کے خواستگار ہیں۔"

اس رات بستر پر دراز ہوتے ہوئے میں نے معروضی طور پر ان لوگوں کا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کی جن کے "معبد" میں ہم نے کچھ وقت گزارا تھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغرب کی تہذیب واقعی اپنے ہاتھوں سے آپ خودکشی کرنے پر تلی ہوئی ہے کیونکہ ان کے بیشتر فلسفوں کا آشیانہ شاخ نازک پر بنتا ہے۔ "ہم جنس" پرستی اطباء اور

ماہرین نفسیات کے نزدیک ایک جسمانی اور ذہنی معذوری ہے اور اس کا وجود آج سے نہیں صدیوں سے ہے۔ بہت سے معروف یونانی فلاسفہ اور دنیا کی کئی دوسری نامور شخصیتیں قدرت کی اس ستم ظریفی کا نشانہ بنی ہیں۔ یہ طبقہ ہمارے ہاں بھی قابل ذکر تعداد میں موجود ہے۔ مگر مغرب میں گھپلا یہ ہوا ہے کہ وہاں برائی کو پہلے فلسفے کی شکل دی جاتی ہے۔ اسے خوش نما رنگوں میں پیش کیا جاتا ہے اور جب اس برائی کے لئے مارکیٹ پیدا ہو جاتی ہے تو صنعت کار میدان میں کود پڑتا ہے اور اپنی "مصنوعات" کے ڈھیر لگا دیتا ہے مثال کے طور پر جنسی بے راہروی ہی کو لیں، پہلے فری سیکس کا نظریہ پیش کیا گیا، اس کے نفسیاتی، جسمانی بلکہ "روحانی" "فائدے" تک گنوائے گئے اور اس کے ساتھ ہی اسے اتنی بڑی انڈسٹری بنا دیا کہ سویڈن ایسے "مثالی نظام" کے حامل ملک کی ساری آمدنی اسلحہ سازی کے بعد بلیو فلموں کی رہین منت ہے۔ بلیو فلموں کے علاوہ سینکڑوں عریاں اخبارات و جرائد کی انڈسٹری ہے جو دھڑا دھڑ اپنی "مصنوعات" مارکیٹ میں پھینک رہے ہیں۔ قحبہ خانوں کی انڈسٹری ہے جہاں عورتوں کی تذلیل کے لیے انسانیت سوز رویے اپنائے گئے ہیں۔ مصنوعی جنسی اعضاء کی انڈسٹری ہے۔ فیکٹریوں میں ربڑ کی عورتیں تیار کی جارہی ہیں۔ یہ ایک علیحدہ انڈسٹری ہے۔ عریانی کے لئے راہ ہموار کرنے کے بعد صنعت کار عریاں ملبوسات میں نئے نئے ڈیزائن تیار کر کے مارکیٹ میں پھینکتے ہیں۔

ہیمبرگ، ایمسٹرڈیم، نیویارک اور دوسرے "مہذب" شہروں میں عورت اور مرد کی تذلیل کے مظہر بدترین سٹیج شوز کے ذریعے سرمایہ اندوزی کی جاتی ہے اور برہنہ ساحل بطور انڈسٹری وجود میں آئے ہیں جن سے وابستہ ادویات کی انڈسٹری اس کے علاوہ ہے۔ پہلے معاشرے کو ایڈز میں مبتلا کیا گیا اور اب اس کی دواؤں پر کھربوں ڈالر کمائے جائیں گے۔ جنسی بے راہروی کا فلسفیانہ اور دانشورانہ جواز پیش کیا گیا تھا کہ جنس اور اس سے وابستہ ہر اسرار سے پردہ اٹھانے سے جنس کے ضمن میں لوگوں کا رویہ نارمل ہو جائے گا۔ نہ صرف یہ کہ یہ نظریہ درست ثابت نہیں ہوا بلکہ اس نے مغرب کے انسان کو پہلے سے زیادہ مریض بنا دیا ہے اور اب شام کے بعد کسی عورت کا کسی تنہا سڑک پر نظر آنا اس کے لیے خطرے سے خالی نہیں رہا چند برس پیشتر نیویارک میں ایک گھنٹے کے لیے بتی چلی گئی تھی جس کے دوران سینکڑوں عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ مغرب کے دانشور اسے ذہنی مرض قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی صنعت کار

ان ''ذہنی مریضوں'' کے لیے فوری طور پر جنسی تشدد، جبر اور اذیت رسانی پر مشتمل فلمیں اور دیگر ''مصنوعات'' تیار کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ اس مرض کے صارفین کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکے!

مغرب کے صنعت کاروں نے ہم جنس پرستی کو بھی ایک بہت بڑی صنعت بنا دیا ہے۔ دراصل کیپٹلزم دنیا کا سفاک ترین نظام ہے۔ یہ انسان کو انسان نہیں ''کموڈیٹی'' سمجھتا ہے چنانچہ ان کے لیے ہم جنسی کے مریض بھی ایک ''کموڈیٹی'' ہیں۔ یہ لوگ عموماً چمڑے کے لباس پہنتے ہیں جو ایک لحاظ سے ان کا یونیفارم ہے چنانچہ چمڑے کے ملبوسات کی انڈسٹری وجود میں آئی۔ فلمیں، رسالے، کلب، ہم جنسی کے ''فوائد'' پر مبنی لٹریچر اور اسی طرح کی بے شمار چیزوں کے ذریعے مغرب کا سرمایہ دار اپنی تجوریاں بھرنے میں مشغول ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب ہم جنس پرستوں کے بڑے بڑے کنونشن منعقد ہوتے ہیں جن میں بعض بڑی اہم شخصیتیں بھی شرکت کرتی ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک اسی طرح کے کنونشن میں اس امر کی شدید مذمت کی گئی کہ ایک طبقہ ہم جنس پرستی کے خلاف معاندانہ ''پروپیگنڈے'' میں مشغول ہے کہ اس کی وجہ سے ایڈز کا مرض پیدا ہوا ہے حالانکہ یہ بات ابھی تک محض مفروضہ ہے۔ اس کنونشن میں کچھ مطالبات بھی کیے گئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ ملازمتوں میں ہم جنس پرستوں کے خلاف امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ اس دورے کے دوران میں نے بی بی سی ٹیلی ویژن سے ایک دستاویزی فلم بھی دیکھی جس میں ان لوگوں کو ''میاں بیوی'' کے طور پر ''خوشگوار ازدواجی زندگی'' بسر کرتے دکھایا گیا تھا، ان میں ایک ''انڈین جوڑا'' بھی تھا۔ امریکہ میں ایک امرد پرست سے اس مسئلے پر میری بات ہوئی تو اس نے بہت جوشیلے انداز میں کہا کہ ہم جنس پرستی غیر فطری فعل نہیں، غیر معمولی فعل ہے۔ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ عورت کی وجہ سے ہزار ہا لوگ قتل ہوئے ہیں لہٰذا دنیا میں محبت اور اخوت کی فضا پیدا کرنے کے لیے ہم جنسی کا فروغ ضروری ہے۔

مغرب کے نظام زر کی بنیاد ہی ہوس زر پر ہے۔ وہ انسان کی فطری اور غیر فطری کمزوریوں کو مہمیز بنا دیتا ہے اور پھر اسے اپنے شکنجے میں اس طرح کس لیتا ہے کہ اس کے لیے اپنا آپ چھڑانا مشکل ہو جائے۔ لندن کے کلب میں، میں نے جن ہم جنسوں کو کانوں کے پردے پھاڑنے والے میوزک پر پاگلوں کی طرح رقص کرتے دیکھا

، مغرب کا نظام زر اس بیمار اقلیت کا علاج کرنے کی بجائے اسے اکثریت میں تبدیل کرنے میں کوشاں ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ صنعتوں کا متقاضی اس کا معاشی ڈھانچہ برقرار رہ سکے۔ لندن کے امرد پرستوں کے کلب کے باہر جو سیاہ پوش ہمارا راستہ روکے کھڑا تھا، وہ یہ نظام خود تھا۔ وہ ہم دو معصوم گاہکوں کو اندر جانے سے اس لیے روک رہا تھا تاکہ وہ ہماری وجہ سے اپنے دس حقیقی گاہکوں سے محروم نہ ہو جائے۔''(۱۰۰)

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ سفرنامہ نگار دنیا کی رنگینیوں میں کھو گیا ہے اور ان کی چکا چوند نے اہل وطن کی محبت اس کے دل سے محو کر دی ہے۔ یورپ، امریکہ، تھائی لینڈ، سنگاپور اور آسٹریلیا وغیرہ میں ہر لحہ اور ہر جگہ انہوں نے اپنے سچے پاکستانی ہونے کا ثبوت فراہم کیا اور یہ ثابت کیا کہ پاکستانی سفرنامہ نگار کہیں بھی جائے وہ پاکستان اور پاکستانیوں کے حالات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں میں یورپ اور امریکہ کی تہذیب کے متعدد رخ پیش کیے ہیں خصوصاً ان معاشروں کی جنسی بے راہ روی کو انہوں نے ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری دوران مطالعہ اس تہذیب سے کراہت محسوس کرنے لگتا ہے۔ مغرب میں تو جنسی بے راہ روی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہاں کے مرد مخصوص ہارمونز اپنے جسم میں انجکٹ کراتے ہیں۔ جس سے ان کے جسم کے بال جھڑ جاتے ہیں اور ابھار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یوں وہاں خصوصاً مردوں میں زنانہ پن پیدا ہونے لگا ہے اور مردانگی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ عورتوں میں مردانہ خصوصیات پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہم جنس پرستی بھی ہے۔ یوں مردوں نے عورتوں جیسے حلیے اور عورتوں نے مردوں جیسے حلیے اپنائے ہوئے ہیں جس کا نفسیاتی اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ جنسیات میں اس فعل کو ''ایونیت'' کہتے ہیں یعنی عورت کا مردانہ لباس پہن کر اور مرد کا زنانہ لباس پہن کر جنسی تسکین حاصل کرنا۔ ایسے افراد اپنے حلیے کو مخالف جنس کے حلیے جیسا بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اس سے حظ اٹھاتے ہیں۔ ایسے افراد اس فعل سے بھی جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے ان معاشروں میں پائی جانے والی ایونیت کو بھی بیان کیا ہے اور اپنے طنزیہ و مزاحیہ رنگ میں وہاں کے مردوں اور عورتوں کے کھرے کھوٹے رویوں کو اپنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ عطا نے اپنے سفرناموں میں یورپ اور امریکہ کے لوگوں کی جنسی ہوس کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ ان معاشروں میں جنسی تلذذ کے مختلف طریقے ہیں جو زیادہ تر بلکہ اکثر غیر فطری ہیں جن کو وہ بُرا تصور نہیں کرتے۔ ان موضوعات کو عطا نے بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے اور ان معاشروں کا اصل چہرہ قارئین کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''باتیں کرتے کرتے اچانک انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''آپ یہ لڑکی دیکھ رہے ہیں؟''

''جی دیکھ رہا ہوں'' میں نے جواب دیا، مگر مجھے ان کا یہ سوال کچھ سمجھ نہیں آیا۔

''کیسی ہے؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک اور عجیب سا سوال کیا۔ دیکھنے میں یہ صاحب خاصے معزز لگتے تھے لیکن اپنے اس سوال سے وہ مجھے کچھ مشکوک سے لگے، میں نے سرسری سے انداز میں کہا ''خوبصورت ہے۔''

''لیکن میں آپ کو بتانا یہ چاہتا ہوں'' وکیل صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ''کہ یہ لڑکی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہی کہ یہ مرد ہے۔ یہاں یہ مخلوق بہت وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ یہ مخصوص ہارمونز اپنے جسم میں انجکشن کراتے ہیں، جس سے ان کے جسم کے بال جھڑ جاتے ہیں اور ابھار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی کسی مردانہ حرکت سے پہچانے جائیں تو پہچانے جائیں ورنہ طبی معائنے کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔'' وکیل صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک اور بات جناب عالی'' نیم خواندہ نوجوان نے گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔

''کئی تماش بین انہیں لڑکی سمجھ کر لے جاتے ہیں اور پھر انہیں اپنی عزت بچانا مشکل ہو جاتی ہے۔'' نوجوان کے اس بے ساختہ اظہار پر میری ہنسی نکل گئی۔

''اور یس'' نوجوان کو غالباً ایک اچھا سامع مل گیا تھا۔ اس مصطفیٰ اسٹور کے پیچھے ان زنانوں کا بازار ہے جہاں یہ بن سنور کر بیٹھے ہوتے ہیں ان کی کھولیوں کے ساتھ طوائفوں کی کھولیاں بھی ہیں مگر گاہکوں کے لئے کھرے کھوٹے کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے یہاں لفظ کھرے اور کھوٹے کے استعمال نے ایک دفعہ پھر مجھے بہت مزا دیا۔''(۱۰۱)

''سوہو کے علاقے میں فاحشہ عورتیں دیواروں کے ساتھ لگی کھڑی تھیں یا کسی ہال میں ہونے والے شو میں شرکت کی دعوت کاروباری تبسم اور اشاروں کے ساتھ

دے رہی تھیں۔ اس علاقے میں جنسی رسالوں، جنسی ادویات اور جنسی اعضا کی دکانیں تھیں پیپنگ شو تھے جس کے لئے کھڑکی میں سکہ ڈال کر عورت کی تذلیل کا زندہ تماشا دیکھا جا سکتا تھا۔ سوہو کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد واپس جاتے ہوئے افتخار عارف نے کہا ''تم نے جنس کی یہ ارزانی دیکھی؟ یہ جنس نہیں، جنس کا ہیضہ ہے۔ مجھے اس جاپانی سے ہمدردی ہے مگر بیٹے والے گھر میں سوچ سمجھ کر جانا چاہیے!''(۱۰۲)

بہت سے لوگ دوسروں کو دیکھ کر جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ عموماً عورتیں تقریباً اس سے مبرا ہوتی ہیں۔ اس نوع کے لوگ دوسروں کو جنسی ملاپ کرتے دیکھ کر محظوظ ہوا کرتے ہیں۔ خواہ وہ فلموں کی صورت میں ہو یا تصاویر کی شکل میں۔ بعض لوگ چھپ چھپ کر عورتوں کو کپڑے اُتارتے ہوئے دیکھ کر ہوس دید کی تشفی کرتے ہیں۔ خصوصاً یورپی معاشروں کی عکاسی کرتے ہوئے ہوس دید کے بہت سے مناظر عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں کا حصہ ہیں۔ مغرب کے لوگ ہوا و ہوس کی رو میں بہہ کر جنسی خواہش کی تسکین کو زندگی کا واحد مقصد سمجھتے ہیں اگرچہ بعض اوقات یہ رویہ مریضانہ شکل بھی اختیار کر جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں میں ہوس دید جیسی نفسیاتی بیماری پر بھی قلم اٹھایا ہے اور ان لوگوں کی عکاسی کی ہے جو ہوس دید سے اپنی جنسی تشفی کرتے ہیں اور اس فعل سے حظ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں وہ خود پر بھی کہیں کہیں طنز کرتے ہیں اور یوں سفرنامے کو بوریت کا شکار ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ عطا کے سفرنامے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ رنگ کی وجہ سے بھی عوام میں پسند کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھ جانے والے لوگوں اور مختلف کرداروں کی دلچسپ باتوں اور حرکتوں سے بھی مزاح پیدا کیا ہے تاکہ سفرنامہ محض بے رنگ اور خشک معلومات کا مجموعہ نہ بن جائے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

''فٹ پاتھ پر ایک شخص چھوٹے سائز کی رنگین تصویریں بیچ رہا تھا۔ یہ حسیناؤں کی تصویریں تھیں جو پورے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ دو تین انچ کی تصویر ہو حسینہ نے کپڑے بھی پہنے ہوں۔ اس لحاظ سے قیمت بہت کم ہونا چاہیے تھی لیکن قیمت تصویر کے ''اوصاف'' سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ معمہ بھی نیم خواندہ نوجوان نے حل کیا۔

''سر جی! یہ کوئی معمولی تصویر نہیں ہے'' نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا'' بچارے چھڑوں کا گزارہ اسی پر ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں کچھ سمجھا نہیں۔'' مجھے واقعی سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''جناب! یہ جو تصویر ہے نا، مقامی اور غیر ملکی محنت کش طبقہ سارا دن محنت مزدوری کرنے یا دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد شام کو چائے کا ایک کپ پینے بیٹھتا ہے تو جو ذرا رنگیلے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اس تصویر کو چائے کے کپ کے ساتھ چسپاں کر دیتے ہیں!''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں نے پوچھا

''بہت فرق پڑتا ہے سر جی'' نوجوان ایک دفعہ پھر ہنسنے لگا تھا۔ ''تصویر میں کوئی ایسا کیمیکل موجود ہے جو گرم چائے کی حرارت سے پگھلنے لگتا ہے۔ جس کے نتیجے میں حسینہ کے کپڑے ایک ایک کر کے اُترنے لگتے ہیں اور پھر چائے کا کپ ختم ہونے تک وہ مکمل طور پر بے لباس ہو جاتی ہے۔

''لاحول ولا قوۃ'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔

''آپ لاحول پڑھ سکتے ہیں جناب'' نوجوان اس بار قدرے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''وہ لوگ نہیں جن کی ساری زندگی دوسروں سے دھوکے کھانے اور خود دھوکے دینے میں گزرتی ہے۔ ایسے لوگ گناہ ثواب کے دائرے سے نکل جاتے ہیں۔''(۱۰۳)

''یہ ٹاپ لیس (TOPLESS) ہے۔ یہاں خواتین وحضرات صرف جانگیہ پہن کر آتے ہیں، ویسے اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اب مغرب کے تقریباً تمام ساحل سمندر ''ناروا'' پابندیوں سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں بلکہ جہاں پانی نظر آئے، وہاں ان کی آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے۔ چنانچہ اب سوئمنگ پول اور ساحل سمندر بھی گھروں کے باتھ روم میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ آج پیر کا دن ہے اور یہاں بہت کم لوگ ہیں اور جو ہیں بھی انہیں غالباً پتہ چل گیا ہے کہ پاکستان سے کوئی گروپ آیا ہے چنانچہ وہ ڈر کے مارے اپنے کپڑوں میں ڈھکے بیٹھے ہیں۔ مغرب والوں نے ایکسرے تو کہیں بہت بعد میں ایجاد کیا، ہم لوگ ایک عرصے سے بغیر کسی مشین کے صرف آنکھوں سے پورے جسم کا ایکسرے اتارنے کے کام میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔''(۱۰۴)

''توبہ توبہ توبہ'' بٹ صاحب نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اور ہاتھ کی انگلیوں کے دریچے میں سے سامنے کھڑی نیم عریاں حسینہ کو جھانکتے ہوئے کہا'' کتنی بے

حیائی بی ہے۔''

میں نے بٹ صاحب کی بات پر یقین کرنے کی بجائے اس بی بی کی بے حیائی کا ''بقلم خود'' جائزہ لینے کے لیے اسے آنکھ بھر کر دیکھا تو وہ سخت ناراضی کے عالم میں پاؤں پٹختی آگے نکل گئی، بٹ صاحب نے گردن موڑ کر اس کی بے حیائی کا دوسرا حصہ ادا اس آنکھوں سے دیکھا اور پھر توبہ توبہ کرتے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور بہت دیر تک اہل مغرب کے دیدوں کا پانی ڈھلنے پر اظہار افسوس کرتے رہے۔

''قاسمی صاحب! ایک بات بتائیں۔ بٹ صاحب نے جھک کر جوتے میں سے ریت نکالتے ہوئے کہا

''یہ بی بی ناراض کیوں ہو گئی ہے؟''

''ہمارے دیکھنے سے، دراصل مغرب میں کنکھیوں سے دیکھنے کی اجازت ہے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی نہیں۔''

''عجیب بات ہے، ہمارا دیکھنا اُسے بُرا لگا، اپنا اس طرح باہر پھرنا بُرا نہیں لگا۔ وہ کیا کسی شاعر نے کہا ہے۔

سب مجھ سے کہتے ہیں رکھ نیچی نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

۔۔۔سمندر سے آنے والی ہوائیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں لیکن ان ہواؤں میں اب سردی کی لہر بھی شامل ہو گئی تھی۔۔۔ میں نے بٹ صاحب سے کہا ''بٹ صاحب، اس بے حیائی بی کو آج ضرور نمونیہ ہوگا'' بٹ صاحب بولے'' کتھے جی یہ شراباں پینے والی قوم ہے، ان کو کچھ نہیں ہوتا۔''(۱۰۵)

''ذرا اوپر گورے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ اس دن گرمی بھی زیادہ تھی مگر ان کے لباسوں سے لگتا تھا کہ بہت زیادہ ہے۔ حسن ایک لڑکی کو بہت بُری طرح گھور رہا تھا، اس کے گھورنے میں بہت غصہ تھا کیونکہ وہ لڑکی خاصی بے حیا قسم کی تھی۔ جب حسن نے کچھ دیر تک نظریں نہ ہٹائیں تو میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا'' اب بس کرو بلکہ اگر میری مانو تو عزت بچا کر یہاں سے نکل چلو۔''

''وہ کیوں؟'' حسن نے پوچھا۔

''اس لیے کہ لڑکی کے ساتھ جولڑکا ہے وہ لڑکی سے بے نیاز تھیں انہیں نظروں سے گھور رہا ہے، جن نظروں سے تم اس لڑکی کو گھور رہے ہو۔'' حسن نے اسے دیکھا تو اس کی گھگی بندھ گئی اور اس نے فوراً قدم آگے بڑھا دیئے۔''(۱۰۶)

''مغرب والے گھر سے نکلتے وقت یہ سوچ کر نکلتے ہیں کہ بہت سے صاحبانِ نظر ہزاروں میل کا سفر صرف ان چہروں کو دیکھنے کے لیے طے کرتے ہیں جن کے دیکھے سے منہ پر رونق آجاتی ہے اور بقول شاعر وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے چنانچہ حسینانِ فرنگ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ گھروں سے نکلتے ہیں اور یوں فضا کچھ اُجلی اُجلی سی لگنے لگتی ہے۔''(۱۰۷)

عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے ان کی شگفتہ نگاری اور مشاہدے کی گہرائی کے بے مثال نمونے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں فراوانی شوق، شوخی تحریر اور حالات و واقعات کی رنگینی بھی شامل ہے۔ یورپی تہذیب کا اپنی تہذیب و معاشرت سے موازنے کا انداز بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ وہ ایسے موازنے اور مقابلے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں گنواتے اور دو مختلف تہذیبوں کے تحت زندہ رہنے والوں کی طرزِ معاشرت کو پیش کر کے ان کی اچھائیوں اور برائیوں کا کچا چٹھا پیش کر دیتے ہیں۔ عطا نے اپنے سفرناموں میں مغرب کے ثقافتی تضادات پر بھی لکھا ہے۔ وہ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں غیر ملکی معاشرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے وطن میں رہنے کی برکات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ اس تجزیے یا مطالعے کو بظاہر وہ اپنے مخصوص نیم مزاحیہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں مگر اس میں تفکر کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی ملکی معاشرت کو غیر ملکی معاشرت کے مقابلے میں کھڑی کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہی ان کی سب سے بڑی انفرادیت بھی ہے۔ اس طرح عطا کے سفرناموں میں جنس نگاری کی عمومی سطح نہیں ملتی اور نہ ہی انہوں نے جنس نگاری کا سہارا اتلذذ کے نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ ان کے ہاں جنس نگاری کی اعلیٰ علمی و ادبی سطحیں جا بجا ملتی ہیں گویا انہوں نے اعلیٰ حقائق کے بیان کے لیے جنس نگاری کا سہارا لیا ہے۔ جنس زندگی کا حصہ ہونے کی حیثیت سے ادب کا موضوع ہے۔ عطا کے سفرناموں کے مطالعے سے ادب اور جنس کا ربط و تعلق بھی بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان کے ہاں جنس نگاری کے حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن کے مطالعے سے مغرب اور مشرق کے اپنے اپنے اخلاقی معیارات اور اقدار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

''راہداری سے دائیں جانب مڑتے ہی غسل خانوں پر نظر پڑی۔ سب لوگ غالباً نہانے کے لیے بہت بے تاب تھے کیونکہ انہوں نے باہر ہی سے کپڑے اتار

نا شروع کر دیئے۔ ارسلا نے مشرقی طرز کی کڑھی ہوئی میکسی اتاری اور خراماں خراماں غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ ڈھلکے ہوئے جسم والی ماریا نے بوشرٹ کے بٹن کھولے اور پھر یوں لگا جیسے کوئی چھت نیچے آن گری ہو۔ اسکاٹ اور جان نے بھی ایک ایک کر کے کپڑے اتارے اور پھر تنگ دھڑنگ میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ باقی تو خیر ٹھیک تھا مگر میں نے اس منظر سے آنکھیں چرا لیں۔ اسکاٹ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا اور اب صرف میں اور جان باہر رہ گئے کیونکہ غسل خانے صرف تین تھے۔ اگر ان کا طول و عرض دو آدمیوں کو بیک وقت اپنے اندر سمیٹنے کی گنجائش رکھتا تو شاید جان، ماریا کے ساتھ غسل خانہ شیئر Share کر رہا ہوتا۔ سو اس نے سگریٹ سلگایا اور عریاں حالت میں میرے سامنے آن کھڑا ہو گیا۔ تاہم اسے شرم و حیا کا کچھ نہ کچھ پاس ضرور تھا کیونکہ اس نے بہر حال گول گول چشمہ نہیں اُتارا تھا۔ مشرع داڑھی اور چہرے کو حد درجہ ثقہ بنا دینے والی اس عینک کے ساتھ وہ جس صورت میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس پر ضبط کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی۔ دراصل ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے ایک عظیم سیاسی رہنما کی شبیہ گھوم گئی تھی۔

کیا بات ہے۔ ہنس کیوں رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

''کچھ نہیں!'' میں نے ہنسی ضبط کر کے بات بدلتے ہوئے کہا'' ان لوگوں نے نہانے میں اتنی دیر لگا دی ہے، گویا غسل خانوں کو رہائشی کمروں کے طور پر استعمال کرنے کی تمہاری تجویز انہیں واقعی بہت پسند آئی ہے۔''

''ہاہاہا'' جان نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ''مجھے بھی کچھ ایسے ہی لگتا ہے۔''

پھر اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے پرے پھینکا اور ماریا والے غسل خانے کی طرف بڑھا۔ ان غسل خانوں کے دروازے تین چار فٹ سے زیادہ چوڑے نہیں تھے۔ ان میں چٹخنی بھی نہیں تھی بلکہ یہ اندر اور باہر دونوں طرف کھلتے تھے چنانچہ بالائی حصے سے نہانے والوں کے شانے اور نچلے حصے کے خلاء سے پاؤں سے پنڈلی تک کے حصے باہر سے نظر آتے تھے۔ جان نے آگے بڑھ کر غسل خانے کے دروازے کو باہر کی طرف کھولا اور ماریا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے باہر کھینچ لایا۔

''یہ تمہاری زندگی کا آخری غسل نہیں ہے!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا'' فی

الحال اتنے ہی پر اکتفا کرو۔" ماریا سر کے بال اور منہ دھو چکی تھی اور اس کے بقیہ جسم پر صابن کا جھاگ تھا، جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نہانے کے عمل سے ابھی فارغ نہیں ہوئی سو اس نے مصنوعی غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور "ڈونٹ بی سلی (Dont Besilly) " کہہ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوبارہ غسل خانے میں داخل ہوگئی۔ جان نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور پھر اسی ہیئت کذائی میں میرے سامنے کھڑا ہو کر عالمی سیاسیات پر گفتگو کرنے لگا مگر میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکاٹ سیٹی بجاتا ہوا غسل خانے سے اسی عالم میں برآمد ہوا جس حالت میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جان کے لیے کوئی "کرٹسی" دکھائے بغیر جلدی سے دروازہ کھولا اور غسل خانے میں داخل ہوگیا۔"(۱۰۸)

"جو چیز اہلِ مغرب کے کلچر کا حصہ ہو، وہ اس کے نقصانات کی پروا نہیں کرتے چنانچہ نہ شراب پر پابندی عائد کی جاتی ہے اور نہ شراب خانوں میں سگریٹ نوشی پر۔ اہل مغرب کے ثقافتی تضادات بہت دلچسپ ہیں، آپ سلیپنگ سوٹ پہن کر باہر سڑک پر نکل آئیں تو اتنا ہی ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے جتنا ہمارے ہاں کسی کے سر بازار برہنہ ہونے ہو سکتا ہے لیکن اگر مغرب میں آپ برہنہ باہر نکل آئیں تو یہ چنداں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔"(۱۰۹)

"ہم دوست ہائیڈ پارک میں چلے گئے جہاں مقامی باشندے قطار در قطار گھاس پر لیٹے ہوئے تھے اور وہ موسم کا لطف اٹھانے کے لیے ہم سے مختلف قسم کے "ہتھکنڈے" استعمال کر رہے تھے۔ ان ہتھکنڈوں کی تفصیل اگر مخرب اخلاق نہ ہوتی تو میں ضرور بیان کرتا۔ دراصل ہم لوگوں کا اخلاق اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ جلوت کو خلوت میں تبدیل کر دیا جائے اور دوسری طرف ہم لوگ اندھیرے اجالے میں چوکنے کے قائل بھی نہیں ہیں۔۔۔ انہیں پوری طرح موج میں دیکھنا ہو تو ساحل سمندر پر دیکھیں۔ برطانیہ تو پھر آرتھوڈاکس ہے، یورپ کے دوسرے ممالک میں ساحل سمندر کے گھر کے غسل خانے کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ویسے مجھے اپنے معاشرے کی طرح مغرب والوں کے دہرے اخلاقی معیاروں کی بھی سمجھ نہیں آتی۔ ایک طرف ساحل سمندر اور سوئمنگ پول کو انہوں نے "چادر اور چار دیواری" سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے اور دوسری طرف اگر آپ سیلنگ سوٹ پہن کر کسی معزز مہمان کے سامنے آ جائیں تو وہ

مارے حیا کے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں قیامِ امریکہ کے دوران تو میں نے اپنی بے خبری کی وجہ سے "بے شرمی" کی حد ہی کر دی۔ میں سلیپنگ سوٹ میں ملبوس آنکھیں ملتا ہوا سامنے کی دکان سے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی خریدنے چلا گیا، وہاں ایک خاتون پہلے سے سودا خرید رہی تھی، اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی تو میری "بے لباسی" پر اس کی چیخ نکل گئی۔ دکاندار نے بھی ڈبل روٹی مجھے پکڑاتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں۔۔۔ اس دوران شدید نروس ہو گیا تھا اور مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے پردہ کیوں کر رہے ہیں۔ جب پتہ چلا تو پھر بہت ساری باتوں کا پتہ چلا مثلاً یہ کہ ہم جو اپنے دوستوں کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہیں بلکہ بسا اوقات ان کی کمر میں بھی ہاتھ ڈال دیتے ہیں تو یہ اہلِ مغرب کے نزدیک کافی معیوب حرکتیں ہیں۔ شروع شروع میں جب میں نے سڑک پر چلتے ہوئے اپنے پاکستانی دوست کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچانک نروس ہو گیا اور اس نے میرا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ میں نے دوبارہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ناراض ہو گیا اور خفگی کے عالم میں بولا "یار تم کیوں مجھے بدنام کراؤ گے، یہاں اس کا مطلب کچھ اور لیا جاتا ہے۔"

"کیا مطلب لیا جاتا ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"وہی جو پاکستان میں اگر کوئی عورت اور مرد ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل رہے ہوں تو ان کے تعلقات کے بارے میں لیا جاتا ہے!"(۱۱۰)

عطاء الحق قاسمی نے مغرب کے معاشرے کو بالغ نظری سے دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ اسے اپنانے کے بعد عورت تو باقی رہتی ہے لیکن اس کی نسوانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس تہذیب میں بے حیائی اور بے باکی کو معیوب نہیں خیال کیا جاتا۔ وہاں اول تو شادی کا ادارہ بہت کمزور ہو چکا ہے اور اگر شادی ہو بھی جاتی ہے تو عورت شوہر کی تابع فرمانی اور خدمت کو اپنے لیے باعث توہین سمجھتی ہے۔ وہ گھر کی بجائے باہر کی دنیا کو اپنی آماج گاہ سمجھتی ہے۔ جسم کی نمائش اس کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ سیر و تفریح کی دیوانی ہے اور ہوا و ہوس کی پرستار ہے۔ گھر بار سنبھالنا اور بچوں کی پرورش اور نگہداشت وغیرہ اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ عطاء نے مغرب میں عورت کی آزادی کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے مغرب میں جو ہر سال لاتعداد ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں ان کا بیان بھی عطا کے سفرناموں کا حصہ ہے۔ خصوصاً وہاں جو مسلمان مقیم ہیں، ان کی اولاد بھی اسی ماحول کی پیداوار ہے لہٰذا ان لوگوں کی اگلی نسل بھی آہستہ آہستہ اسی تہذیب

کا حصہ بن کر مغربی تہذیب کے سمندر میں غرق ہوتی جا رہی ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی عورت کو جنس لطیف کی بجائے جنس کثیف قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ان معاشروں کے نائٹ کلبوں، ہوٹلوں اور عیاشی کے اڈوں کے بارے میں کھل کر لکھا ہے۔ انہوں نے یورپ میں اخلاقی بے راہ روی، عریانی، فحاشی اور جنسی کجروی کو بھی اپنے خوبصورت اسلوب میں تحریر کیا ہے۔ وہ یہ مناظر دیکھ کر مشرقی تہذیب کے اور بھی زیادہ دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن میں انہوں نے مغربی تہذیب کا اصل چہرہ پیش کیا ہے:

''اس گلی کے علاوہ پیچ در پیچ گلیوں میں سینکڑوں کی تعداد میں جنس کا ''جمعہ بازار'' لگا ہوا ہے اور یہ جنس، جنس لطیف نہیں، جنس کثیف کی صورت میں ہر موڑ پر کھڑی نظر آتی ہے۔ اور پھر قطار اندر قطار نائٹ کلب ہیں۔ جہاں دنیا کے بدترین شوز پیش کیے جاتے ہیں جنہیں کہنے والے بہترین شو بھی کہتے ہیں۔ ہر کلب کے باہر ایجنٹ راہگیروں کو روک روک کر ''رازہائے درون خانہ'' سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ بازو سے کھینچتے ہوئے اندر لے جاتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر باہر لے آتے ہیں۔ ایک جھلک ہمیں بھی دکھائی گئی ہے جو عورت مرد کے تعلق کے حوالے سے ہے اور جس کا برسر اسٹیج مظاہرہ انسان کو شرف انسانیت سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں گائے بھینسوں کو جس طرح شام کے بعد باڑے میں بند کر دیا جاتا ہے، ایک اسی طرح کا باڑہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی یہی لطیف مخلوق بند ہے۔ گاہک باڑے کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہیں اور ان گائے بھینسوں کو ٹٹولنے کے بعد ہانک کر لے جاتے ہیں۔ ایک بازار ہے جس کے باہر لکھا ہے۔ ''صرف مردوں کے لئے'' یہاں تماشائی بھی مرد ہیں اور تماشا بھی مرد ہیں ۔۔۔ یہاں نظر پڑتی ہے۔ ایک نوجوان لڑکی اور لڑکے پر لڑکی کی گود میں ایک بچہ بھی ہے مگر یہ اس بات کا بہرحال کوئی ثبوت نہیں کہ وہ میاں بیوی ہیں، ان کے ساتھ آٹھ دس کتے ہیں، جن سے سڑک پر چلنے والے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ یہ ''خواجہ سگ پرست'' جدھر جاتا ہے، دم ہلاتے ہوئے کتے اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ لوگ یہ انوکھا منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ واپس کار کی طرف جاتے ہوئے ایک شخص ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ''انڈین؟''

''نہیں پاکستانی!''

''اس سامنے والے کلب میں ایک پاکستانی لڑکی کا بہترین شو۔ کوئی

انٹری فیس نہیں تم اس کی ایک جھلک مفت بھی دیکھ سکتے ہو!''

جی چاہتا ہے کہ زمین کا سینہ شق ہو جائے اور ہم اس میں سما جائیں!''(۱۱۱)

''یہ ''ہیلتھ کلب'' قحبہ خانے سے کچھ زیادہ مختلف چیز نہیں ہوتی۔ یہاں یقیناً وہ سب کچھ بھی ہوتا ہے جو ہیلتھ کلب میں ہونا چاہیے لیکن ان کا اصل کاروبار ان حسین ''دوشیزاؤں'' کا مرہونِ منت ہے جو برہنہ مردوں کا مساج نیم برہنہ حالت میں کرتی ہیں اور پھر معاملات طے ہونے پر فوراً ان کی تقلید پر اتر آتی ہیں۔ ہوٹل میں مسافروں کو ''مساج'' کے ضمن میں روم سروس کی سہولت بھی حاصل ہے، بس اس کے لیے تھوڑا سا معاوضہ زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ سنگاپور میں عیاشی کے مواقع یقیناً وافر تعداد میں موجود ہیں لیکن اسے بنکاک بہرحال نہیں بننے دیا گیا۔ بنکاک میں جو صورت حال ہے اس کی شدت کا اندازہ آپ اس امر سے لگائیں کہ اس کے مقابلے میں سنگاپور شرفا کی بستی لگتی ہے۔''(۱۱۲)

''لڑکی کی سیاہ آنکھوں پر پلکوں کی لمبی لمبی جھالریں تھیں۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی تھی اور یہ وہ چہرہ تھا جو ایک طویل عرصے تک مخرب اخلاق چہروں کے ہجوم میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے اس چہرے پر لکھی ہوئی حیا کی خوبصورت تحریر انکھیوں سے پڑھنا شروع کر دی۔ یہی کام میرے برابر بیٹھا ہوا ایک لم ڈھینگ امریکی بھی کر رہا تھا جو غالباً اس حور بلغراد کے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ مگر فرق یہ تھا کہ میری نظریں اس حور شمائل کے طیب چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور اس کی آنکھیں چہرے سے نیچے دست درازیوں میں مشغول تھیں۔

''ہے، لک ایٹ دس چِک، ہاؤ سیکسی از شی؟'' میرے ہم نشست نے امریکیوں کے انداز فکر اور روایتی بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے ہاتھوں سے پیمائشی زاویے بناتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک ایستادہ تھیں۔

''تم ٹھیک کہتے ہو!'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ''کیا واقعی جنسی مخلوق ہے مجھے تو تم بھی خاصے جنسی معلوم ہوتے ہو۔''(۱۱۳)

طوائف کا بازار، کوٹھا، چکلہ گھر صدیوں سے قائم ایک منظم ادارہ ہے۔ مختلف ادوار میں اس کی مختلف شکلیں اور سماجی حیثیتیں رہی ہیں۔ زمانے کے تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات کی ضروریات کے تحت اس میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ کچھ مذاہب میں ابتداء اس کی سرپرستی بھی ہوتی

تھی، جیسے بابلیوں کی ایک رسم کے مطابق ہر جوان عورت کو زندگی میں ایک مرتبہ مندر میں جا کر کسی نہ کسی پاتری سے مقاربت کرنا پڑتی تھی۔ قدیم یونان میں افرودائتی کے مندر میں مقدس کسبیاں ہوتی تھیں جو پاتریوں اور پجاریوں کے تصرف میں آتی تھیں۔ اسی طرح ہندوستان کے مندروں میں بھی دیوداسیاں (مقدس طوائفیں) وہی فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ ان سب افعال کو علامہ نیاز فتح پوری مذہبی فاحشیاں قرار دیتے ہیں۔ جسم فروشی دنیا کا سب سے قدیم پیشہ ہے۔ عموماً یہ کاروبار مخصوص لوگوں ہی کے لیے دلچسپی کا باعث رہا ہے۔

طوائفیں جنس کو پیسے کی خاطر تقسیم کرتی ہیں۔ ان میں سے اکثر مردوں سے غصے اور نفرت سے پیش آتی ہیں۔ وہ مردوں کو معاشی حوالے سے استعمال کرتی ہیں اور وہ اس بات کا بہت دھیان رکھتی ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ایک مرد سے خلاصی حاصل ہو تا کہ دوسرے گاہکوں کی باری آ سکے۔ کچھ اپنی بیویوں کے ستائے اور کچھ برس ہا برس ایک ہی نوع کے مخصوص فریضے کی ادائیگی سے اکتائے اور کچھ جنسی گھٹن سے گھبرائے مرد گھریلو عورت کی نسبت بہت زیادہ آزاد اور جنسی حوالوں سے متنوع شخصیت کی حامل طوائفوں سے ملتفت ہوتے وقت ان سے بیویوں جیسی محبت اور ہمدردی کے خواہاں ہوتے ہیں جبکہ طوائف کی عمومی سائیکی میں پروفیشنلزم بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مغرب ہو یا مشرق طوائف کی سائیکی میں مادیت پرستی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے مختلف ممالک کے خواہ وہ نائٹ کلبوں کی شکل میں ہوں یا چکلوں کی صورت میں، طوائفوں کو سفرناموں کا موضوع بنایا ہے اور اس حوالے سے ان کے ہاں حقیقت نگاری ملتی ہے۔ انہوں نے مختلف ممالک کی عکاسی کی ہے جن کی معیشت کا زیادہ دارومدار جنس کے کاروبار پر مشتمل ہے۔ وہاں سب سے زیادہ کاروبار شراب، سگریٹ اور جنس کا ہوتا ہے۔ انہوں نے طوائف کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ طوائف خواہ کسی ملک کی بھی ہو اس کا سب کچھ پیسہ ہی ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں طوائف کا وجود اگرچہ ایک گالی ہی سمجھا جاتا ہے لیکن دبی خواہشات بڑھتی ہوئی جنسی گھٹن اور جنسی محرومیوں کے شکار لوگ وہاں جاتے ہیں۔ مغرب میں لوگ اس حوالے سے جدت اور تغیر کے خواہاں ہوتے ہیں اور وہ ایک قسم کی نئی لذت چاہتے ہیں۔ اس لیے وہاں اس فعل کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس حوالے سے ہر فرد آزاد ہے گویا یہاں لوگ جنسی گھٹن کی وجہ سے چکلوں کا رخ اختیار کرتے ہیں اور مغرب میں جنسی آزادی کی وجہ سے لوگ محظوظ ہونے کے لیے ایسی جگہوں پر جاتے ہیں۔ عطاء نے اپنے سفرناموں میں اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اور اس حوالے سے ان کے ہاں اس کی کئی تہیں ملتی ہیں۔ انہوں نے محض جنسی لذت کے بیان سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو موضوع

سخن نہیں بنایا۔ ان کے ہاں جنس نگاری کی عمومی سطحیں نہیں ملتیں بلکہ انہوں نے اعلیٰ حقائق کے بیان کے لیے جنس نگاری کا سہارا لیا ہے۔ ویسے بھی جب زندگی کی ایک بنیادی جبلت جنس ہے تو ادب سے کس طرح اس کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ جنسی جذبہ بھی غیر فطری نہیں اور ایسا بھی نہیں کہ کسی کسی میں ہوتا ہو لہٰذا حقیقت کا انکار خود فریبی ہے۔ طوائف کی شخصیت سے جنسیت کو علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ یہ اس کے کاروبار کا ضروری حصہ ہے۔ عطا جب ایسے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں تو ان کے ہاں طنز و مزاح کے ساتھ اچانک سوچ کی ایک لہر بھی در آتی ہے اور اس طرح ان کی تحریر میں تفکر کا عنصر غالب آ جاتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ عطا کے سفرناموں میں اس موضوع کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ حقیقتیں قبیح، مکروہ اور گھناؤنی بھی ہوتی ہیں۔ اس طرح عطا کے سفرناموں میں جنس نگاری کے تہذیبی اور حقیقی نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے:

"بٹ صاحب سونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن انہیں نیند نہیں آ رہی ،وہ پہلی دفعہ ملک سے باہر آئے ہیں اور وہ بھی ایک دم "زہد شکن" علاقے میں چنانچہ خاصے ڈسٹرب نظر آ رہے ہیں۔

"قاسمی صاحب! آپ نے دیکھا ایئر پورٹ پر لڑکیاں کس طرح ننگی پھر رہی تھیں؟"

"نہیں بٹ صاحب! ایسی تو کوئی بات نہیں ،انہوں نے کچھ کپڑے پہنے بھی ہوئے تھے۔"

"او چھڈو جی! جو کپڑے پہنے ہوئے تھے! ان میں سے بھی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔"

"مجھے بٹ صاحب آپ کی بینائی پر رشک آ رہا ہے۔"

"اور سنیں" بٹ صاحب نے میری طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا" جہاز میں ایک لڑکا اور لڑکی۔ چلو چھوڑو جی۔"

"کسنگ کر رہے تھے؟"

"او نہیں جی"

"ایک دوسرے سے لپٹ رہے ہوں گے۔"

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں جی۔"

"اس سلسلے میں اب میرے پاس مزید کوئی گنجائش نہیں رہی لہٰذا آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیں"

’’آپ کو میں کیا بتاؤں، آپ تو امریکہ میں دو سال رہے ہیں، آپ بتائیں وہاں کیا ہوتا ہے۔‘‘
’’وہاں لڑکے لڑکیاں بغیر نکاح کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔‘‘
’’واقعی؟‘‘
’’تو اور کیا!‘‘
’’بہت بے شرمی ہوگی وہاں‘‘
’’بہت!‘‘
’’بہت زیادہ؟‘‘
’’مثلاً کیا کرتے ہیں وہ؟‘‘
’’میں نہیں بتا سکتا!‘‘
’’آخر کچھ تو بتائیں قاسمی صاحب‘‘

مگر بٹ صاحب کا یہ تجسس صرف پہلے دن تھا، آسٹریلیا کے دورے کے آخری دن مغربی اقوام کے حوالے سے انہوں نے ایک ایسی بات کہی کہ میں دنگ رہ گیا۔ اس ایک جملے میں اہل مغرب کے ظاہر اور باطن کا تضاد اور ان کے استحصالی رویے سمٹ آئے تھے۔ بات انہوں نے منچلے انداز میں کہی لیکن پتے کی کہی ’’قاسمی صاحب! یہ قومیں طوائفوں کی طرح بے حد مہذب اور انہیں کی طرح اپنے شکار کی کھال اتارنے والی ہیں۔‘‘(۱۱۴)

’’سر! بیوٹی فل ینگ لیڈی۔ اونلی ٹو ہنڈرڈ ڈالرز فار ہول نائٹ‘‘ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر میرا جی چاہا اسے کہوں کہ تم ایک محنت کش انسان ہو، انتہائی مشقت سے اپنی روزی کماتے ہو، کیوں اس حلال میں حرام کی آمیزش کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ مگر پھر میں نے سوچا کہ اس نوع کے حلال اور حرام کے تصورات تو صرف ہمارے اپنے معتقدات کی دین ہیں لہٰذا اسے میری بات کیا سمجھ آئے گی؟ چنانچہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر میں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ وہ کافی دور تک میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا وہ اس بات پر مصر تھا کہ میں اس حسینہ کو صرف ایک نظر دیکھ لوں اور اسے دیکھنے کی کوئی فیس نہیں ہے، جب اس نے دیکھا کہ ’’صاحب‘‘ مرے سے متوجہ نہیں ہے تو وہ مایوسی کے عالم میں واپس اپنے رکشے کی طرف لوٹ گیا۔‘‘(۱۱۵)

’’درختوں کے جھرمٹ میں چار خوبصورت میمیں کھڑی ہیں۔ ’’تیر و تفنگ‘‘ کمانیں

کھینچی ہوئی ! ہم ان کے برابر سے گزرتے ہیں۔
’’بزنس لو (کاروباری محبت)‘‘ ایک مترنم آواز آتی ہے۔
’’بزنس لو‘‘ دوسری آواز
’’بزنس لو‘‘ تیسری آواز
’’بزنس لو‘‘ چوتھی آواز

’’بزنس لو‘‘ یہ پانچویں آواز حسن کی ہے! خالد بھرپور نظروں سے حسن کا جائزہ لیتا ہے۔ ہم ایک لمحے کے لیے رک جاتے ہیں۔ وہ چاروں دوشیزائیں دوڑتی ہوئی ہماری طرف آتی ہیں۔ ’’صرف بیس پاؤنڈ پر ہیڈ! ایچ ڈیل میں ’’خصوصی رعایت‘‘۔

ایسے لگتا ہے جیسے عورت کی عصمت نہیں، کارخانے میں تیار ہونے والی پلاسٹک کی مصنوعات بیچی جا رہی ہیں۔

میں۔۔۔ بازار سے گزرے ہیں، خریدار نہیں ہیں۔

اور پھر ہم تیز تیز چلتے ہوئے واپس اپنی کار کی طرف بڑھتے ہیں۔ میموں کی فحش گالیاں ہمارا پیچھا کر رہی ہیں۔ ہم نے ان کی ’’عزت نفس‘‘ کو جو ٹھیس پہنچائی ہے اتنے میں پھر پولیس کی ایک وین ہم سے ذرا فاصلے پر رکتی ہے۔ حسن کا رنگ زرد ہو جاتا ہے، وہ دوڑ کر کار میں بیٹھنے کے لیے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے مگر دروازہ اندر سے لاک ہے وین میں سے پولیس والے تین چار لڑکیوں کو دھکا دے کر باہر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی ہے جس کی شکل پر لعنت برس رہی ہے۔ یہ ان لڑکیوں کا دلال ہے۔ پولیس کی وین آگے نکل جاتی ہے اور یہ لڑکیاں اور ان کا دلال خوشی سے چیختے ہوئے درختوں کے جھرمٹ کی طرف بڑھتے ہیں جہاں پہلے سے کھڑی لڑکیاں پولیس کی وین کو دیکھ کر ادھر ادھر ہو گئی تھیں اور اب دوبارہ ایک جگہ کھڑی تھیں۔

میں ——— یہ کیا تماشا ہے؟
آدم ——— نورا کشتی ہے؟
طارق ——— وہ کیسے؟
آدم ——— طوائفوں پر قانونی طور پر پابندی ہے مگر پولیس کو پتی ملتی ہے۔ وہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کبھی کبھار پکڑ کر لے جاتے ہیں اور پھر ’’ثبوت‘‘ نہ ہونے کی وجہ سے اسی طرح سڑک پر اتار جاتے ہیں جس طرح ابھی

اتار کر گئے ہیں! یہاں انہی چند شعبوں سے پولیس مال بناتی ہے۔"(۱۱۶)

"میں اور ضمیر صاحب جس بازار میں سے گزر رہے تھے، وہاں حوا کی بیٹیاں اپنی کھولیوں سے باہر جنس کا اشتہار بنی کھڑی تھیں، یہ طوائفیں بھی نہیں ٹکیائیاں تھیں، انہوں نے بھونڈا میک اپ کیا ہوا تھا وہ راہگیروں کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور ایسے جملے چست کرتی تھیں کہ "شرفاء" کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی تھیں۔ میں ضمیر صاحب سے باتوں میں مگن سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا کہ اچانک بیس بائیس سال کی ایک دراز قد "دوشیزہ" نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور کھولی کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نروس ہو گیا اور میری گھبراہٹ میرے چہرے سے کچھ اس درجہ نمایاں تھی کہ اس نے اور ارد گرد کھڑی ٹکیائیوں نے کھڑ کھڑ ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے بے بسی سے ضمیر صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ ہنس رہے تھے۔ میں نے بازو چھڑانے کی کوشش کی مگر مجھے یوں لگا جیسے میری قوت سلب ہو گئی ہو۔ "دوشیزہ۔" نے ہنستے ہوئے کہا۔ "صرف بیس روپے کے لیے بازو چھڑاتے ہو تم کیسے مرد ہو؟" میں نے اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ جیب میں سے بیس روپے نکال کر اس کی نذر کئے اور رفتار تیز کر دی۔ مجھے ایک گندی گالی سنائی دی، میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بیس روپے ریزہ ریزہ کر کے زمین پر پھینکے اور پھر ان کاغذ کے ٹکڑوں کو پاؤں سے مسل دیا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور غصے کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ اس کی انا کو ٹھیس لگی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے خیرات دی گئی ہو جبکہ وہ "حق حلال" کی کمائی پر یقین رکھتی تھی۔ مجھے اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ شاید وہ یہ کہہ رہی تھی: "مجھے حرام کھلانا چاہتے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟"(۱۱۷)

واقعاتی مزاح پطرس بخاری، شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی اور دوسرے مزاح نگاروں کے ہاں بڑے دلکش انداز میں ملتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں بھی واقعاتی مزاح کے بڑے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ مگر ایک بات جو اُن کے واقعاتی مزاح کو ممتاز کرتی ہے اور جدت عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ واقعات کو زبردستی مزاحیہ رنگ نہیں دیتے بلکہ واقعات کو ایسے حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے لبوں پر مسکراہٹیں پھیل پھیل جاتی ہیں۔ ان کے سفرناموں میں قدم قدم پر مزاح کی پھلجھڑیاں اپنی بہار دکھاتی نظر آتی ہیں۔ خوبصورت اشعار کا استعمال قاسمی صاحب کی نثر کی ایک اور منفرد خوبی ہے۔ اشعار کے استعمال سے عبارت کی کاٹ دو چند ہو جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی

نے مزاح پیدا کرنے کے لیے جنس کا سہارا لیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے مزاح کے لیے جنس کے ہتھیار سے بھی کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں جنس کو بڑے فنکارانہ طریقے سے استعمال کیا ہے۔ جو کہیں بھی بھدا محسوس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جنہیں پڑھ کر قاری یقیناً حظ اٹھائے گا:

"میں کار سے اُترا اور کسی باتھ روم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے فرانسیسی نہیں آتی فرانسیسیوں کو انگریزی نہیں آتی چنانچہ بہت دیر تک سڑکوں پر پھرتا رہا، بالآخر ایک جگہ ایک پبلک ٹائلٹ نظر آیا لیکن پتہ چلا کہ اسے استعمال کرنے کے لیے مشین میں دو فرانک ڈالنا پڑتے ہیں اور میری جیب میں ٹوٹے ہوئے فرانک نہیں تھے ادھر صورت حال یہ تھی کہ صورت حال میرے بس سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ایک پچیس چھبیس سالہ فرنچ خاتون کا جو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر پورا اسکرٹ اوپر اٹھایا اور یہ کام اس سلیقے سے کیا کہ دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ والا شعر یاد آ گیا۔"

۔۔۔"پھر یہ ہوا کہ اس خاتون کے اس انقلابی اقدام سے میری ہمت بندھی، چنانچہ میں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے وہ دھواں دھار حرکت کی کہ پیرس کی بنیادیں کمزور پڑ گئی ہوں گی۔" ۔۔۔میں جب لمبا راستہ طے کر کے واپس کار میں پہنچا۔۔۔ تو ایک نیگرو آیا اور اس فوکس ویگن کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے وہ کام کیا جس کے لیے میں نے خواہ مخواہ اتنا راستہ طے کیا تھا۔"(۱۱۸)

حاضر جوابی کا جو جوہر ابن انشاء کے ہاں پایا جاتا ہے اس کی خوبصورت جھلکیاں ہمیں عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں بھی بڑی کثرت سے ملتی ہیں بلکہ کہیں کہیں اُن کی حاضر جوابی کا تو جواب ہی نہیں۔ عطا بہت حاضر جواب ہیں۔ بات سے بات نکالتے ہیں ان کے سفرناموں میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جہاں انہوں نے حاضر جوابی کے جوہر دکھائے ہیں۔ مثال کے طور پر مکالموں کی شکل میں حاضر جوابی سے مزاح کا ایک انداز ملاحظہ ہو:

"یار مجھے ایک بات بتاؤ" حسن نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ جو لڑکے لڑکیاں لندن کی سڑکوں پر پھرتے نظر آتے ہیں انہوں نے ایک دوسرے کے بازو کیوں تھامے ہوتے ہیں؟"

"بے اعتباری ہے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔"(۱۱۹)

وہ کبھی کبھار مزاح کے لیے لطیفے کا بھی سہارا لیتے ہیں اگرچہ اس میں بھی عموماً جنس کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''مکمل تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے'' ایک عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا۔'' اگر میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں تو؟'' محبوبہ نے کہا'' تو تم اس چور کی طرح بے وقوف سمجھے جاؤ گے جسے پوری کار چرانے کا موقع ملا مگر اس نے صرف اسٹپنی چوری کرنے پر اکتفا کیا۔''(۱۲۰)

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں کہیں کہیں جنس نگاری کے افسانوی انداز میں مبالغہ آمیز نمونے بھی ملتے ہیں۔ اس سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان میں بھی اپنی ذات کی نمائش کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ ویسے عطاء الحق قاسمی وضعدار آدمی ہیں اور بہت سے معاملات میں اخفا کے قائل ہیں لیکن پھر بھی سفر ناموں میں کہیں کہیں انداز بیان کچھ کھلا ڈلا ہو جاتا ہے ''شوق آوارگی'' میں خصوصاً کہیں کہیں کچھ باتیں ناگفتنی بھی ہیں۔ عطا کے سفر نامے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو انجوائے کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی ہے کہ انہیں اپنے آپ پر گہرا اعتماد ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زندگی سے محظوظ ہو کر بات کا رخ موڑنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ صرف مغرب کے ہی نقاد نہیں بلکہ مشرق کی کجرویاں بھی ان کی نگاہ میں رہتی ہیں۔ یہ رویہ تقریباً ہمارے سب سفر نامہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ وہ خصوصاً صنف نازک کے حوالے سے بات کو بڑے تجسس اور رنگین پیرائے میں عروج تک پہنچاتے ہیں لیکن جہاں اپنی ذات پر کوئی حرف آنے کا خدشہ نظر آتا ہے وہاں اپنی ذات کو ایسے نکال لیتے ہیں جیسے مکھن میں سے بال بہرحال ایسے واقعات پڑھ کر ہمیں اپنے سفر نامہ نگاروں کے کردار پر رشک بھی آتا ہے اگرچہ کبھی کبھی یہ رشک جھنجلاہٹ کی حالت میں بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ غالباً ایسے دلچسپ اور رنگین واقعات کے بیان کا مقصد قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرنا ہے تا کہ دوران مطالعہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں کہیں کہیں دلچسپ اور رنگین واقعات کا بیان ملتا ہے۔ خصوصاً ''شوق آوارگی'' میں الریک نامی طوائف کی جان جب یہ ایک گنج مونے اور جنسی طور پر ابنارمل شخص سے چھڑاتے ہیں بلکہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ایک جھٹکے سے پرے دھکیل دیتے ہیں۔ عطا کے مطابق وہاں کچھ مردانگی کا مسئلہ بھی آن پڑا تھا۔ اس طوائف نے بعد میں بتایا کہ اس قسم کے شرابیوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے تاہم ایک روز جب اسے کوئی اور گاہک میسر نہ آیا تو وہ اس کے ساتھ مجبوراً چلی گئی وہاں اس شخص نے طوائف کے ساتھ ''متوقع کام'' نہیں کیا بلکہ اسے بستر میں لٹا کر اس کے

ہونٹوں پر لپ سٹک ملی اور اسے چاٹنے میں مصروف ہو گیا کچھ دیر بعد پھر اس نے یہی حرکت کی حتیٰ کہ صبح تک یہ شخص ڈیڑھ پاؤ کے قریب لپ سٹک کھا گیا۔ دراصل یہ شخص جنسی اور ذہنی طور پر بیمار ہے۔ نفسیاتی حوالے سے ساڈازم اور میسوکزم جنسیات کی دو اصطلاحیں ہیں۔ ساڈازم (ایذا کوشی) اور میسوکزم (ایذا طلبی) دونوں ایک ہی تحریک کے دو رُخ ہیں۔ ایک ساڈسٹ شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت دوسرے کو جسمانی اور ذہنی تکلیف پہنچا کر جنسی حظ حاصل کرتا ہے جبکہ میسوکسٹ جسمانی اور ذہنی اذیتوں کا دوسرے سے خواہاں ہوتا ہے۔ اس کی جنسی تسکین اس بات سے مشروط ہوتی ہے کہ دوسرا اسے ذہنی اور جسمانی تکلیف پہنچائے۔ دراصل وہ ساڈسٹ شخص ہے۔ وہ بھی جسمانی تکلیف پہنچا کر جنسی تسکین یا آسودگی حاصل کرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں تو باقاعدہ ایسے ادارے اور کلب موجود ہیں جہاں اس نوع کے رجحانات کے حامل افراد کی تسکین کے تمام لوازمات موجود ہوتے ہیں۔ ان کلبوں میں برہنہ عورتیں جو ساڈسٹ کا کردار ادا کرتی ہیں آنے والے میسوکسٹ مردوں کو بید یا کوڑوں سے پیٹتی ہیں یوں یہ ادارے ایسے تمام افراد کی جنسی تشفی کا باعث بنتے ہیں۔ جنسی طور پر کمزور اور کوتاہ ہمت مرد عموماً میسوکسٹ ہوتے ہیں اور ایسے مرد جو سماجی ناانصافی اور ظلم کا شکار ہوتے ہیں وہ انتقاماً جنسی عمل کے دوران عموماً ساڈسٹ رجحانات کے حامل بن جاتے ہیں۔ بہرحال یہ جنسی تلذذ کے غیر فطری طریقے ہیں۔ یہ فرد کے ذہنی مرض کی عکاسی کرتے ہیں۔ عطا کے سفر ناموں میں ان جنسی رجحانات کی بھی کہیں کہیں عکاسی ہوتی ہے۔

تو ذکر ہو رہا تھا الریک نامی طوائف کا جس کی جان ایک ساڈسٹ رویے کے حامل شخص سے عطا نے چھڑائی تھی۔ بعد میں اس طوائف نے عطا کو ''خصوصی رعایت'' یعنی صرف سو گلڈر میں شب بسری کے لیے ''دعوت عمل'' دی۔ اس کے ساتھ ''یونانی ذوق'' کی آفر بھی موجود تھی حالانکہ اس گفتگو سے پہلے عطا اس دوشیزہ کے حسن سے مرعوب ہو چکے تھے۔ جب اس دوشیزہ نے عطا کو بدنی تسکین حاصل کرنے کی دعوت دی، اس دوران رات کافی گزر چکی تھی لیکن اس وقت کے دوران میں سفر نامہ نگار کے ہی بقول رات بھر ''سب خیر خیریت'' رہی بلکہ اس کو عطا نے اس کہانی کے آخر میں سفید دستانوں والے قاتل نظام کی ایک گلی سڑی لاش قرار دیا اور یوں اس کو اخلاقی پیچ دے کر بڑی خوبصورتی سے فن کارانہ انداز میں اس کا رخ موڑ دیا۔ سفر نامے میں موجود اس واقعے پر غور کیا جائے تو سفر نامہ نگار کی پارسائی کے حق میں صرف یہی دلیل نظر آتی ہے جو انہوں نے برملا اعتراف کیا ہے کہ وہ صرف لپ سٹک پر گزارا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی طوائفیں ان کی کبھی کمزوری رہی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے ہاں کہیں کہیں اس طرح کے افسانوی انداز کے حامل جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات دیکھیے جن کو پڑھ کر قاری یقیناً حظ اٹھاتا ہے:

''تھینک یو ویری مچ'' الریک نے ممنونیت کے انداز میں کہا۔

''اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں، میرے لیے یہ کیا کم ہے کہ اسی بہانے تم ایسی خوبصورت لڑکی سے تعارف ہو گیا'' میں نے اس عرصے میں پہلی بار اس ہرنی ایسی آنکھوں اور چہرے پر بلا کی معصومیت رکھنے والی دوشیزہ کے حسن کو سراہتی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اب تم جاننا چاہو گے کہ یہ سب کچھ کیا تھا؟'' اس نے کہا۔ ''اور یہ کہ میں کون ہوں۔'' ''گو اب اس کی خاص ضرورت نہیں تاہم جان لینے میں بھی کوئی حرج نہیں!'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ الریک نے ہولے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور پھر بھولے بھولے لہجے میں کہا۔ ''میں طوائف ہوں!'' مجھے یوں لگا میری کرسی کے عین نیچے کوئی بم پھٹا ہو۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر کافی کا ایک گھونٹ حلق میں اتار کر سر کو کرسی کے ساتھ ٹکا دیا۔

''کیا تمہیں یہ جان کر دکھ ہوا ہے؟'' الریک نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

''ظاہر ہے یہ کوئی ایسی خبر نہیں جس پر مسرت کا اظہار کیا جا سکے!'' میں نے اس دھچکے کے اثرات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا جس سے ابھی ابھی میں دوچار ہوا تھا۔

''ابھی جو شخص میرے پیچھے آیا تھا، وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں کافی انکار کرتی رہی مگر پھر وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔'' اس نے مجھے معاملے کی نوعیت سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس کے ساتھ جانے پر کیا اعتراض تھا، چلی گئی ہوتیں'' میں نے جل کر کہا۔

''اس کے ساتھ نہ جانے کی کئی وجوہ ہیں مثلاً مجھے اس قسم کے شرابیوں سے سخت نفرت ہے۔ نیز اتنے بدنما شخص کے ساتھ شب بسری کے خیال ہی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ تاہم ایک روز جب رات گئے تک کوئی گاہک میسر نہ آیا تو میں مجبوراً اس شخص کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔ اس کے بعد کئی دفعہ اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے ہر دفعہ انکار کر دیا۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے سب کچھ بھلا کر حیرت سے پوچھا۔

''وہ یوں کہ اس رات اس نے مجھے بستر میں لٹا کر میرے ہونٹوں پر لپ سٹک ملی اور اسے چاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر یہی حرکت کی حتیٰ کہ صبح تک یہ شخص ڈیڑھ پاؤ کے قریب لپ سٹک کھا چکا تھا۔''

''واقعی؟'' میرے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ کھل گئی۔

''ہاں! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

اسی دوران رات کافی گزر چکی تھی اور اب میں واپس ہوٹل جانا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ویٹر سے بل منگوایا اور ادائیگی کے بعد الریک سے اجازت طلب کرنے کو ہی تھا کہ اس نے مجھے روک لیا۔

''میں شب بسری کے لیے اتنی بُری نہیں ہوں'' اس نے مجھے دعوتِ عمل دیتے ہوئے کہا ''صرف ڈیڑھ سو گلڈر میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔''

''گو میں لپ سٹک پر گزارا کرنے والوں میں سے نہیں ہوں مگر طوائفیں میری کمزوری کبھی نہیں رہیں۔'' میں نے بھولے بھالے چہرے والی اس دوشیزہ سے یہ بات کہی جس نے پہلی نظر میں میرے لطیف جذبات میں ہلچل مچا دی تھی مگر اب وہ ایک خرانٹ طوائف کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی۔

''ڈیڑھ سو کی بجائے سو گلڈر میں بھی سودا ہو سکتا ہے!'' وہ بھاؤ تاؤ پر اتر آئی۔

''نہیں مجھے یہ بھی منظور نہیں'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو سنو! اس نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے ایک اور ''آفر'' کی۔۔۔

''تم اگر چاہو تو ''یونانی ذوق'' بھی پورا کر سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔''

''نہیں!'' مجھے ابکائی سی محسوس ہوئی اور میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ذرا ایک لمحے کے لئے رُک جاؤ!'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا ''بازار بند ہونے کو ہے اور میں نہیں چاہتی کہ آخری گاہک ہاتھ سے جانے دوں سو میں جو آخری پیش کش کرنے والی ہوں وہ اتنے پیسوں میں میں نے آج تک کسی کو نہیں کی۔ اس کے لیے میں نے ہمیشہ بڑی رقم وصول کی ہے۔''

''وہ کیا؟'' تجسس کے جذبے نے میرے اندر سر ابھارا اور میں نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ یہ کہ تمہارے ہر دو ذوق پورے کرنے کے علاوہ کوئی زائد رقم وصول کئے بغیر میں تمہارے برہنہ جسم پر پیشاب کی گرم گرم دھار بھی مارنے کو تیار ہوں۔ یہ میری سپیشلیٹی Speciality ہے اور اس کا نشہ ایک عرصے تک تمہارے ذہن میں رہے گا! نیز یہ کہ یہی عمل تم میرے ساتھ بھی دہرا سکتے ہو!''

میرے سامنے سفید دستانوں والے قاتل نظام کی ایک اور گلی سڑی لاش پڑی تھی جسے خوبصورت ملبوسات میں ڈھانپ دیا گیا تھا! میں نے اس پر آخری نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔''(۱۴۱)

''گانا ختم ہوا تو سازندوں نے ایک بار پھر چیختی چنگھاڑتی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ گالوں سے گال اور سینوں سے سینے جدا ہوئے۔ فاصلے پھیل گئے اور اس کے ساتھ ہی ٹانگیں، کولھے اور بازو مشینوں کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگے۔

اس اثناء میں میں ادرگرد نظریں دوڑاتا ہوں اور بالآخر نگاہیں ایک چہرے پر آ کر رُک جاتی ہیں۔ چہرہ کیا ہے؟ جیسے گلاب کا پھول، آنکھیں؟ ساری مستی شراب کی سی ہے۔ ہونٹ؟ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔ زلفیں؟ جن شانوں پر پریشان ہوں تمام پریشانیاں رفع ہو جائیں اور بقیہ حصوں کا ذکر خلاف تہذیب۔۔۔ اس دوران کئی جوانانِ رعنا اس کے پاس آ کر رقص کی درخواست کر چکے ہیں۔ مگر وہ ہر ایک سے معذرت کر چکی ہے۔ میں ''اے ہمتِ مردانہ، اے ہمتِ مردانہ'' کا ورد کرتے ہوئے اس کی ٹیبل کی طرف بڑھتا ہوں۔ ذہن میں ''لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب'' والا امکان ہے! قریب جا کے قدرے جھکتا ہوں اور حرفِ مدعا زبان پر لاتے ہوئے کہتا ہوں۔ ''کیا مجھے آپ کے ساتھ رقص کا اعزاز حاصل ہو سکتا ہے؟'' وہ قتالہ لمبی لمبی پلکیں اوپر اٹھا کر میری جانب دیکھتی ہے اور پھر بڑی ملائمت سے کہتی ہے۔

''مجھے اس میں خوشی محسوس ہوئی مگر افسوس کہ اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں۔''

میں جانتا ہوں کہ انکار کا یہ ایک مہذب طریقہ ہے چنانچہ فوراً تکنیک نمبر 12 بروئے کار لاتے ہوئے چہرے پر افسردگی اور مایوسی کی ایک لہر نمایاں کرتا ہوں اور یہ کہہ کر ٹیبل چھوڑنے لگتا ہوں کہ ''میں نے رقص کی درخواست اس حسن ظن کے ساتھ کی تھی کہ دوسرے لوگوں کی طرح تمہارے دل میں رنگدار لوگوں کے لئے کوئی تعصب نہ ہوگا۔'' تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اور حسینہ اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں

دیتے ہوئے کہتی ہے۔ ''تم نے غلط سمجھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں؟'' اور ہم فلور پر آ جاتے ہیں گلوکار چیخ چیخ کر گا رہا ہے۔ اور مست جوانیاں اس دھن پر اپنے کولھوں اور چھاتیوں کی ہیجان انگیز حرکتوں سے کرائسٹ کو بھرپور خراج تحسین پیش کر رہی ہیں۔۔۔ ادھر میں سوچ رہا ہوں یہ راؤنڈ زیادہ طول ہو گیا ہے یا میری ٹانگوں نے مزید حرکت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کبھی خود کو دیکھتا ہوں اور کبھی اپنی ہم رقص کو جو شعلہ جوالہ بنی ہوئی ہے۔ خدا خدا کر کے یہ ہنگامہ ختم ہوتا ہے اور میں لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ اپنی میز کی جانب بڑھتا ہوں۔ وہ قتالہ میرے ساتھ ہے۔ میں نے اسے اپنی میز پر مدعو کیا ہے جسے اس نے قبول کر لیا ہے۔

''میرا نام عطا ہے''

''اور میرا نام ڈیبرا ہے''

اب ہم ایک دوسرے سے باقاعدہ متعارف ہوتے ہیں۔ سازندوں کے لئے وقفہ ہو گیا ہے چنانچہ اس وقت ہال میں صرف ہلکی ہلکی موسیقی سنائی دے رہی ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس پر رقص کر سکتا ہے۔

''تم کس ملک سے تعلق رکھتے ہو؟'' ڈیبرا پوچھتی ہے۔

''پوچھو تو جانیں۔''

''سپین؟''

''نہیں۔''

''اٹلی۔''

''نہیں۔''

''میکسیکو؟''

''ہرگز نہیں!''

''چلو میں ہار مانتی ہوں، اب بتا دو!''

''اونہوں! ایک بار پھر دماغ پر زور ڈالو۔''

وہ باقاعدہ سوچ بچار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دم کھل اٹھتی ہے اور چٹکی بجا کر کہتی ہے ''انڈیا'' میں بالآخر اسے بتا دیتا ہوں کہ میں پاکستان سے ہوں۔

''پاکستان!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے کہتی ہے ''وہی نا جہاں آج کل کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔''

''ہاں نیک خاتون! وہی پاکستان'' جل کر کہتا ہوں!

''یہاں کب آئے''؟

''دو سال قبل آیا تھا۔ صبح واپس اپنے وطن جا رہا ہوں۔ تم آخری امریکی امریکی لڑکی ہو جس سے مل رہا ہوں۔''

''سچ؟'' ڈیبرا کے چہرے سے مسرت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

میں جانتا ہوں امریکی لڑکی کے لیے کسی مرد کی ''خاتون اول'' یا ''خاتون آخر'' ہونا بہت THRILLING ہے۔ اتنے میں وہی ''اختصار پسند'' ویٹریس پھر آ ٹپکتی ہے۔ اور آرڈر لینے کے لیے جھکتی ہے۔

''رم اینڈ کوک'' ڈیبرا آرڈر دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی مجھ پر واضح کر دیتی ہے کہ بل کی ادائیگی وہ خود کرے گی کیونکہ وہ باقاعدہ Date پر یہاں موجود نہیں ہیں اور پھر وہ غم پر غم لنڈھانے لگتی ہے۔ یہ شغل اسی وقت سے جاری ہے جب سے میں اسے ہال میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے بھی تیرنے لگتے ہیں۔

''تم نے یہ تو بتایا نہیں امریکہ کیوں آئے؟'' ڈیبرا میٹھی نظروں سے دیکھتی ہوئی پوچھتی ہے۔

''گل رخوں کے لیے۔''

''اور اب واپس کیوں جا رہے ہو''؟

''گل رخوں ہی کے لیے۔''

''پھر تمہیں یہاں کے گل رخ کیسے لگے''؟

''جیسے دنیا بھر کے ہوتے ہیں۔ بے وفا، ستم گر، وعدہ کر کے بھول جانے والے!'' چچ چچ ڈیبرا شرارت سے مسکراتے ہوئے کہتی ہے ''اگر تم کچھ عرصہ یہاں اور رہتے تو تم پر واضح ہوتا کہ سب محبوب ایسے نہیں ہوتے۔''

اس گفتگو کے دوران ڈیبرا کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ رہا ہوں جسے صرف پسندیدگی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وجہ میں جانتا ہوں وہ یہ کہ امریکی بلکہ دنیا بھر کی لڑکیاں ہلکی پھلکی گفتگو کی رسیا ہیں۔

''بائی دی وے، تمہیں سکرٹ اچھا لگتا ہے۔ میکسی، مڈی یا منی سکرٹ؟'' مائیکرو منی سکرٹ والی یہ قتالہ پھر شرارت آمیز سوال پوچھتی ہے۔ میں

جواب میں ''نو سکرٹ'' کہتا ہوں اس کی جلترنگ ہنسی کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔

''تم جانتے ہو جب تم اپنے لہجے میں انگریزی بولتے ہو بہت بھلے لگتے ہو اور یہ بھی تمہاری باتیں بہت مزے کی ہیں''؟ ڈیبرا اب پوری طرح مائل بہ کرم ہے۔

''سچ سچ''؟ میں اپنے پاؤں تلے آسمان محسوس کرتا ہوں۔

''ہاں''۔۔۔ وہ قریب جھک آتی ہے اور میرا جسم پگھلنے لگتا ہے۔

''مجھے کچھ کچھ یقین آنے لگتا ہے کہ اس کے دل میں رنگدار لوگوں کے لیے کوئی نفرت نہیں!

سامنے کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو میز پر ایک قدرے فربہ دوشیزہ بیٹھی نظر آتی ہے حرکتیں بتا رہی ہیں کہ وہ نشے میں پوری طرح دُھت ہے۔ اس کے سامنے والی میز پر ایک نوجوان بیٹھا پورے غور و خوض سے اس کا جائزہ لے رہا ہے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مئے خوار بھی کسی اور دُھن میں بیٹھا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس سے مخاطب ہے۔

Hay Chick, What's Your Name?

وہ ایک آوارہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہتی ہے (چھاتیاں)!! My name is Boobs چھاتیاں نوجوان اس غیر متوقع جواب پر بوکھلا کر پوچھتا ہے۔ ''وہ کس طرح''؟

وہ جواب میں اسے جنسِ گرانمایہ کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر کہتی ہے۔

Because I Got Big Boobs

''یہ مکالمات فلاطوں'' سُن کر میں ڈیبرا کی جانب دیکھتا ہوں تو اس کے چہرے پر ندامت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور وہ کہتی ہے ''عطاہر قوم میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر امریکی دوشیزاؤں کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کرنا۔'' چنانچہ میں اس مشورے کو پلے باندھتا ہوں اور امریکی دوشیزاؤں بلکہ دنیا کے کسی بھی خطے کی لڑکیوں کے بارے میں اچھی رائے رکھنے کے عزم کا اظہار کرتا ہوں اور ساتھ ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ دوسرے روز علی الصبح کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ ڈیبرا بھی میرے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے اپنی گاڑی میں میرے ہوٹل تک چھوڑنے کی فراخدلانہ

پیش کش کی ہے چنانچہ ہم باہر آتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ڈیبرا کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں اور وہ میرا سہارا لیے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات ''الٰہی یہ گھٹنا دودن تو برسے'' کی دعا کیے بغیر بھی مدعا پورا ہو جاتا ہے۔ وہ سٹرنگ پر بیٹھنے لگتی ہے مگر میں اسے ساتھ والی سیٹ کی طرف کھسکا دیتا ہوں اور خود اس کی جگہ لے کر اس سے پوچھتا پاچھتا کار ڈرائیو کرتا ہوا ہوٹل تک لے آتا ہوں۔'' (۱۳۲)

''دروازہ کھلا ہی تھا، ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم شروع ہی میں تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا صوفہ اور ایک تپائی باقی سارا کمرہ ہاں ہاں بول رہا تھا۔ اتنے میں دوسرے کمرے سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر وہ چاپ قریب آتی گئی۔ میرے سامنے سینڈی کھڑی تھی۔ گدرائے گدرائے جسم والی سینڈی۔۔۔ ڈان کی یہ گرل فرینڈ از سینٹ لوئیس۔ وہ اکثر راتیں میرے برابر والے کمرے میں ڈان کے ساتھ ہی گزارتی تھی اور رات بھر آنے والی عجیب عجیب آوازوں اور اکثر مرتبہ دروازہ کھلا رہنے کی بدولت دکھائی دینے والے مناظر سے میری نیندیں اچاٹ ہو جاتی تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔۔۔ !''۔۔۔ ''ڈان نے اس کے بھرے بھرے کولھوں پر ایک زوردار دو ہتڑ رسید کیا اور کہا'' بک بک بند کرو، پہلے جاکر میز پر کھانا لگاؤ سخت بھوک لگ رہی ہے'' کھانا کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔

''تمھاری شاعری کا کیا حال ہے؟'' میں نے ڈان سے پوچھا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا۔ یہ تین مہینے اس نے شاعری کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور دوسرے کمرے میں جاکر ''بیاض'' اٹھا لایا۔

''خدا کے لیے ڈان، خدا کے لیے رہنے دو'' سینڈی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھلاتے ہوئے انداز میں کہا'' میں تمھاری اس شاعری سے بیزار ہوں۔'' ڈان نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا'' عرض کیا ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی سینڈی پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

''تمھارے اس پاکستانی دوست کا کیا حال ہے جو تمھیں ملنے آیا کرتا تھا مگر اس دوران سارا عرصہ میری ٹانگوں کو گھورتا رہتا تھا!'' سینڈی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے اور اب بھی تمھاری ٹانگوں سمیت تمھارا ذکر کرتا اور آہیں بھرتا ہے۔''

''یو ناٹی بوائے!'' سینڈی نے دور سے مُکا دکھاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں گھنٹی کی آواز سنائی دی اور وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد تین گرانڈیل قسم کے نیگرو اور ان کے ساتھ تین سیاہ فام دوشیزائیں کمرے میں داخل ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا۔ ڈان کے ان دوستوں نے آتے ہی کباڑیے کی دکان سے خریدے ہوئے فریج کی طرف یلغار کی اور پھر بیئر اور کوک میں سے جو کسی کے ہاتھ لگا لے اُڑا۔ یہ دیکھ کر میں نے کھسکنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ اجازت چاہی اور مل گئی کہ یہاں لوگ مہمان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پڑ جاتے۔ ڈان اور سینڈی اپنی کار میں مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔ میں نے رخصت ہوتے وقت ڈان کا ہاتھ زور سے دبایا اور کنکھیوں سے سینڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' اگر تم کبھی شادی کے ادارے پر ایمان لے آؤ تو اس موقع پر مجھے ضرور بلانا۔ نہیں تو روحانی قوت کے بل پر ایسا منتر پھونکوں گا کہ پوری سہاگ رات ایک ٹانگ پر کھڑے رہو گے۔'' (۱۳۳)

عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے ''شوقِ آوارگی'' میں زندہ دلی کا عنصر بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں ان کی جمالیاتی حس بھی عروج پر نظر آتی ہے۔ اور اس میں انہوں نے مناظر اور واقعات بڑی بے تکلفی سے بیان کیے ہیں اس سفرنامے کا انداز بھی کچھ کھلا ڈلا ہے۔ خصوصاً اس سفرنامے میں خواتین کے تذکرے کے حوالے سے وہ خود ہی لکھتے ہیں:

''تذکرہ سیاحت کی جو کہانیاں آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں۔ وہ میں نے ''شوقِ آوارگی'' میں جمع کر دی ہیں، کچھ نہیں بھی کہیں، اس کے شائقین مجھ سے ٹائم لے کر علاحدگی میں ملیں۔ ویسے میرے نزدیک اس کائنات کی مرکزی شخصیت انسان ہے اور ظاہر ہے جب میں انسان کہتا ہوں تو اس میں خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ میرے سیاحت نامے کا مرکزی کردار بھی انسان ہے۔۔۔ بعض مقامات پر کاتب دوست نے کچھ نام الٹ پلٹ کر دیے ہیں۔۔۔ ایک جگہ تین چار لائنیں پیسٹ ہونے سے رہ گئی ہیں۔۔۔ اس کے علاوہ بھی کتاب میں کچھ ''مقاماتِ آہ و فغاں'' ہیں اور اس میں کاتب یا پیسٹر کا کوئی قصور نہیں۔ میرا بھی کوئی قصور نہیں کیونکہ میں اس وقت ۲۷ سال کا صحت مند نوجوان تھا۔ اورینٹل کالج کے زمانے میں میرا ایک دوست بہت صالح شخصیت کا مالک تھا، مخلوط تعلیم کے اس ادارے میں وہ ہمیشہ نظریں جھکا کر چلتا، بس جس سے ٹکرانا ہوتا اس سے جا ٹکراتا۔ میں بھی اس زمانے میں بہت صالح نوجوان تھا چنانچہ

سفرنامے میں چار پانچ مقامات ایسے آئے جہاں میں بھی نظریں جھکا کر چلتا ہوں اور یہ سوچ کر چلتا ہوں کہ آگے تیرے بھاگ لچھیے۔ (۱۳۳)

دورِ جدید کے سفرنامہ نگاروں میں عطاء الحق قاسمی کا نام اور مقام بہت نمایاں ہے۔ سفرناموں کے اس پُر ہجوم دور میں عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے ہمیں ایک تازگی اور فرحت کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں غیر ملکی معاشرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے وطن میں رہنے کی برکات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں تفکر کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان کے سفرنامے عام روش سے ہٹ کر ہلکا پھلکا اور شگفتہ انداز رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے سفرنامے نہ تو جغرافیے کی کتاب بنتے ہیں اور نہ ہی قاری کو پڑھتے ہوئے تاریخی حقائق کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے بلکہ وہ سیدھے سادے بیانیہ انداز میں ہمیں اپنے ساتھ ساتھ محوِ سفر رکھتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے ہاں کہیں کہیں ابنِ انشاء کے اسلوب کی جھلک بھی ملتی ہے۔ دونوں نے اپنے سفرناموں میں طنز کا حربہ بھی استعمال کیا ہے۔ ابنِ انشاء کے سفرنامے اپنی تمام تر شگفتگی کے باوجود ہمیں ہمارے معاشرتی رویوں پر شرمندہ کرتے ہیں جبکہ عطاء اپنی تحریر سے ہمیں شرمندہ نہیں کرتے بلکہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ ہمیں افسردہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہماری اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی جس ملک بھی گئے انہوں نے اپنے سفرناموں میں اس کی تہذیب و تمدن کو ضرور پیش کیا۔ جب وہ یورپ گئے انہوں نے وہاں کی تہذیب و معاشرت کو اپنے سفرناموں میں محفوظ کیا۔ اگر وہ کلب میں بھی گئے ہیں تو انہوں نے اس کو بھی بڑی بے تکلفی اور روانی سے پیش کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے یورپ کے سوئمنگ پولز اور ساحلوں کا ذکر بھی بڑی بے باکی سے کیا ہے اور وہاں کے معاشرے کی ''آزادی'' اور جنس زدگی کو بھی اپنے سفرناموں کا موضوع بنایا ہے۔ عطاء کہیں بھی اور کسی بھی مقام پر غیروں کی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ان کی ناپائیدار تہذیب کے چہرے سے رنگین نقاب اتار کر اس کا اصل اور بھیانک رُخ پیش کیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی جو دیکھتے ہیں۔ اس کو بلا جھجک بیان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے یورپ اور امریکہ کو اپنی نظر سے دیکھا اور اسے بڑی خوبصورتی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ عموماً لوگ یورپ میں جا کر اپنی مشرقی اقدار کی تذلیل کرتے ہیں کیونکہ وہ مغربی تہذیب کی چکا چوند سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو جاتے ہیں لیکن عطاء نے وہاں کی خرابیوں کو بھی بیان کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ اس معاشرے میں بہت تضادات اور خرابیاں ہیں۔ بعض مقامات پر تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہاں جا کر عطا کے دل میں مشرقی اقدار کی قدر اور بڑھ گئی ہے اور وہ ان پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ عطاء

الحق قاسمی کے سفرناموں میں جنس نگاری کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں سب سے زیادہ حقیقی اور تہذیبی نمونے ملتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں جنس نگاری کی عمومی سطح نہیں ملتی اور نہ ہی انہوں نے جنس نگاری کا سہارا تلذذ کے لیے لیا ہے بلکہ ان کے سفرناموں میں جنس نگاری کی اعلیٰ علمی و ادبی سطحیں ملتی ہیں۔ جنس اعلیٰ حقائق کی تمثیل کے لیے نظر آتی ہے گویا عطاء کے ہاں اعلیٰ سطح پر ادب اور جنس کا ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سفرناموں میں کہیں کہیں افسانوی انداز میں بھی جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ افسانوں میں سے سفرنامہ تلاش کرنا پڑے۔ بعض مقامات پر انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیا ہے اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جہاں کہیں جنس کا سہارا لیتے ہیں ان کا قلم مزید رواں ہو جاتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ ذاتی اور مشرقی تہذیب کے حوالے سے اخلاقیات کی سرحدوں کو عبور نہیں کرتے بلکہ ان کے مزاح میں بھی تہذیبی رکھ رکھاؤ اور تفکر کا عنصر غالب رہتا ہے۔ وہ قاری کو صرف ہنساتے ہی نہیں بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ عطاء نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں سنجیدہ اور درد بھری کہانیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے گویا موضوع کی سنجیدگی کے باوجود عطاء کا شگفتہ اسلوب قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا بلکہ وہ جا بجا ایسے فقرے چست کرتے ہیں جو ایک طرف قاری کو مسکراہٹ دیتے ہیں تو دوسری طرف اسے دعوتِ فکر بھی عطا کرتے ہیں۔ جیسے وہ یورپ امریکہ اور سکینڈے نیوین ممالک کی فحاشی کا تذکرہ بھی طنز و مزاح کے پیرائے میں کرتے ہیں۔ یاد رہے انہوں نے ان ممالک کی فحاشی و عریانی کا تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن ان تمام مقامات سے اپنے دل و نظر کو بچا کر نکلنے کی کوشش بھی کی ہے۔ عطاء الحق قاسمی سیاحت کی روح کو سمجھتے ہیں۔ وہ جس منظر کو دیکھتے ہیں اسے اپنے وجود کا حصہ بنا لیتے ہیں اور اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ وسیع النظر سفرنامہ نگار ہیں تاکہ دوسرے لوگوں کی طرح صرف نامہ نگار۔ وہ بہت صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور اپنے اوپر بھی ہنسنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے معلومات کا خزانہ بھی ہیں اور دلچسپ سفری واقعات کی روداد بھی۔ ان کے سفرناموں میں مختلف ممالک میں بسنے والے لوگوں کی روزمرہ زندگی کے دلچسپ خاکے بھی ہیں اور ان کی تہذیب و معاشرت کے مرقعے بھی۔ یہ سفرنامے عطا کے سیاسی شعور اور انسانی ہمدردی کے جذبات کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ان میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے جس نے انہیں خوبصورت نثر پارے بنا دیا ہے۔ انہیں اُردو ادب میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ooo

حوالہ جات و حواشی

۱۔ زاہد حسین انجم، مرتب، ہمارے اہلِ قلم، لاہور: ملک بک ڈپو، ۱۹۸۸ء، ص ۴۳۸
۲۔ زاہد حسین انجم، مرتب، بیسویں صدی ایک نظر میں، لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۱ء، ص ۴۳۰
۳۔ محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، لاہور: مکتبۂ جدید، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳
۴۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔۱۰۱
۵۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔۱۵۷
۶۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔۱۱۴
۷۔ ایضاً، ص ۱۹۶۔۱۹۷
۸۔ ایضاً، ص ۷۸۔۷۹
۹۔ ایضاً، ص ۳۳۰
۱۰۔ محمد خان، کرنل، بسلامت روی، راولپنڈی: سٹوڈنٹس بک ایجنسی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۱۔۱۹۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔۱۸۸۔۱۸۹
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔۲۶۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔۲۶۸
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۹۳۔۲۹۴
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۴۹
۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵۔۵۶۔۵۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۳۔۲۵۴
۱۸۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔۲۳۶
۱۹۔ شاہد، ایم آر، مرتب، شہرِ خموشاں کے مکیں، لاہور: الفیصل، ۲۰۰۴ء، ص ۲۴۱
۲۰۔ شفیق الرحمن، دجلہ، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۲
۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱۰۔۳۱۱
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۰۸۔۲۰۹
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔۱۸۷

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۷۹۔۲۸۰
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔۲۲۷۔۲۲۸
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔۱۷۴
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔۱۷۹
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔۱۸۱
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۵
۳۰۔ ایضاً، ص ۲۳۷۔۲۳۸
۳۱۔ ایضاً، ص ۲۹۰
۳۲۔ ایضاً، ص ۱۷۶
۳۳۔ ایضاً، ص ۳۱۲
۳۴۔ ایضاً، ص ۲۷۵
۳۵۔ ایضاً، ص ۲۵۰
۳۶۔ زاہد حسین انجم، مرتب، ہمارے اہلِ قلم، ص ۴۴۱
۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ، اندلس میں اجنبی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۔۱۷۔۱۸۔۱۹
۳۸۔ ایضاً، ص ۲۱
۳۹۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۷۔۱۷۸۔۱۷۹۔
۱۸۰۔۱۸۱۔۱۸۲۔۱۸۳
۴۰۔ مستنصر حسین تارڑ، سنولیک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸۷۔۴۸۸
۴۱۔ مستنصر حسین تارڑ، خانہ بدوش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۵۲۔۴۵۳۔۴۵۴
۴۲۔ مستنصر حسین تارڑ، کے ٹو کہانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۸
۴۳۔ مستنصر حسین تارڑ، ہنزہ داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۔۱۱
۴۴۔ مستنصر حسین تارڑ، اندلس میں اجنبی، ص ۲۵۔۲۶
۴۵۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، ص ۱۷۱
۴۶۔ مستنصر حسین تارڑ، خانہ بدوش، ص ۳۲۵۔۳۲۶۔۳۲۷
۴۷۔ مستنصر حسین تارڑ، پتلی پیکنگ کی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۴۴۔۳۴۵

۴۸۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، ص ۲۳۵۔۲۳۶۔۲۳۷

۴۹۔ مستنصر حسین تارڑ، خانہ بدوش، ص ۳۸۷۔۳۸۸۔۳۸۹

۵۰۔ مستنصر حسین تارڑ، ہنزہ داستان، ص ۱۹۴۔۱۹۵

۵۱۔ مستنصر حسین تارڑ، شمشال بے مثال، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۴۔۱۷۵

۵۲۔ مستنصر حسین تارڑ، سنہری اُلّو کا شہر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۹

۵۳۔ مستنصر حسین تارڑ، خانہ بدوش، ص ۲۸۱۔۲۸۲

۵۴۔ مستنصر حسین تارڑ، پنجی پیکنگ کی، ص ۶۴۔۶۵۔۶۶

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۵۶۔ مستنصر حسین تارڑ، خانہ بدوش، ص ۱۷۹۔۱۸۰۔۱۸۱

۵۷۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، ص ۲۴۲۔۲۴۳۔۲۴۴

۵۸۔ مستنصر حسین تارڑ، سفر شمال کے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۹

۵۹۔ مستنصر حسین تارڑ، ہنزہ داستان، ص ۱۸۷۔۱۸۸

۶۰۔ مستنصر حسین تارڑ، نیپال نگری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۲۶۸۔۲۶۹۔۲۷۰

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۶۲۔ مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۰۔۱۸۱

۶۳۔ مستنصر حسین تارڑ، اُندلس میں اجنبی، ص ۸۳

۶۴۔ ایضاً، ص ۹۱۔۹۲

۶۵۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، ص ۳۵۱

۶۶۔ مستنصر حسین تارڑ، کالاش، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵۶

۶۷۔ مستنصر حسین تارڑ، رتی گلی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۹۸

۶۸۔ مستنصر حسین تارڑ، دیوسائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۲

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۷۰۔ مستنصر حسین تارڑ، رتی گلی، ص ۲۱

۷۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص ۳۵۶۔۳۵۷

۷۲۔ مستنصر حسین تارڑ، کے ٹو کہانی، ص ۳۲۷۔۳۲۸

۷۳۔ مستنصر حسین تارڑ، نانگا پربت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۶۔۲۱۷

۷۴۔ مستنصر حسین تارڑ، پنجی پیکنگ کی، ص ۳۱۷

۷۵۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، جہلم: خرد افروز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۳

۷۶۔ مستنصر حسین تارڑ، برفیلی بلندیاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۶۵۔۳۶۶

۷۷۔ مستنصر حسین تارڑ، پنجی پیکنگ کی، ص ۳۳۵

۷۸۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۷۹۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، ص ۴۲۰

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۵۹۔۳۶۰

۸۱۔ ایضاً، ص ۳۶۲

۸۲۔ ایضاً، ص ۴۴۸۔۴۴۹

۸۳۔ ایضاً، ص ۲۹۲

۸۴۔ ایضاً، ص ۳۲۰

۸۵۔ مستنصر حسین تارڑ، برفیلی بلندیاں، ص ۳۸۶

۸۶۔ محمد خاں، کرنل، "دیباچہ" مشمولہ: اندلس میں اجنبی (از مستنصر حسین تارڑ)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۹

۸۷۔ مستنصر حسین تارڑ، یاک سرائے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۹۔۳۰۰

۸۸۔ ایضاً، ص ۳۰۵

۸۹۔ ایضاً، ص ۲۹۵۔۲۹۶

۹۰۔ زاہد حسین انجم، مرتب، ہمارے اہلِ قلم، ص ۳۵۴

۹۱۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، لاہور: دُعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۔۱۴

۹۲۔ عطاء الحق قاسمی، دِلی دُور است، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳۹

۹۳۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۴ء، ص ۲۶

۹۴۔ عطاء الحق قاسمی، دِلی دُور است، ص ۱۱۱۔۱۱۲

۹۵۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، ص ۱۵۔۱۶

۹۶۔ ایضاً، ص ۸۸۔۸۹

۹۷۔ عطاء الحق قاسمی، دِلی دُور است، ص ۱۵۷۔۱۵۸

۹۸۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۳۹

۹۹۔ عطاء الحق قاسمی، شوقِ آوارگی، لاہور: دُعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۔۲۸

۱۰۰۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۲۴۔۱۲۵۔۱۲۶۔۱۲۷۔۱۲۸۔۱۲۹

۱۰۱۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، ص ۱۶۹۔۱۷۰

۱۰۲۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۳۲۔۳۳

۱۰۳۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، ص ۱۷۰۔۱۷۱

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۵۳۔۵۴

۱۰۶۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۳۰۔۳۱

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۰۸۔ عطاء الحق قاسمی، شوقِ آوارگی، ص ۱۱۴۔۱۱۵۔۱۱۶

۱۰۹۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، ص ۱۴۱

۱۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۱۹۔۱۲۰

۱۱۱۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔۲۱۶

۱۱۲۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، ص ۳۲۔۳۳

۱۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، شوقِ آوارگی، ص ۲۳۸۔۲۳۹

۱۱۴۔ عطاء الحق قاسمی، دُنیا خوبصورت ہے، ص ۴۹۔۵۰

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔۱۶۳

۱۱۶۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۸۹۔۹۰

۱۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، دِلی دُور است، ص ۱۵۸۔۱۵۹

۱۱۸۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۹۴

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۲۰۔ عطاء الحق قاسمی، دِلی دُور است، ص ۱۰۹

۱۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، شوقِ آوارگی، ص ۱۳۲۔۱۳۳۔۱۳۴۔۱۳۵

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۵۴۔۵۵۔۵۶۔۵۷۔۵۸

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۴۰۔۴۱۔۴۲

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۔۱۱

اختتامیہ

"ادب زندگی کا ترجمان ہے"۔ یہ جملہ ادبی تنقید کے چند اساسی جملوں میں سے ایک ہے۔ جس کی عالمگیر حیثیت ناقابلِ تردید سمجھی گئی ہے۔ دُنیا بھر کی زبانوں کا ادب، خواہ وہ منظوم ہو یا منثور اور کسی بھی صنف سے متعلق ہو، زندگی کی ترجمانی کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ زبانِ حال سے کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی رسمی اعلان کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ البتہ جب ادبی تفہیم و تحسین تنقید کے نظری پیمانے وضع کرتی ہے تو اس امر کا تحریری اظہار بھی ہونے لگتا ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان یا مفسر ہے۔ مغربی تنقید کے نمونے ہوں یا مشرقی تنقید کے، مختلف نقادوں اور دانشوروں کے توسط سے یہ حقیقت بارہا سامنے آتی رہی ہے۔ اگر ادب زندگی کی تفسیر اور ترجمانی سے قاصر ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کی قدر و قیمت ماند پڑ جائے بلکہ اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ ادب کی یہی خاصیت اسے حظ اندوزی کا وسیلہ بناتی ہے جب ہم کسی ادب پارے میں زندگی کے کسی ایک پہلو کا عکس دیکھتے ہیں تو یہ مماثلت ہمیں ایک خاص طرح کی لذت عطا کرتی ہے جسے تنقیدی اصطلاح میں فوری مسرت (Immediate Pleasure) کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ادب کی یہی خاصیت اسے زندگی کی طرح متنوع، رنگا رنگ اور لامحدود بناتی ہے۔

ادب اپنی شناخت کا مذکورہ حوالہ قائم کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ یہ زندگی کا ترجمان یا مفسر ہونے کی حیثیت سے زندگی کی شرح تو کرتا ہی ہے لیکن اس سے آگے بھی بڑھتا ہے اور زندگی کا

نقاد بھی ثابت ہوتا ہے۔ تنقید کا سادہ سا مفہوم کھرے اور کھوٹے میں تمیز سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسے شعور کا نام ہے جو ادنیٰ اور اعلیٰ خوب اور زشت اور بُرے اور بھلے میں تمیز کرتا اور تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ یوں ادب زندگی کا شارح ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کا باشعور نقاد بھی ثابت ہوتا ہے اور ادب کی شناخت کا یہ معتبر حوالہ اسے محض اظہار (Expression) تک ہی محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ ابلاغ (Communication) کے دائرے میں بھی لے آتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں ادب محض ادب برائے ادب کا پرچار نہیں کرتا بلکہ ادب برائے زندگی کا اعلان کرنے لگتا ہے۔ اسے ہم صالح ادب کا نام بھی دے دیتے ہیں۔

زندگی کی چند بہت بڑی حقیقتوں میں جنس بھی شامل ہے۔ یہ حقیقت انسان کی اپنی ایجاد کردہ حقیقت نہیں بلکہ اس کا تعلق فطرت کی سب سے گہری سطح سے ہے جسے، عرف عام میں جبلت کہا جاتا ہے اور انسان ہی کیا ہر جاندار اس جبلت سے رشتہ زندگی کی طرح جڑا ہوا ہے بلکہ حیوانیات (Biological Sciences) کی بعض شاخوں کے فراہم کردہ علم کے مطابق پودے بھی اس جبلت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے۔ بہر حال ہم ان لمبے چوڑے مباحث میں پڑے بغیر اپنی گفتگو کو قدرت کی سب سے عظیم تخلیق انسان تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔ جنس اس کے لیے ویسی ہی بڑی حقیقت ہے جیسی بھوک۔ دانشوروں نے اسی مفہوم میں معاشی اور جنسی حقیقتوں کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقتیں گردانا ہے۔ دونوں حقیقتیں آپس میں جڑی ہوئی بھی ہیں۔ ایک بھوک مٹتی ہے تو دوسری بھوک چمک اٹھتی ہے۔

جنس زندگی کی بنیادی حقیقت ہونے کے ناتے ادب میں بھی ہمیشہ سے جگہ پاتی رہی ہے۔ کہیں کھردری شکل میں اور کہیں ارتفاعی صورت میں لیکن اس سے ادب کو مفر نہیں اور ہو بھی کیوں کہ ادب زندگی کا مفسر اور ترجمان ہے اور جنس زندگی کی بنیادی، فطری اور جبلی حقیقت۔

زندگی کی نمو و افزائش کی بنیاد انسان کے زوج زوج ہونے یا سادہ لفظوں میں مرد و زن کے دو اُدھورے مگر ایک دوسرے سے مل کر پورے ہونے والے جسموں پر۔ یہ فطرت ہے اور فطرت نے جبلی تسکین اور افزائش نسل کی حقیقتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کے رشتے میں مربوط کر رکھا ہے۔ اس حقیقت کو انسانی تاریخ اور قبل از تاریخ کے ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں، مختلف اخلاقی معیاروں اور مختلف معاشروں میں اپنے اپنے انداز میں اسے

قبول کیا گیا ہے اور اس کے لیے ضابطے اور معاشرتی لائسنس وضع کیے گئے ہیں لیکن افزائش نسل سے قطع نظر جنسی جذبہ اپنے اظہار کے لیے تذکیر و تانیث کے بنیادی فطری تصور سے آگے بڑھتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس منہ زور جذبے نے اپنے اظہار اور جبلی تسکین کے ایسے ایسے راستے نکالے ہیں جو فطری جذبے کے غیر فطری مظہر ہیں۔ ان مظاہر کے اسباب مختلف تہذیبوں اور مختلف معاشروں میں مختلف نوعیتوں کے ہو سکتے ہیں۔ کہیں مذہب و اخلاق سے دُوری، کہیں مادر پدر آزادی، کہیں دولت کی فراوانی، کہیں دولت سے محرومی، کہیں تجربوں کا شوق، کہیں نفسیاتی عوارض اور نجانے کون کون سے محرکات و اسباب جنس کو فطرت کی راہ سے بھٹکاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فطرت کی سطح پر جنس ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ قدرت نے اس نعمت کے ذریعے انسان کے لیے لذت، تزکیہ اور دیگر جبلی تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے لیکن جنس نے جب اظہار کے غیر فطری راستے اختیار کیے ہیں تو اخلاقی معیاروں پر کاری ضربیں لگی ہیں، حلال حرام کی تمیز اٹھی ہے، نسل انسانی کی شناخت گم ہوئی ہے اور انسان ایڈز جیسی مہلک امراض کے حوالے سے فطرت کے غیض و غضب کا شکار ہوا ہے۔ مذہبی، تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی حتیٰ کہ آب و ہوا کے فرق سے بھی مختلف معاشروں میں جنسی اظہار کی مختلف شکلیں مختلف پیمانوں پر رائج ہوئی ہیں۔ یہ شکلیں کہیں غیر قانونی تعدد، کہیں جسم فروشی، کہیں ہم جنس پرستی اور کہیں جانوروں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کی بہت سی قبیح شکلیں اختیار کر گئی ہیں۔ اس کی تفصیل باب اوّل میں پیش کی جا چکی ہے۔

جنس اور جنس پرستی کی یہ شکلیں ناپسندیدہ ہی سہی، زندگی کا حصہ ضرور ہیں اور اسی لیے ادب کی مختلف منظوم و منثور اصناف میں ان کی عکس بندی بھی کی گئی ہے۔ ان اصناف میں عصر حاضر کی مقبول صنف سفر نامہ بھی شامل ہے۔ اردو ادب کا دامن بہت کم عرصے میں سفر نامے کی صنف سے مالا مال ہو گیا ہے۔ اس صنف کے حوالے سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ تہذیبی و تمدنی، مذہبی و اخلاقی اور سماجی و ثقافتی لحاظ سے اس صنف کا دامن بہت وسیع و عریض ہے۔ اس صنف کی تو بنیاد ہی سفر پر ہے اور زیادہ تر یہ سفر اندرونِ ملک کے بعض حصوں کا نہیں بلکہ بیرونی دُنیا کے ممالک کا ہے۔ ان ممالک میں زندگی کے مختلف مظاہر جن صورتوں میں سفر نامہ نگاروں کو دکھائی دیتے ہیں وہ اپنے تخیل کی آمیزش کرتے ہوئے اپنے سفر ناموں میں ان کا عکس پیش کر دیتے ہیں۔ جنس ان مظاہر میں بہت بڑا مظہر ہے۔ جہاں یہ مظہر بنیادی فطرت سے یا مقامی روایات سے تجاوز کرتا ہوا نظر آتا ہے وہیں سفر نامہ

نگاروں کی نگاہیں فوری طور پر اُسے گرفت میں لے لیتی ہیں۔ اس طرح جنس نگاری کے مختلف نمونے سامنے آتے ہیں۔ ان نمونوں میں خارجی عوامل کے فرق کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگاروں کی داخلی ترجیحات کو بھی بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بعض سفر نامہ نگاروں نے جنسی پہلوؤں کو بیان کرنے پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور کچھ نے کم۔ بعض ممالک میں اس ضمن میں قابلِ بیان مناظر کی فراوانی ہوتی ہے اور کچھ ممالک میں ایسے مناظر کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس فرق سے بھی جنس نگاری کا انداز مختلف ہو جاتا ہے۔ مزید یہ ذاتی دلچسپی یا عدم دلچسپی کو بھی اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال مجموعی طور پر اکثر سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں میں کم یا زیادہ جنس نگاری کے نمونے مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے زندگی کی حقیقتیں بیان کرتے ہوئے جنس کی حقیقت سے کیسے آنکھیں چرائی جاسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان سفر نامہ نگاروں نے اپنے تحریر کردہ ادب میں زندگی ہی کی ترجمانی کی ہے۔ اُردو میں سفر ناموں کے ابتدائی نمونوں سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں منصۂ شہود پر آنے والے سفر ناموں میں جنس نگاری کے جو مختلف نمونے ملتے ہیں دوسرے باب میں اُن کا مختصر طور پر جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس باب میں یوسف خان کمبل پوش، نواب کریم خاں، سر سید احمد خاں، بابو اماشنکر، لالہ بیج ناتھ، منشی محبوب عالم، نواب فتح علی خاں، ڈاکٹر حاجی محمد حسین، یعقوب علی عرفانی، مرزا حسین احمد بیگ اور بیگم حسرت موہانی کے سفر ناموں کا جائزہ شامل ہے۔ اس جائزے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اُس دور میں اُردو سفر ناموں میں جنس نگاری کا رجحان نسبتاً کم رہا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے سفر نامہ نگاروں نے جنس کے حوالے سے لکھنے کا جرأت مندانہ انداز اختیار کرنے میں خاصا وقت لیا اور دوسرا یہ کہ جن مغربی معاشروں میں جنسی آزادی اور اخلاقی بے راہ روی کا مفہوم ایک ہو چکا ہے۔ اُن کے بارے میں لکھے گئے سفر ناموں کی تعداد بھی نسبتاً کم ہے اور اُن معاشروں میں بعد کے پچاس ساٹھ سال میں جنسی بے راہ روی میں اضافہ بھی بہت ہو چکا ہے۔

تیسرا باب ۱۹۴۷ء سے تاحال کے سفر ناموں کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس جائزے میں محمود نظامی، ڈاکٹر محمد باقر، سلطانہ آصف فیضی، قیوم نظر، ڈاکٹر ثریا حسین، جمیل الدین عالی، رام لعل، اختر ریاض الدین، ممتاز مفتی، مختار مسعود، محمد کاظم، صدیق سالک، پروین عاطف، اسلم کمال، بشریٰ رحمٰن، بلدیو مرزا، ابن انشاء، کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر اجمل نیازی، محمد اختر ممونکا، امجد اسلام امجد، شوکت علی شاہ، کشور ناہید، سلمٰی اعوان اور ڈاکٹر محمد

یونس بٹ کے سفر ناموں میں جنس نگاری کے رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس باب کا مطالعہ کرنے سے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ عصرِ حاضر تک آتے آتے اُردو سفر نامہ نگار اظہار کے معاملے میں خاصے جرأت مند ہو چکے ہیں۔ اب اُن کا حوصلہ زندگی کے ہر طرح کے حقائق کی پردہ کشائی کے ضمن میں خاصا بڑھ گیا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اس دور میں یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ جیسے براعظموں کے مختلف ملکوں کے سفر نامے لکھے گئے ہیں جن کی بڑی تعداد ہے۔ ان ملکوں میں جنسی آزادی کو انسانی آزادی کی اساس سمجھ لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں سفر نامہ نگاروں کو جنس کے حوالے سے کسی خاص کاوش کے بغیر ہی بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ دور میں نفسیات خصوصاً فرائڈین سکول کی نفسیات کا مطالعہ بہت بڑھ گیا اور جنس کو ایک بہت بڑی انسانی حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے کا رجحان عام ہوا۔ اس وجہ سے بھی سفر نامہ نگاروں کا اپنے قارئین پر اعتماد بڑھا ہے۔ ان تمام اسباب نے اُردو سفر ناموں میں جنس نگاری کی مقدار میں اضافہ کیا ہے۔

جیسا کہ چوتھے باب میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ہم نے جنس نگاری کے حوالے سے خصوصی مطالعہ کرنے کے لیے چار سفر نامہ نگاروں کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن، مستنصر حسین تارڑ اور عطاء الحق قاسمی کا انتخاب کیا ہے۔ ان چاروں سفر نامہ نگاروں کا سرسری تذکرہ تیسرے باب میں بھی اپنے مقام پر آیا ہے لیکن یہاں ان کے سفر ناموں کا بطورِ خاص جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے یہ انتخاب کیوں کیا ہے؟ اس کے جواب میں ہم اس امر کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ان سفر نامہ نگاروں میں سے کوئی سفر نامہ نگار بھی ''جنسی سفر نامہ نگار'' نہیں ہے بلکہ یہ خطاب اُردو کے کسی اور سفر نامہ نگار کو بھی نہیں دیا جاسکتا۔ ہم نے تو انہیں چند اور وجوہ کی بنا پر منتخب کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جن مصنفوں نے صنفِ سفر نامہ میں قابلِ ذکر اور پائیدار نقوش ثبت کیے ان میں یہ چاروں نام خاص طور پر آتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے کرنل محمد خاں اور شفیق الرحمٰن دونوں کو تقدم حاصل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ وسطی دور اور عطاء الحق قاسمی اس دور کے بعد کے دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ کرنل محمد خاں، شفیق الرحمٰن اور عطاء الحق قاسمی تینوں کے سفر ناموں کی تعداد مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کے مقابلے میں بہت کم ہے تاہم ان کے سفر نامے بھی بہت مقبولیت رکھتے ہیں اور ان میں بھی ہمارے موضوع کی مناسبت سے خاصا مواد موجود ہے۔ اگرچہ اُردو میں بعض سفر نامہ نگار ایسے بھی ہیں (مثلاً شوکت علی شاہ اور اختر ممونکا وغیرہ) جن کے سفر ناموں میں جنس نگاری کے

نمونے ہمارے منتخب کردہ سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں سے کہیں زیادہ ہیں لیکن ہم نے اپنے منتخب کردہ سفرنامہ نگاروں کو ترجیح دیتے ہوئے یہ امر بھی ملحوظ رکھا ہے کہ موضوع کی مناسبت سے تنوع کن سفرنامہ نگاروں کے ہاں زیادہ ہے اور پھر یہ کہ کن سفرنامہ نگاروں نے مختلف تہذیبوں کا احاطہ کیا ہے اور جنس نگاری کے نمونے پیش کرتے ہوئے فنی تقاضوں کو کس حد تک ملحوظ رکھا ہے۔

کرنل محمد خاں کے سفرنامے اُردو ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر قاری افسردہ نہیں ہوتا بلکہ حظ اٹھاتا ہے۔ ان کے ہاں کلاسیکی ادب کی روایت کا ذائقہ بھی موجود ہے۔ کرنل محمد خاں کے ہاں جنس نگاری کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں غالب رجحان تفریح کا نظر آتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی کسی منظر سے خود حظ اٹھاتے ہیں اس میں قاری کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے عیش و سرور کے واقعات بھی قلمبند کیے ہیں وہ تمدنی موازنے کی روایت سے بھی جنس کے ذریعے تفریح کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے ذاتی واقعات کو دلچسپ بنانے کے لیے بھی جنس کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے ہاں زندہ دلی کا عنصر غالب ہے اور سب اچھا ہے کا اشارہ ملتا ہے۔ ان کے سفرناموں میں غالب رجحان جنس اور مزاح کے امتزاج رنگ کا ہے۔

شفیق الرحمن کا سفرنامہ ''دجلہ'' الگ نوعیت کا حامل ہے۔ اس سفرنامے میں رومانویت کا عنصر غالب ہے۔ شفیق الرحمن کے ہاں جنس نگاری کے جو نمونے ملتے ہیں وہ زیادہ تر خوبصورت ہیں۔ ان میں کہیں کہیں تجسس کا عنصر تو ملتا ہے لیکن وہ نمونے ایسے ہرگز نہیں ہیں کہ ان سے گھن آئے یا تعفن کا احساس ہو۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں جنس کے حوالے سے مشرقی اور مغربی رویوں کا فرق بھی واضح کیا ہے۔ انہوں نے بعض ایسے دلچسپ مناظر بیان کیے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری محظوظ ہوتا ہے جیسے انہوں نے قاہرہ کے ایک کسینو میں نہ صرف سمیعہ جمال کے رقص کا منظر بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے بلکہ اس رقص پر اپنی دلچسپ رائے بھی پیش کی ہے۔ اس سفرنامے کے دیگر کرداروں میں اکثر کردار شفیق الرحمن کے ٹائپ کرداروں کی طرح خوش مذاق، لاأبالی پن اور وقتی طور پر لڑکیوں کے قرب سے لطف اندوز ہونے کے عادی ہیں گویا ان کا کام شراب پینا اور نئی نئی لڑکیوں سے عشق لڑانا ہے۔ شفیق الرحمن نے جنس نگاری کے ذریعے بلند تر فکری سطحیں بھی دکھائی ہیں یعنی انہوں نے جنس کو اعلیٰ حقائق کی تمثیل کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں جنس نگاری زیادہ تر رومانویت کے پردے میں نظر آتی ہے۔ یہ رومانوی رنگ مزاحیہ اسلوب سے ہم آہنگ ہو کر ان کی تحریر کو ایسی

خوبصورتی عطا کرتا ہے جو انفرادیت کی ضامن ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں تخیل، افسانویت اور زبان کی چاشنی درجہ کمال پر نظر آتی ہے۔ یہ رنگ ان کی پوری سفرنامہ نگاری پر حاوی نظر آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں جنس نگاری کے جو زیادہ تر نمونے ملتے ہیں وہ افسانوی انداز کے ہیں۔ اگرچہ یہ نمونے کہیں کہیں مبالغہ آمیز بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بعض مقامات پر اپنی ذات کی نمائش کے لیے بھی جنس کا سہارا لیتے ہیں۔ بہر حال صنفِ سفرنامہ کی مقبولیت میں تارڑ کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ انہوں نے اپنے سفرناموں میں فسانہ و افسوں اور رومان و جنس کی لذت شامل کر دی ہے۔ گویا جن سفرناموں میں کمرشل ازم کے نقطۂ نظر سے زیبِ داستان کا زیادہ سامان نسوانی کرداروں اور ان کی جنسی دلچسپی کا مواد زیادہ ہوتا ہے۔ وہ سفرنامے عوام میں نسبتاً زیادہ مقبول ہو جاتے ہیں۔ مستنصر کے سفرنامے بھی خارجی احوال و واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ داخلی اور قلبی واردات و احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کے سفرناموں میں جذبات و احساسات کا عنصر غالب نظر آتا ہے جنہیں قاری چٹخارے لے لے کر پڑھتا ہے اور اس طرح وہ معلومات نسبتاً کم حاصل کرتا ہے اور زیادہ حظ اٹھاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو جدید اُردو سفرنامے کی تاریخ میں ایک رجحان ساز شخصیت قرار دیا جاتا ہے کیونکہ ان سے پہلے سفرنامے کی تاریخ میں افسانوی انداز بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ ان کے سفرنامے حقیقت اور تخیل کا خوبصورت امتزاج ہیں۔

اُردو سفرنامے کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ان کے سفرنامے عام روش سے ہٹ کر ہلکا پھلکا اور شگفتہ انداز رکھتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں تفکر کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ صرف ہنساتے نہیں، قاری کو بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں، شگفتگی اور سوچ کا عنصر ان کے سفرناموں کا خاصہ ہے۔ عطا کے سفرناموں میں جنس نگاری کے متعدد نمونے ملتے ہیں لیکن ان کے ہاں سب سے زیادہ حقیقی اور تہذیبی نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریر میں جنس نگاری کی عمومی سطح نہیں ملتی اور نہ ہی انہوں نے جنس نگاری کا سہارا تلذذ کے لیے لیا ہے بلکہ ان کے سفرناموں میں جنس نگاری کی اعلیٰ علمی و ادبی سطحیں ملتی ہیں ان کے ہاں جنس اعلیٰ حقائق کی تمثیل کے لیے بھی نظر آتی ہے گویا عطا کے ہاں اعلیٰ پر سطح پر ادب اور جنس کا ربط و تعلق موجود ہے۔ وہ جہاں بھی گئے اُنہوں نے اپنی تحریر میں اس علاقے کی تہذیب و تمدن کو ضرور پیش کیا۔ جیسے وہ یورپ گئے تو انہوں نے وہاں کے کلبوں، ہوٹلوں، سوئمنگ پولز اور ساحلوں کا ذکر بڑی بے باکی سے کیا ہے اور وہاں

کے معاشرے کی ”آزادی“ اور جنس زدگی کو بھی اپنے سفرناموں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ کہیں بھی اور کسی بھی مقام پر غیروں کی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے پاکستانی معاشرے میں بسنے والے نوجوانوں کو مغرب کی جنسی آزادیوں کی رنگین تصویریں دکھائی ہیں بلکہ انہوں نے مغربی معاشرے کے چہرے سے رنگین نقاب اُتار کر اس کا اصل اور بھیانک رُخ پیش کیا ہے وہاں جا کر عطا کے دل میں مشرقی اقدار کی قدر اور بڑھ گئی ہے اور وہ ان پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں کہیں کہیں افسانوی انداز میں بھی جنس نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لیے بھی جنس کے ہتھیار سے کام لیا ہے۔ موضوع کی سنجیدگی کے باوجود عطا کا شگفتہ اسلوب قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا بلکہ وہ جابجا ایسے فقرے چُست کرتے ہیں جو ایک طرف قاری کو مسکراہٹ کا سامان فراہم کرتے ہیں تو دوسری طرف اسے دعوتِ فکر بھی عطا کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم آغاز میں لکھ چکے ہیں کہ ادب زندگی کی حقیقتوں کی تشریح و توضیح کرنے کے لحاظ سے زندگی کا ترجمان اور مفسر ہوتا ہے لیکن وہ اسی مقام پر رُک نہیں جاتا۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر زندگی کا نقاد بھی بن جاتا ہے۔ یہی چیز ادب کو اظہار (Expression) سے ابلاغ (Communication) کے رُتبے تک لے جاتی ہے۔ جب ہم اس کسوٹی پر اُردو سفرناموں کو پرکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سب نہیں تو اکثر سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفرناموں کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں خصوصاً جنس کی حقیقت کے مختلف مظاہر کو بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ایسا اسلوبِ نگارش اور طرزِ تحریر اختیار کیا ہے کہ ادب پروپیگنڈہ نہیں بنا اور تہذیبی تقابل کے ذریعے اخلاقی انحطاط و زوال اور اس کے مضر اثرات سامنے آگئے ہیں یعنی قاری کے لیے کھرے کھوٹے اچھے بُرے اور ادنیٰ و اعلیٰ میں تمیز پیدا کرنے کا سامان فراہم کر دیا گیا ہے۔ جنس نگاری قاری کے لیے محض تلذذ کا باعث ہی نہیں بنی بلکہ اس کے لیے آسانی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اخلاقی انحطاط کے مضر اثرات کو خود جانچ سکے۔ یوں بعض سفرنامہ نگاروں کے ہاں جنس نگاری کے ذریعے اخلاقی سطح پر ابلاغ کا فریضہ ادا کرنے کا رجحان صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے جنس نگاری ایک مثبت عمل بھی بن گئی ہے۔

☆☆☆

مآخذ

○ القرآن الحکیم

سفرنامے

۱۔ ابنِ انشا، آوارہ گرد کی ڈائری، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۴ء

ایضاً، ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۴ء

ایضاً، چلتے ہو تو چین کو چلیے، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۵ء

ایضاً، دنیا گول ہے، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۰۳ء

۲۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر محمد، مندر میں محراب، لاہور: یونیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۳۔ احمد خاں، سرسید، مسافرانِ لندن (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء

۴۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، لاہور: نسیم بکڈپو، ۱۹۷۶ء

ایضاً، سات سمندر پار، لاہور: پاکستان رائیٹرز کواپریٹو سوسائٹی، ۱۹۶۴ء

۵۔ محمد اختر ممونکا، پیرس ۲۰۵ کلومیٹر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء

ایضاً، ایضاً، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۶۔ اسلم کمال، اسلم کمال اوسلو میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۷۔ امجد اسلام امجد، ریشم ریشم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

ایضاً، شہر در شہر، لاہور: توسین، ۱۹۸۸ء

۸۔ اے حمید، امریکا نو، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۹۔ بابو اما شنکر، آئینہ سکندری، دہلی: مطبع محب ہند، ۱۸۸۷ء

۱۰۔ بشریٰ رحمٰن، براہِ راست، لاہور: ادارہ وطن دوست، ۱۹۸۳ء

۱۱۔ پروین عاطف، کرن _ تتلی _ بگولے، لاہور: جنگ پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۱۲۔ ثریا حسین، ڈاکٹر، پیرس و پارس، علی گڑھ: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۴ء

۱۳۔ جمیل الدین عالی، تماشا مرے آگے، لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء

ایضاً، دنیا مرے آگے، ایضاً

۱۴۔ حسین احمد بیگ، مرزا، پردیس کی باتیں، دکن: شمس الاسلام پریس، ۱۹۳۱ء

۱۵۔ رام لعل، خواب خواب سفر، لکھنؤ: شانتی نکتین پرکاش، ۱۹۸۳ء

۱۶۔ سلطانہ آصف فیضی، عروسِ نیل، دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۵۳ء

۱۷۔ سلمیٰ اعوان، میرا گلگت و ہنزہ، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۵ء

۱۸۔ شفیق الرحمن، دجلہ، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۱ء

۱۹۔ شوکت علی شاہ، اجنبی اپنے دیس میں، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۶ء

ایضاً، جزیرے جمال کے، لاہور: خزینہ علم و ادب، سنہ ندارد

ایضاً، سلگتے ساحل، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء

ایضاً، سورج آدھی رات کا، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۵ء

۲۰۔ صدیق سالک، تا دمِ تحریر، راولپنڈی: مکتبہ سرمد، ۱۹۸۷ء

۲۱۔ عبدالحق موحد، مولوی، سیر برہما، لکھنؤ: مطبع نامی، ۱۸۹۳ء

۲۲۔ عطاء الحق قاسمی، دلی دور است، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۵ء

ایضاً، دُنیا خوبصورت ہے، لاہور: دُعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

ایضاً، شوقِ آوارگی، لاہور: دُعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

ایضاً، گوروں کے دیس میں، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۶ء

۲۳۔ فتح علی خان، نواب، سیاحت فتح خانی، آگرہ: مفید عام، ۱۹۰۳ء

۲۴۔ کریم خاں، نواب، سیاحت نامہ (مرتبہ عبادت بریلوی) لاہور: ادارۂ ادب و تنقید، ۱۹۸۲ء

۲۵۔ کشور ناہید، آ جاؤ افریقہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۲۶۔ لالہ بیج ناتھ، انگلینڈ اور انڈیا، میرٹھ: دویا درپن پریس، ۱۸۹۷ء

۲۷۔ محمد خاں، کرنل، بجنگ آمد، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۸ء

ایضاً، بسلامت روی، راولپنڈی: سٹوڈنٹس بک ایجنسی، ۱۹۸۲ء

۲۸۔ محمود نظامی، نظر نامہ، لاہور: گوشہ ادب، ۱۹۵۸ء

۲۹۔ مستنصر حسین تارڑ۔ اندلس میں اجنبی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

ایضاً، برفیلی بلندیاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

ایضاً، پنچھی پکھنگ کی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

ایضاً، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

ایضاً، خانہ بدوش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

ایضاً، دیوسائی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

ایضاً، رتی گلی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

ایضاً، سفر شمال کے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

ایضاً، سنولیک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

ایضاً، سنہری اُلّو کا شہر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

ایضاً، شمشال بے مثال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

ایضاً، کالاش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

ایضاً، کے ٹو کہانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

ایضاً، نانگا پربت، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

ایضاً، نکلے تری تلاش میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

ایضاً، نیپال نگری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

ایضاً، ہنزہ داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

ایضاً، یاک سرائے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۳۰۔ ممتاز مفتی، ہند یاترا، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۲ء

۳۱۔ یعقوب علی عرفانی، مشاہدات عرفانی، لاہور: انقلاب پریس، ۱۹۲۷ء

۳۲۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ (مرتبہ تحسین فراقی) لاہور: مکتبہ بکس، ۱۹۸۳ء

۳۳۔ یونس بٹ، ڈاکٹر محمد، ہوائیاں، لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۷ء

دیگر کتب

۱۔ اختر علی، جنسی بے راہ روی اور قوموں کا زوال، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۶ء

۲۔ اختر علی، ڈاکٹر، جنسیات اور ہم، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۲ء

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفرنامہ، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۴۔ تاثیر، ڈاکٹر ایم ڈی، مقالات تاثیر (مرتبہ ممتاز اختر مرزا) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء

۵۔ حامد بیگ، ڈاکٹر، اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۶۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اُردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: دریا گنج، ۱۹۹۵ء

۷۔ زبیر رانا، عشق کا مارکسی تصور، لاہور: ری پبلکن بکس، ۱۹۸۹ء

۸۔ سبطِ حسن، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۷ء

۹۔ زاہد حسین انجم، مرتب، بیسویں صدی ایک نظر میں، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء

زاہد حسین انجم، مرتب، ہمارے اہلِ قلم، لاہور: ملک بک ڈپو، ۱۹۸۸ء

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

ایضاً، عورت جنس کے آئینے میں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۱۱۔ سیمون دی بووا، عورت (مترجم یاسر جواد) لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء

۱۲۔ شاہد، ایم، آر، مرتب، شہرِ خموشاں کے مکیں، لاہور: الفیصل، ۲۰۰۴ء

۱۳۔ شہزاد احمد، فرائیڈ کی نفسیات، دو ورژن، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۱۴۔ صلاح الدین درویش، اُردو افسانے کے جنسی رجحانات، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۹ء

۱۵۔ عبدالرؤف، ڈاکٹر، بچوں کی نفسیات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۶ء

۱۶۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، جہلم: خرد افروز، ۱۹۹۱ء

ایضاً، روایاتِ تمدنِ قدیم، جہلم: خرد افروز، ۱۹۹۱ء

۱۷۔ فضل الرحمن خاں، ادھ کھایا امرود، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۸ء

۱۸۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اُردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء

۱۹۔ کیتھ واکر، پیٹر فلیچر، جنس اور محبت (مترجم سید قاسم محمود) لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء

۲۰۔ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۵ء

۲۱۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں (حصہ اوّل) (مرتبہ سہیل عمر) لاہور: مکتبہ الروایت، سنہ ندارد

۲۲۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، فرائڈ: نظریۂ تحلیلِ نفسی، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۴ء

۲۳۔ نیاز فتح پوری، ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات، لاہور: آواز فاؤنڈیشن برائے تعلیم، سنہ ندارد

جریدہ

۱۔ سہ ماہی، الذبیر، سفرنامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶۔۳۷، شمارہ نمبر ۳، ۴، ۱، بہاولپور: اُردو اکادمی، ۱۹۹۸ء

لغات/انسائیکلوپیڈیا

۱۔ احمد دہلوی، سید، مرتب، فرہنگِ آصفیہ، جلد اوّل و سوم لاہور: مکتبہ حسن سہیل، سنہ ندارد

۲۔ حامد علی خان، مولانا، مرتب، اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء

۳۔ فیروز الدین، الحاج مولوی، مرتب، فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۷ء

4-Oxford : Clarendon Press, 1986.،Oxford Dictionary Vol II.

5-England : World Publishing ،5-Webster's Dictionary

Company, 1986

☆☆☆

جب ذوالفقار علی احسن کی
کتاب ''اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان (۱۹۴۷ء کے بعد)'' کا مسودہ دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں اور اس بنا پر خوشی ہوئی کہ اب ہماری جامعات بھی بالغ ہو رہی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں جامعات کے تحقیقی مقالات محض ''احوال و آثار'' کے آثار قدیمہ کے حصار سے باہر آکر کھلی فضا کا مزا چکھ رہے ہیں۔
ذوالفقار علی احسن نے جنس، اس کے سماجی اور تخلیقی مظاہر کے تناظر میں، کمال محنت سے اُردو سفرناموں کا بالعموم اور بعض مقبول سفرنامہ نگاروں کے جنسی رویوں کا بالخصوص تجزیاتی مطالعہ کر کے، معاصر سفرناموں کے اُس پہلو سے روشناس کرایا جسے بطورِ خاص کبھی بھی موضوعِ نقد نہ بنایا گیا۔
ذوالفقار علی احسن کی کتاب اُردو سفرناموں کی تنقید میں نئی جہت کی مظہر ہے اور اسی میں اس کی اہمیت مضمر ہے۔ ذوالفقار علی احسن نے سفرناموں میں جنس کی نشاندہی تو کی مگر اس نے سفرنامہ نگاروں پر انگلی نہیں اٹھائی۔

ڈاکٹر سلیم اختر

مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی
لاہور۔ پاکستان